MAHS411CCT

جدید دنیا - II

Modern World – II

ایم۔اے۔تاریخ

(چوتھا سمسٹر)

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: Modern World – II
ISBN: 978-81-980312-8-0
First Edition: November 2024

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2024
Copies	:	1100
Price	:	Rs. 230/- (The price of the book is included in the admission fee of distance mode students)
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator–History, CDOE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, Assistant Professor of History (C), CDOE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, Asst. Professor of History (C), CDOE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Prof. of Urdu (C), CDOE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	S.R.TOWERS (INDIA) PRIVATE LIMITED, Guntur, Andhra Pradesh

Modern World – II
for
M.A. 4th Semester

On behalf of the Registrar, Published by:
Centre for Distance and Online Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad – 500 032 (TG), Bharat
Director: dir.CDOE@manuu.edu.in *Publication:* CDOEpublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر اعلیٰ

(Chief Editor)

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head
Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین
سابق صدر شعبہ تاریخ و ثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مدیر

(Editor)

Vidya Vachaspati
Shaik Mahaboob Basha
Programme Coordinator – History
Centre for Distance and Online Education
MANUU, Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مدیر زبان

(Language Editor)

Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (C) /
Guest Faculty
Centre for Distance and Online Education
MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر، اردو (کانٹریکچول)/گیسٹ فیکلٹی
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلس ادارت
(Editorial Board)

Prof. Mushtaq Ahmad Kaw
Former Head, Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر مشتاق احمد کاؤ
سابقہ صدر شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies
Department of History Aligarh Muslim
University, Aligarh, U.P.

پروفیسر پرویز نظیر
سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز
شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College, Azamgarh, U.P.

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

Prof. Danish Moin
Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر دانش معین
شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) /
Guest Faculty
CDOE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی
مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم، مانو حیدرآباد

Mohd Aasim
Assistant Professor of History (C) /
Guest Faculty
CDOE, MANUU, Hyderabad

محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر، تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی
مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد

Dr. Khursheed Ahmad Bhatt
Assistant Professor of History (C) /
Guest Faculty
Lucknow Campus, MANUU, Lucknow

ڈاکٹر خورشید احمد بٹ
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی
لکھنؤ کیمپس، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ

کورس کوآرڈی نیٹر

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
• ڈاکٹر فردوس حمید پرے	اکائی 1،4
• ڈاکٹر منصور احمد صدیقی	اکائی 2
• محمد عاصم	اکائی 3
• ڈاکٹر داؤد ابراہیم	اکائی 5،16
• ڈاکٹر خورشید احمد بٹ	اکائی 6،8،13
• پروفیسر پرویز نظیر	اکائی 7،11
• ڈاکٹر شاہد عالم	اکائی 9،12
• ڈاکٹر نوید	اکائی 10،14،15

پروف ریڈرس

اول	:	محمد عاصم
دوم	:	سید میر ابوالحسین
فائنل	:	شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	8
پیغام	ڈائرکٹر	9
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	10
بلاک I	**انیسویں صدی کی تفہیم**	
اکائی 1	سرمایہ داری اور سامراجیت	13
اکائی 2	آزاد خیالی، اشتراکیت اور قوم پرستی	27
اکائی 3	پہلی عالمی جنگ	42
اکائی 4	پیرس معاہدۂ امن: ایک تخمینہ	67
اکائی 5	1917 کا روسی انقلاب اور اس کے نتائج	83
بلاک II	**دو جنگوں کے درمیان کی دنیا**	
اکائی 6	مجلس اقوام اور تحفظ اجتماعی	102
اکائی 7	سرمایہ داری کا بحران اور عظیم کساد بازاری	123
اکائی 8	جرمنی میں نازیت اور اٹلی میں فسطائیت	141

بلاک III	**دوسری عالمی جنگ اور نیا نظام**	
اکائی 9	دوسری عالمی جنگ کے اسباب اور اثرات	168
اکائی 10	قوم پرستانہ تحریکیں اور عدم نوآبادیت	184
اکائی 11	چینی اشتمالی انقلاب اور اس کے اثرات	201
اکائی 12	سرد جنگ کی نظریاتی اور سیاسی اساس	219
اکائی 13	ناوابستگی تحریک اور تیسری دنیاء	235
اکائی 14	اقوام متحدہ: حصولیابیاں اور چنوتیاں	260
بلاک IV	**یک قطبی دنیا**	
اکائی 15	ترقی پسند عوامی تحریکیں	274
اکائی 16	سوویت یونین کا انتشار اور سرد جنگ کا خاتمہ	288
نمونہ امتحانی پرچہ		302

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1)اردو زبان کی ترویج و ترقی (2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرینِ علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل وابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی طریقۂ تعلیم کو پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں ۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر فاصلاتی طرز تعلیم کو متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم سے ہوا اور 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم (Regular Courses) کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔

ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر انداز سے جاری رکھنے میں یو جی سی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (ODL) کے تحت جاری مختلف پروگرام UGC-DEB سے منظور شدہ ہیں۔ UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کر کے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ (Dual Mode University) ہے ، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی ۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق Credit Based Credit System (CBCS) نظام متعارف کرایا گیا اور خود اکتسابی مواد (Self Learning Material) از سرِ نو، جس میں یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کیا گیا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ سترہ (17) کورسز چلا رہا ہے ۔ ساتھ ہی تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ متعلمین کی سہولت کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑہ میں ایک ایکسٹنشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 160 سے زیادہ متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ای میل اور وہاٹس ایپ گروپ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے ریگولر کاؤنسلنگ کے علاوہ ایڈیشنل ریمیڈیل آن لائن کاؤنسلنگ مہیا کی جا رہی ہے تاکہ طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جا سکے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو عصری تعلیم کے مرکزی دھارے سے جوڑنے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔ آنے والے دنوں میں تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت مختلف کورسز میں تبدیلیاں کی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ فاصلاتی نظام کو زیادہ مؤثر و کارگر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

کورس کا تعارف

پیارے طلباء! آداب۔ آپ کو "جدید دنیا-II" کورس میں خوش آمدید۔ اس میں، آپ ان مختلف تبدیلیوں کو سمجھیں گے جنہوں نے جدید دنیا کو تشکیل دیا۔ سرمایہ داری اور نوآبادیات کے عروج کو سمجھنے سے شروع کرتے ہوئے ، آپ جدید تصورات جیسے آزاد خیالی(Liberalism)، اشتراکیت(Socialism) اور قوم پرستی(Nationalism) کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ جدید دنیا نے کئی انقلابات کا مشاہدہ کیا، جنہوں نے دنیا کے سیاسی ماحول میں اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ روسی اور چینی انقلابات نے جدید سیاست، بشمول ہندوستانی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ علاوہ ازیں اقوام عالم کے درمیان مسابقت بشمول ان کے نظریاتی موقف اور اختلافات کے سبب دو عالمی جنگیں برپا ہوئیں جنہوں نے نسل انسانی کو کافی حد تک تباہ کر دیا۔ عالمی جنگوں کا مطالعہ کرتے ہوئے، آپ یہ سمجھیں گے کہ جنگوں میں، فاتح کہے جانے والے بھی نقصان اٹھاتے ہیں: ہاں، جنگوں میں، فاتح اور مفتوح دونوں مختلف طریقوں سے شکست خوردہ ہوتے ہیں۔ آپ فسطائیت اور نازیت کے عروج کو بھی سمجھیں گے، جو بنیادی طور پر جمہوریت اور انسانیت مخالف ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد، دنیا نے ایک مختلف قسم کی جنگ کا تجربہ کیا، جسے سرد جنگ کہا جاتا ہے، جہاں حقیقی جنگ نہیں ہوتی، بلکہ ایک جنگی صورتحال بنی رہتی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بدترین نتائج کے تجربے کے بعد، دنیا کے ممالک ایک اور جنگ چھیڑنے سے ڈرتے ہیں، اس لئے انہوں نے اقوام متحدہ (UNO) قائم کی، جو کہ موثر اور غیر موثر دونوں ہے۔ یہ کورس آپ کو مختلف ترقی پسند عوامی تحریکوں سے بھی متعارف کرائے گا، جو دنیا بھر میں مظلوم انسانوں کو عزت و وقار دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مزید برآں آپ سابقہ سوویت یونین کے زوال، بڑی حد تک سرد جنگ کے اختتام اور امریکہ کے ایک نئے نوآبادیاتی کردار میں ابھرنے کو سمجھ سکیں گے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ جدید دنیا کی تاریخ کے جدید ہندوستانی تاریخ پر پڑنے والے اثرات کا خود تجزیہ کریں۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک کلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ :'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا سماج سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیاواچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید۔ میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

جدید دنیا – II

Modern World – II

اکائی 1۔ سرمایہ داری اور سامراجیت

(Capitalism and Imperialism)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید
1.1 مقاصد
1.2 سامراجیت کی تعریفیں
1.3 سامراجیت بنام نوآبادیت
1.4 سامراجیت کے طریقے
1.5 سامراجیت کے نظریات
1.5.1 اقتصادی وضاحتیں
1.5.2 سیاسی وضاحتیں
1.6 سامراج کے مراحل
1.6.1 مرکنٹالزم (تجارتی نظریہ زر)
1.6.2 صنعتی سرمایہ داری
1.6.3 مالیاتی سرمایہ داری
1.7 سرمایہ داری اور سامراجیت کے درمیان تعلقات
1.8 برطانوی سامراج اور ہندوستان
1.9 اکتسابی نتائج
1.10 کلیدی الفاظ
1.11 نمونہ امتحانی سوالات
1.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید (Introduction)

اس باب میں سامراجیت کو ایک تصور اور تاریخی رجحان کے طور پر سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ مختلف اسکالرز نے سامراج کو مختلف زاویوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے بلکہ اسے نوآبادیت جیسی اصطلاحات سے بھی الگ کیا ہے۔ان طریقوں پر بھی توجہ مرکوز کی ہے جن میں سامراج نے مختلف تاریخی موڑ پر مختلف شکلیں اختیار کیں۔اس اکائی میں سامراج کی مختلف وضاحتوں کا جائزہ لیا جائے گا اور اس کے علاوہ سامراج کے نظریات پر روشنی ڈالی جائے گی۔اس باب میں سامراج کے مختلف مراحل کو بھی جاننے کی کوشش کی جائے گی، کس طرح یہ مراحل سرمایہ داری کے عروج اور پھیلاؤ سے مطابقت رکھتے ہیں اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔آخر میں انیسویں اور بیسویں صدی میں برطانیہ سب سے بڑی سامراجی طاقت کے طور پر کیسے ابھرا،اس کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سامراجیت کیا ہے،اس کی نوعیت اور اس کے مختلف مراحل سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
- نوآبادیاتی نظام اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان روابط کو سمجھ سکیں گے۔
- کس طرح نوآبادیاتی نظام کے تحت ہندوستانی معیشت اور سماج مکمل طور پر برطانوی معیشت اور سیاسی کنٹرول کے تابع ہو گیا تھا،اس بات کو سمجھ سکیں گے۔
- تجارتی نظریہ زر،منڈیوں میں تیزی، سرمایہ داری کا فروغ اور تجارتی نظریات کا اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- سرمایہ داری کے عروج اور اس میں نوآبادیوں کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔

1.2 سامراجیت کا تعارف (Definition of Imperialism)

سامراجیت، سرمایہ دار ممالک(Capitalist Countries) کے ذریعے دنیا کے غیر سرمایہ دار ممالک کو فتح کرنے اور ان پر تسلط قائم کرنے کے عمل کو کہا جاتا ہے۔اس عنوان کے تحت، ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں سرمایہ دارانہ ترقی،ان کے باہمی تعلقات اور کس طرح سرمایہ دار ممالک، غیر سرمایہ دارانہ ممالک سے پیش آتے ہیں،اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مختصر طور پر، سامراجیت کی اصطلاح ایک طاقتور ملک اور اس کے زیر تسلط ملک کے درمیان سیاسی اور اقتصادی تسلط کے تعلقات کو ظاہر کرنے یا بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جو ملک ایک سرمایہ دار ملک کے قبضے میں ہوتا ہے اسے نوآبادی(Colony) کہا جاتا ہے اور اس عمل کو نوآبادیت(Colonialism) کہا جاتا ہے۔ سامراجیت اور نوآبادیت میں آپس میں گہرا تعلق ہے اور اس مضمون میں دونوں پر بحث ہو گی۔ لیکن اس اکائی میں ہم سرمایہ داری کے نظام میں سامراجیت کے اہم پہلوؤں پر توجہ مرکوز کریں گے۔

1.3 سامراجیت بنام نوآبادیت (Imperialism Vs. Colonialism)

سامراجیت اور نوآبادیت کے درمیان فرق کافی اہم ہے۔ سامراجیت کی تاریخ مخصوص نوآبادیوں کی تاریخ سے مختلف ہے۔ سامراجیت ایک خاص قسم کا مغربی رجحان ہے جب کہ نوآبادیاتی نظام، نوآبادیوں میں رائج ہے۔ جب ہم سامراجیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم شہری ترقی پر سامراجیت کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں، جب کہ نوآبادیاتی نظام کے زیرِ تسلط نوآبادیوں پر پڑنے والے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ برطانیہ کو سامراجی پالیسی یعنی نوآبادیاتی دولت سے صنعتی انقلاب کی ترقی اور اس کے نتیجے میں اعلیٰ فوجی تکنیک کے ارتقاء اور افسر شاہی جیسے تسلط کے طریقہ کار میسر ہوئے جس سے اسے کمزور ممالک کو آسانی سے اپنے زیرِ تسلط رکھنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

1.4 سامراجیت کے طریقے (Methods of Imperialism)

سامراج، رسمی اور غیر رسمی دونوں ہو سکتا ہے۔ رسمی سامراج میں الحاق اور براہ راست حکمرانی شامل ہے جبکہ غیر رسمی سامراج کا مطلب مقامی اشرافیہ کی بالواسطہ حکمرانی ہے جو قانونی طور پر آزاد ہیں لیکن سیاسی طور پر ترقی یافتہ ممالک پر منحصر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف تاریخی مراحل کو یاد رکھنا بھی ضروری ہے جن کے ذریعے سرمایہ دارانہ توسیع سلطنتوں کی تشکیل کا باعث بنی۔ سامراجیت کی بدلتی ہوئی نوعیت سرمایہ دارانہ ترقی کے مراحل پر منحصر تھی۔ بڑے پیمانے پر سرمایہ داری کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مندرجہ ذیل پانچ مراحل سے گزری ہے۔

1. پندرہویں صدی کے وسط سے سترہویں صدی کے آخر تک تجارتی سرمائے میں اضافہ اور عالمی تجارت میں تیز رفتار ترقی ہوئی۔
2. سترہویں صدی کے وسط سے اٹھارویں صدی کے آخر تک، تجارتی سرمایہ داری ایک غالب معاشی قوت تھی۔
3. اٹھارویں صدی کے آخر سے 1870 کی دہائی تک، صنعتی سرمائے کا دور دورا رہا۔
4. 1880 سے پہلی عالمی جنگ تک، اجارہ دارانہ سرمائے کا عروج اور سامراجی ممالک کے درمیان دنیا کی تقسیم وغیرہ مکمل ہوئی۔
5. پہلی عالمی جنگ کے بعد، اشتراکیت، عدم نوآبادیت اور کثیر قومی کارپوریشن (MNCs) کا عروج ہوا۔

اسی طرح، سامراجی سلطنتوں کی مندرجہ ذیل تین اقسام ہیں:

1. **تجارتی سلطنتیں:** اس سے مراد وہ سلطنتیں ہیں جنہوں نے ابتدائی فتوحات میں پہل کی لیکن آخر کار صنعتی سرمایہ داری کے دور میں ختم ہو گئیں، جیسے پرتگال اور اسپین۔
2. **صنعتی سلطنتیں:** وہ سلطنتیں جن میں مکمل نوآبادیاں ان کے تحت تھیں، جیسے برطانیہ اور فرانس
3. وہ **صنعتی سلطنتیں** جو بغیر یا چند رسمی نوآبادیوں کے ساتھ تھی۔ جیسے جرمنی۔

اس لحاظ سے سامراجیت کے مراحل سرمایہ داری کے مراحل کے ساتھ ملتے ہیں۔

سامراجی طاقتیں	سرمایہ داری کے مراحل
پرتگال اور سپین	تجارتی سرمایہ داری
برطانیہ، فرانس اور نیدرلینڈز	صنعتی سرمایہ داری
برطانیہ، امریکہ اور جرمنی	مالیاتی سرمایہ داری

یورپی نوآبادیاتی سلطنتوں کی تاریخ، دو متواتر حصوں میں تقسیم کی گئی۔ پہلا دور پندرویں صدی میں شروع ہوا اور اٹھارویں صدی کے فوراً بعد ختم ہوا، دوسرا اٹھارویں صدی سے لیکر بیسویں تک جاری رہا۔ پہلے دور میں امریکہ ایک کالونی کے طور پر اہم تھا—— دوسرے دور میں افریقہ اور ایشیا یورپی نوآبادیات کا مرکز تھے۔

1.5 سامراج کے نظریات (Theories of Imperialism)

سامراج کے نظریات کو دو وسیع اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اقتصادی اور سیاسی۔

1.5.1 اقتصادی وضاحتیں (The Economic Definitions)

ہوبسن (Hobson)، ہلفرڈنگ (Hilferding)، روزا لکسمبرگ (Rosa Luxemburg) اور لینن (Lenin) کی طرف سے پیش کردہ اقتصادی وضاحتوں میں ایک مشترکہ خصوصیت ان کا سیاسی ایجنڈا تھا۔ ہوبسن کا مقصد برطانوی عوام کو "برطانوی خارجہ پالیسی کا غلط استعمال کرنے والے نئی سازشی رجحان" سے آگاہ کرنا تھا۔ اس توسیع پسندانہ ایجنڈے کے لیے جو محض مالیاتی سرمایہ داروں کو مطمئن کرنے کے لیے عام لوگوں سے بھاری قیمت وصول کر رہا تھا جو اپنی سرمایہ کاری پر زیادہ سے زیادہ منافع کے علاوہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ولادیمیر لینن، ممتاز بالشویک رہنما اور 1917 میں روس میں انقلاب لانے والے، روسی عوام کو یہ یاد کرانا چاہتے تھے کہ پہلی عالمی جنگ ایک سامراجی جنگ ہے جس سے وہ دور رہنے کی پوری کوشش کریں گے۔ ہوبسن (1902) نے سامراجیت کو سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ صنعت کار ممالک نے غیر صنعت کار ملکوں کی منڈیوں کی تلاش کی کیونکہ انہیں اپنے سامان کو بیچنا بھی تھا اور صنعتوں کی ترقی کے لئے خام مال بھی چاہئے تھا۔ جس کی وجہ سے بڑی صنعتی طاقتوں کے ساتھ غیر ملکی منڈیوں کے لیے مسابقت کرنے والی نوآبادیوں کی دوڑ لگی تھی۔

روڈولف ہلفرڈنگ، اپنی کتاب *Das Finance Capital* جو کہ 1910 میں شائع ہوئی، میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ کس طرح بڑے بینک اور مالیاتی ادارے سرمایہ داری کے آخری مرحلے میں صنعتوں کو کنٹرول کرتے ہیں، جسے مالیاتی سرمایہ داری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سرمایہ داروں نے سامراجی توسیع کو خام مال کی محفوظ فراہمی، صنعتی سامان کی منڈیوں اور سرمایہ کاری کے راستے کو یقینی بنانے کے طریقے کے طور پر دیکھا۔ چونکہ ہر بڑی یورپی طاقت ایک اجارہ دار سرمایہ دار تھی، ان کی معاشی مسابقت جلد ہی سیاسی رقابت بن گئی، جو بدلے میں جنگ میں بدل گئی۔

روزا لکسمبرگ نے (1913) *Accumulation of Capital* میں سامراجی طاقتوں اور نوآبادیوں کے درمیان غیر

مساوی تعلقات کو اجاگر کیا۔ یورپی طاقتوں نے کثیر تعداد میں منڈیاں حاصل کی اور سرمایہ کاری کے لیے منافع بخش راستے حاصل کر لیے۔ اس کے برعکس، نوآبادیاں محض خام مال اور کھانے پینے کی اشیاء فراہم کرنے والی تھی۔ اسی طرح *Imperialism, the Highest Stage of Capitalism* (1916) میں لینن نے دلیل دی کہ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک پسماندہ ممالک میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ کیونکہ اپنے گھر یعنی اپنے ملک میں سرمایہ لگانے کے لیے معیشت کی ترقی اور محنت کشوں کے لیے بہتر معیار کی زندگی ہونی چاہیے، ان دونوں میں سے کوئی بھی سرمایہ داروں کے مفاد میں نہیں تھا۔ لینن کا کہنا ہے کہ یورپی طاقتوں کے درمیان دشمنیوں کے پیچھے سامراجی مفادات ہیں۔ ان کا ارادہ کھلے عام سیاسی تھا، سرمایہ دارانہ عزائم کو بے نقاب کرنا اور روس کے لوگوں کو قائل کرنا کہ انہیں جنگ میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔

1.5.2 سیاسی وضاحتیں (Political Definitions)

شمپیٹر (Schumpeter) کی *Imperialism and the Social Classes* (1931) نے بائیں بازو کی تمثیل کو الگ دکھایا ہے جو سامراج اور سرمایہ داری کو ایک ہی صف میں پر رکھتا ہے۔ اس کی ترتیب میں، سامراج اور سرمایہ داری کو واضح طور پر الگ الگ مظاہر کے طور پر دیکھا گیا۔ سامراجیت فطری تھی، جو سرمایہ داری سے پہلے کی قوتوں نے پیدا کی تھی۔ اس کے برعکس، سرمایہ داری جدید، اختراعی اور پیداواری تھی اور اسے خوشحال ہونے کے لیے کسی علاقے پر کنٹرول کی ضرورت نہیں تھی۔ جبکہ بائیں بازو کے مصنفین نے سامراج کو ایک معاشی نظام کے طور پر دیکھا۔

گلاگھر (Gallagher) اور رابنسن (Robinson) نے جدید سامراج کی مشترکہ تشریحات پر سوال کیے۔ وہ 1870 سے پہلے اور 1870 کے بعد کے سامراج کے درمیان فرق کو غلط سمجھتے تھے۔ نیز، آزاد تجارت کی سامراجیت یا غیر رسمی سامراجیت اتنا ہی اہم سمجھی جاتی تھی جتنی کہ رسمی سامراجیت۔ سیاسی توسیع، تجارت کے فروغ کے لئے اہم تھا 'اگر ممکن ہو تو غیر رسمی کنٹرول کے ساتھ تجارت؛ جب ضروری ہو تو حکومت کے ساتھ تجارت کریں۔' سامراج کے بارے میں گلاگھر اور رابنسن کی وضاحت متعصبانہ تھی۔ ان کے خیال میں سامراجیت ایک ایسا عمل تھی، جس نے اپنا دائرہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی افریقہ کے پسماندہ خطوں تک بڑھایا۔ ایشیا اور افریقہ کے علاقوں میں یورپی طاقتوں کی طرف سے نوآبادیوں کے لیے جدوجہد مسلسل جاری تھی کہ وہ جس علاقے پر چاہیں قبضہ کر سکتے تھے۔ یہ حریف ممالک کے درمیان تصادم سے بچنے کے لیے پیشگی اقدام تھا۔ اس نظریے نے یورپی سفارت کاری اور مالیاتی سرمایہ داری کے توسیعی کے حوالے سے نوآبادیوں کے لیے جدوجہد پر روایتی یورپی وضاحت پر سوال اٹھائے۔

نوآبادیت، اے جے پی ٹیلر (A.J.P. Taylor) کے مطابق، یورپی طاقتوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے لئے ایک آلہ بن گیا ہے۔ بسمارک نے 1880 کی دہائی میں اس امید پر نوآبادیاں حاصل کیں کہ برطانیہ کے ساتھ نوآبادیاتی جھگڑے سے، فرانس اور جرمن کے درمیان باہمی تعلقات قائم ہو جائے۔ نوآبادیوں کو حاصل کرنے کے مقابلہ میں انگلینڈ اور اٹلی کے درمیان فاصلے پیدا ہوئے اور اس

کے نتیجے میں اٹلی جرمنی کی طرف چلا گیا۔

اس حصے کا خلاصہ یہ ہے کہ سامراج کے لیے نظریات اور وضاحتوں کی ایک پوری دلیل پیش کی گئی ہے جو ہمارے پاس دستیاب ہے۔ان کو وسیع پیمانے پر اقتصادی اور سیاسی وضاحتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔اقتصادی وضاحتوں میں زائد پیداوار، مالیاتی سرمایہ داری کی ضروریات، سامراجی طاقتوں اور نوآبادیوں کے درمیان غیر مساوی تبادلہ،اور سرمایہ داری کے اعلیٰ ترین مرحلے سے متعلق عوامل شامل ہیں۔ سیاسی وضاحتوں نے سامراج کو ماقبل جدید کے طور پر دیکھا ہے۔نوآبادیوں میں ہونے والی پیش رفت یا یورپی ممالک میں سیاسی جدوجہد پر توجہ مرکوز کر کے ایک متضاد نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے۔

1.6 سامراجیت کے مراحل (Stages of Imperialism)

مورخین نے سامراج کو مختلف مراحل کے ذریعے اس کی ترقی کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

1.6.1 مرکنٹالزم اور ابتدائی تجارتی سلطنتیں (Mercantilism and Early Commercial Empires)

کس چیز نے یورپ کو عالمی رہنما بننے کے قابل بنایا؟ اگر ہم دنیا پر نظر ڈالیں تو 1500 عیسوی میں یورپ کی غالب پوزیشن کو معمولی نہیں سمجھا جا سکتا۔ سلطنت عثمانیہ، منگولوں کے ماتحت چین اور مغلوں کے ماتحت ہندوستان ترقی کے ایک ہی مرحلے پر تھے۔تاہم، انہیں ایک بڑی خرابی کا سامنا کرنا پڑا، اور وہ مرکزی حکومت کے ذریعے ان کا تسلط تھا جس نے فکری ترقی کے لیے سازگار حالات فراہم نہیں کیے تھے۔اس کے برعکس، مختلف یورپی طاقتوں کے درمیان مقابلے نے نئی فوجی تکنیکوں کو متعارف کرانے کی حوصلہ افزائی کی۔مثال کے طور پر طویل فاصلے کے مسلح بحری جہاز نے مغرب کی بحری طاقتوں کو سمندری راستوں کو کنٹرول کرنے میں مدد کی۔اس بڑھتی ہوئی فوجی طاقت نے اقتصادی ترقی کے ساتھ مل کر یورپ کو دوسرے براعظموں سے آگے بڑھایا۔

بحراوقیانوس کی تجارت کی ترقی شاندار تھی۔ 1510 اور 1550 کے درمیان اس میں آٹھ گنا اور 1550 اور 1610 کے درمیان تین گنا اضافہ ہوا۔ تجارت کے بعد سلطنتوں اور دوسرے انتظامی نظاموں کا قیام عمل میں آیا۔ ہسپانوی اور پرتگالی واضح طور پر امریکہ میں اپنی سلطنتوں کو مستقل کرنا چاہتے تھے۔ سامراجیت نے جو سامان امریکہ سے حاصل کیا ان میں سونا، چاندی، قیمتی دھاتیں اور مسالے کے ساتھ ساتھ تیل، چینی، نیل، تمباکو، چاول، کھال، لکڑی اور آلو اور مکئی جیسے نئے پودے بھی شامل تھے۔ جہاز سازی کی صنعت، برطانیہ میں لندن اور برسٹل، بیلجیم میں اینٹی ووپ اور نیدرلینڈز میں ایمسٹرڈیم کی بڑی بندرگاہوں کے آس پاس تیار ہوئی۔ڈچ، فرانسیسی اور انگریز جلد ہی ہسپانوی اور پرتگالیوں کے شدید حریف بن گئے۔ اس مقابلے نے جہاز رانی میں سائنس کی ترقی کی حوصلہ افزائی کی۔ بہتر نقشہ نگاری، جہاز رانی، اور دوربینوں نے سمندری سفر کو محفوظ تر بنا دیا۔اس سے یورپ کے ٹیکنالوجی کو تقویت ملی۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی نے دیگر شعبوں کے علاوہ تجارت میں یورپی غلبہ کو قابل بنایا۔

یورپ کے لیے، امریکہ اور کیپ آف گڈ ہوپ کے راستے کی دریافت سے، بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔اس نے یورپ کو ایک

محدود جغرافیائی دائرہ سے باہر نکالا۔ نئی دریافتیں، تجارت اور فتوحات کے، عملی نتائج برآمد ہوئے۔ ہر کالونی یا تجارتی مرکز ایک نیا معاشی محرک تھا۔امریکہ تجارت کے لئے ایک منڈی تھی اور امریکی بلین)یعنی سونا اور چاندی(نے یورپ میں پیسے کی سپلائی میں اضافہ کیا اور موجودہ معاشی اور سماجی ترقی کو تیز کیا۔ امریکہ کے ساتھ تجارت کا حجم بڑھ گیا۔ چار صدیوں تک امریکہ نے یورپیوں کی بھوک مٹادی۔ سونے اور چاندی نے تلاش اور فتح کی حوصلہ افزائی کی اور ان تارکین وطن کو اپنی طرف متوجہ کیا، جن کی پیروی مشنریوں نے کی تھی۔امریکی نوآبادیوں کی بنیاد کچھ افراد نے قائم کی تھی، ریاست اور مشنری جذبے نے بہت کم کردار ادا کیا۔

1815 سے پہلے اسپین اور پرتگال ممتاز سامراجی طاقتیں تھیں۔ان کی اولین حیثیت اس وجہ سے تھی کہ وہ پہلے دریافت کرنے والے ممالک تھے۔دونوں نے اپنی نوآبادیوں سے بہت زیادہ منافع کمایا۔پرتگال کی ایشیا اور پھر امریکہ اور برازیل میں ایک بہت بڑی سلطنت تھی۔نوآبادیاتی آمدنی 1711 عیسوی میں 72,000 برطانوی پاؤنڈ کے برابر تھی۔ پرتگالی سلطنت کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اپنی نوآبادیوں اور شہر کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔1604 تک کوئی علیحدہ نوآبادیاتی محکمہ قائم نہیں کیا گیا تھا۔فرانس نے اسپین اور پرتگال کی طرح امریکہ میں، کینیڈا اور لاطینی امریکہ کے علاقوں میں توسیع کی۔ یہ کام انفرادی فرانسیسیوں نے کیا جس کی حمایت بادشاہ نے کی جس کا مقصد اشیائے خردنوش کی فراہمی کو یقینی بنانا اور بحری طاقت میں اضافہ کرنا تھا۔ شاہی سلطنت قائم کرنے کا کام حکومت کی طرف سے مقرر کردہ کمپنیوں کے ذریعے انجام دیا گیا۔انہوں نے ریاست کے فائدے کے لئے کام کیا۔

1660 کی دہائی کے بعد نوآبادیاں، شاہی ملکیت بن گئیں اور شاہی گماشتوں نے حکومت کی ترجمانی کی۔ فرانسیسی نوآبادیاتی حکومت اسپین کی طرح آمرانہ تھی۔اس وقت فرانس ایک مطلق العنان بادشاہت تھا اور نوآبادیوں پر حکومت کرتا تھا اور انہیں کوئی آئینی حقوق نہیں دیتا تھا۔نوآبادیوں میں مقامی انتظامیہ اور قانون فرانس میں رائج لوگوں کے مطابق بنائے گئے تھے۔اس کی نوآبادیاتی سلطنت بہت زیادہ ریاستی مداخلت کا شکار تھی۔ پرتگال کے مقابلے میں فرانس نے اپنی نوآبادیوں میں کوئی زیادہ مالی منافع نہیں کمایا۔1789 عیسوی تک فرانس نے امریکہ اور ہندوستان میں اپنی زیادہ تر نوآبادیاتی جائیدادیں برطانیہ کے ہاتھوں کھودیں۔اس کی سب سے بڑی کمزوری کمتر بحری طاقت تھی۔ کچھ مغربی ریاستوں نے ہندوستان، افریقہ، لاطینی امریکہ اور آسٹریلیا میں اپنی نوآبادیاں تیار کیں۔یورپ کے لوگ افریقہ میں آباد نہیں ہوئے، وہ غلاموں، سونے کی خاک اور ہاتھی دانت سے مطمئن تھے۔ نوآبادیاں، برطانوی معیشت کے لیے اہم تھیں۔ وہ خام مال فراہم کرتی تھیں اور ترقی یافتہ ممالک کے لیے بازار تھیں۔

پانچ بڑی یورپی طاقتوں، فرانس، برطانیہ، آسٹریا، روس اور جرمنی میں سے، برطانیہ جلد ہی سربراہ بن کر ابھرا۔اس کے بہت سے وجوہات تھے-پہلا ایک ترقی یافتہ بینکنگ اور مالیاتی نظام تھا۔یورپ کے مغرب کی طرف،اس کے جغرافیائی محل وقوع نے اسے براعظم سے فاصلہ برقرار رکھنے میں مدد کی۔سب سے اہم عنصر، جس نے برطانیہ کو برتری دلائی، وہ یہ تھا کہ یہ صنعتی انقلاب سے گزرنے والا پہلا ملک تھا۔ اسے یورپ پر غلبہ حاصل کرنے اور ایشیا اور افریقہ میں نئی کولونیاں بنانے میں مدد ملی۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک ہسپانوی اور پرتگالی طاقت میں کمی آئی اور وہ اپنی نوآبادیوں سے محروم ہوگئے۔ جہاز رانی پر ہالینڈ کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔فرانس اور برطانیہ کے درمیان نوآبادیاتی دشمنی،

برطانیہ کی برتری پر ختم ہوئی۔ برطانیہ اب سلطنت، مالیات اور تجارت میں عالمی رہنما تھا۔

سولہویں صدی سے امریکہ، افریقہ اور ایشیا پر فتح بحری راستوں پر یورپ کی مہارت کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ اس میں بحر اوقیانوس پر واقع ممالک پرتگال، سپین، فرانس، برطانیہ اور ہالینڈ کو ان کے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے واضح فائدہ حاصل تھا۔ یورپ کا تسلط دوسرے ممالکوں کے لیے تباہ کن تھی۔ خاصکر امریکہ میں مقامی آبادیوں کا صفایا کر دیا گیا اور 1500ء سے 1860ء کے درمیان بارہ ملین افریقیوں کو غلام بنادیا گیا۔ یورپ کو اس دور میں بہت فائدہ ہوا جب تجارتی سرمائے نے عالمی معیشت کو کنٹرول کیا۔ جدید ریاست اور بیوروکریسی اور علم میں سائنسی انقلاب جیسے اداروں نے جدید دنیا کی بنیاد رکھی۔

1.6.2 صنعتی سرمایہ داری (Industrial Capitalism)

ہوبس بوم برطانیہ میں صنعتی انقلاب کو عالمی تاریخ کے اس غیر معمولی لمحے کے طور پر بیان کرتا ہے جب دنیا کی معیشت برطانیہ کے ارد گرد گھومتی تھی۔ جب وہ واحد عالمی طاقت، واحد سامراج، واحد درآمد کنندہ، برآمد کنندہ اور غیر ملکی سرمایہ کار تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں برطانیہ کو لفظی طور پر دنیا کے صنعتی مرکز کے طور پر بیان کرنا درست تھا جب اس نے اپنا زیادہ تر کوئلہ، لوہا اور فولاد تیار کیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد لبرل عالمی معیشت اور سرمایہ داری کے ذریعے غیر ترقی یافتہ دنیا میں آخری رسائی ہوئی۔ ابتدائی برطانوی صنعتی معیشت غیر ملکی تجارت پر اپنی توسیع کے لیے انحصار کرتی تھی۔ مصنوعات کے لیے بیرون ملک منڈیاں اور سرمائے کے لیے بیرون ملک دکانیں اہم تھیں۔ کپاس کی صنعت انیسویں صدی کے آخر میں اپنی پیداوار کا اسی فیصد برآمد کرتی تھی۔ لوہے اور فولاد کی صنعت نے انیسویں صدی کے وسط میں اپنی پیداوار کا چالیس فیصد برآمد کیا۔ اس کے بدلے میں برطانیہ نے خصوصی مقامی مصنوعات خریدیں جیسے امریکہ سے کپاس، آسٹریلیا سے اون، ارجنٹائن سے گندم وغیرہ۔ سامراجی سلطنت کے ساتھ برطانیہ کی تجارت بھی تیزی سے بڑھتی گئی۔ 1840 میں برطانوی برآمدات کا پینتیس فی صد کپاس لاطینی امریکا کا تھا۔ 1873 کے بعد مشرق نے برطانوی کپاس کی برآمدات کا ساٹھ فیصد سے زیادہ حصہ لیا تھا۔ للہذا، برطانیہ ان علاقوں میں دوسری سامراجی طاقتوں کے لیے دروازہ نہیں کھولنا چاہتا تھا، یعنی برطانوی مخالفت کی ٹھوس اقتصادی وجوہات تھیں۔

1815ء تک برطانیہ پہلے ہی بحری مہارت، مالیاتی وصولی، تجارتی مہم اور اتحاد کی سفارت کاری کے امتزاج کے ساتھ ایک ممتاز عالمی طاقت بن چکا تھا۔ برطانوی اقتصادی تسلط کی اگلی دہائیوں میں نقل و حمل اور مواصلات میں بڑے پیمانے پر بہتری کے ساتھ ساتھ صنعتی ٹیکنالوجی کی ایک خطہ سے دوسرے خطے میں تیزی سے منتقلی، اور تیار شدہ پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہوا، جس کے نتیجے میں نئی صنعتوں کے افتتاح کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ زرعی زمین اور خام مال کے ذرائع کے علاقے۔ مرکنٹالزم) تجارتی نظریہ زر(کا دور ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی محصول نامہ) ٹیرف(کی رکاوٹیں ختم ہو گئیں۔ ایک نیا نعرہ 'آزاد تجارت' تھا اور اس سے عظیم طاقت کے تصادم کی بجائے بین الاقوامی ہم آہنگی آئی۔ نوآبادیاتی سلطنتوں کے میدان میں، برطانیہ نے کوئی حریف نہیں چھوڑا۔ سلطنت 1815 اور 1865 کے درمیان اوسطاً 100,000 مربع میل کی شرح سے بڑھی۔ دوسرا گروپ آباد کار نوآبادیوں کا تھا، جیسا کہ جنوبی افریقہ، کینیڈا اور آسٹریلیا۔ صنعتی سرمایہ

داری کے پھیلاؤ کے ساتھ نوآبادیوں کی ضرورت بڑھتی گئی جو تیار شدہ سامان خاص طور پر ٹیکسٹائل اور خام مال جیسے کپاس اور غذائی اجناس کی سپلائی کرنے والے بازار بن گئے۔ کالونی ایک ماتحت تجارتی ساتھی کے طور پر ابھری جس کی زائد معیشت غیر مساوی تبادلے کی بنیاد پر تجارت کے ذریعے مختص کی گ تھی۔

مابعد صنعت کار اور نوآبادیاتی طاقتیں: انیسویں صدی میں برطانیہ بلاشبہ عالمی رہنما تھا۔ اس کی سلطنت بارہ ملین مربع میل اور دنیا کی ایک چوتھائی آبادی تک پھیلی ہوئی تھی۔ نوآبادیوں کی دوڑ میں جرمنی، اٹلی، امریکہ، بیلجیم اور جاپان کے داخلے کے ساتھ 1880 کی دہائی سے نوآبادیوں کی دوڑ میں تیزی آئی۔ طاقتوں کے درمیان یہ مخاصمت نئی نوآبادیوں کی دوڑ کا باعث بنی کیونکہ ہر طاقت اپنی منڈیوں، خام مال اور سرمایہ کاری کو محفوظ بنانے کی کوشش کرتی تھی۔ پسماندہ علاقوں کو ان کے خام مال کی سپلائی کو کنٹرول کرنے کے لیے ضم کر دیا گیا۔ ملایا نے ربڑ اور ٹن دیا اور مشرق وسطیٰ نے تیل دیا۔ اس دور مشکل میں سلطنت ایک مسند تھی۔ ان سامراجی طاقتوں نے اپنی ذاتی مفاد کے لئے دنیا کو نوآبادیوں، نیم نوآبادیوں اور اثر ورسوخ کے دائروں میں ڈھالا، یورپ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا، جس کا منطقی نتیجہ پہلی عالمی جنگ تھی۔ پہلی عالمی جنگ کا خاتمہ جرمنی اور سلطنت عثمانیہ کی شکست اور سامراجی طاقتوں کے درمیان نوآبادیوں کی دوبارہ تقسیم پر ہوا۔ 1929 کی عظیم کساد بازاری (The Great Depression) نے سامراجی طاقتوں کے رویے میں تبدیلی لائی۔ "آزاد تجارت" کے دن گئے اور اب "تحفظ پسندی" کا نیا نعرہ دیا گیا۔

1.6.3 مالیاتی سرمایہ داری (Finance Capitalism)

1860ء کے بعد عالمی معیشت میں بہت سی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ یورپ، امریکہ اور جاپان کے کئی ممالک میں صنعت کاری پھیل گئی جس کے نتیجے میں دنیا میں برطانیہ کی صنعتی بالادستی ختم ہوگئی۔ یہ برطانیہ کے لیے ایک دھچکا تھا۔ اس نے زیادہ تر پسماندہ دنیا پر غیر رسمی سلطنت کا تبادلہ کیا اور ایک چوتھائی حصے پر رسمی سلطنت رہی اور معیشت کے لئے پرانے نظام کو جاری رکھا۔ صنعتوں میں سائنسی ایجادات کا استعمال، صنعت کاری میں ترقی کا باعث بنا۔ جدید کیمیائی صنعتیں، پیٹرولیم کا بطور ایندھن اندرونی دہن کے انجن کے لیے اور صنعتی مقاصد کے لیے بجلی کا استعمال اس دور میں ہوا۔ مزید برآں، بین الاقوامی نقل وحمل کے ذرائع میں ترقی کی وجہ سے عالمی منڈی میں مزید یکجہتی ہوئی۔ گھریلو تجارت، صنعتی ترقی، نوآبادیوں اور نیم نوآبادیوں کے وسیع استحصال کی وجہ سے بڑے پیمانے پر سرمایہ جمع ہوا۔ یہ سرمایہ چند ہاتھوں تک ہی محدود تھا۔

1850 تک برطانیہ کی سرمائے کی برآمدات 30 ملین پاؤنڈ سالانہ تھیں۔ 75-1870 میں یہ 75 ملین پاؤنڈ تھا۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی 50 ملین پاؤنڈ تک پہنچ گئی، جس سے دوبارہ بیرون ملک سرمایہ کاری کی گئی۔ اس نے نوآبادیوں کے ساتھ تجارت کو مالی اعانت فراہم کی، جس میں بڑی مقدار میں خام مال منگوایا گیا اور اتنی ہی بڑی مقدار میں صنعتی سامان بھیجا گیا۔ سرمایہ اجارہ دارانہ کی گرفت کا اندازہ اس اعداد وشمار سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1914 تک یورپی ممالک دنیا کے 84.4 فیصد پر قابض تھے۔ سرمایہ کو سب سے پہلے لندن، پھر

نیویارک اور پھر تجارت اور مالیات کے بین الاقوامی بازار کے مراکز میں مرکوز اور منتقل کیا گیا۔ ترقی یافتہ ممالک نے سلطنت کو سیاسی اور نظریاتی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا۔ بپن چندرا لکھتے ہیں کہ نعرہ— 'برطانوی سلطنت پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا'— نے برطانوی کارکنوں میں فخر پیدا کیا۔ ہر ملک نے مختلف طریقوں سے اپنی سلطنت کا جواز پیش کیا۔ مثال کے طور پر، فرانس کا 'تہذیبی مشن' اور اسپین کا 'جیسویٹ مشن' اور جاپان کی 'ایشیائیت'۔

1870 اور 1913 کے درمیان لندن دنیا کا مالیاتی اور تجارتی مرکز تھا۔ 1913 تک برطانیہ کے پاس بیرون ملک مالیت 4000 ملین پاؤنڈ تھی۔ بیسویں صدی کے آخر میں زیادہ تر بین الاقوامی تجارت برطانوی بحری جہازوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد برطانیہ امریکہ سے یہ پوزیشن کھو بیٹھا۔ امریکہ بڑی غالب سرمایہ دارانہ معیشت بن گیا۔ وہ اب دنیا کا سب سے بڑا صنعت کار، غیر ملکی سرمایہ کار، تاجر اور بینکر تھا اور امریکی ڈالر معیاری بین الاقوامی کرنسی بن گیا تھا۔ بیسویں صدی کے وسط سے، ملٹی نیشنل کمپنیوں، بین الاقوامی ایجنسیوں اور بین الاقوامی اقتصادی اثر و رسوخ کے ترتیب و ترکیب کے تمام پہلوؤں کے عروج کے ساتھ ہی، ترک نو آبادیات نے رفتار پکڑی۔

1.7 سرمایہ داری اور سامراج کے درمیان تعلقات

(Relationship between Capitalism and Imperialism)

نئی یورپی مشینوں سے بنی اشیا کے لیے، نئی منڈیوں اور خام مال کے نئے ذرائع کی دریافت نے عالمی معیشت میں تجارت کو وسعت دی اور یوں بالآخر جدید سرمایہ داری کے ظہور کا باعث بنی۔ مشہور محقق اسمتھ نے *The Wealth of Nations* میں مارکیٹ کی معیشت اور غیر محدود تجارت کے فوائد کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اسمتھ برطانوی سامراج پر تنقید کرتا ہے، اور خاص طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری پر، اس لیے اسمتھ کے یہاں یہ واضح نہیں ہے کہ سامراج سرمایہ داری کے ساتھ ہے یا تجارتی ذہنیت کی باقیات جس کو انتشار پسندی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

معروف اسکالر جوزف شمپیٹر کا ماننا ہے کہ اشرافیہ کے جاگیردارانہ نظریات سامراج اور نو آبادیاتی حکمرانی کی نشو و نما کے لیے ذمہ دار ہیں۔ جبکہ اسمتھ برطانوی سامراج کو حکومت سے تاجروں کے اثر و رسوخ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسمتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سرمایہ داری غیر صنعتی ممالک پر حکمرانی کرنے کے بجائے ان کے ساتھ تجارت کرنا معاشی طور پر زیادہ کارآمد ہے۔ تاہم، تاجر اپنے ذاتی مفادات کے لیے حکومت کی پالیسوں کا استعمال نہیں کر سکتا ہے کیونکہ یہ باقی قوم کے لیے نقصان دہ ہے۔ سرمایہ داری کا ہدف، جیسا کہ اسمتھ نے تصور کیا تھا، "عالمگیر دولت" کو فروغ دینا ہے نہ کہ چند لوگوں کی افزودگی۔

غیر ملکی منڈیوں کے ظہور اور ان تک رسائی کی صلاحیت نے یورپی ممالک کو اقتصادی طاقت بخشی، اس صورت میں، برطانیہ کو اپنی اقتصادی رسائی کو بڑھانے کا موقع ملا جس سے اس کی دولت میں بے مثال اضافہ ہوا۔ اسمتھ کے اندازے کے مطابق پوری دنیا میں آزاد تجارت اور چھوٹی مسابقتی منڈیوں کا ایک سلسلہ ابھرے گا، اس طرح کئی ممالک اور کمپنیوں کے لیے خوشحالی میں اضافہ ہو گا۔ تاہم، برطانیہ اپنا خام مال

سستے میں حاصل کرنے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں اپنی اجارہ داری کی وجہ سے مقابلے کے خوف کے بغیر، ایک بڑی، کنٹرول شدہ مارکیٹ میں تیار کردہ سامان کو واپس فروخت کرکے زیادہ منافع کمانے میں کامیاب رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نوآبادیوں کو اپنا سامان خریدنے پر مجبور کرتی تھی اور برطانیہ میں بھی اپنی اجارہ داری کو برقرار رکھا۔ اس لیے نہیں کہ اس کا سامان سب سے سستا یا بہترین معیار کا ہے بلکہ "مقننہ پر غلبہ" کے نتیجے میں، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہ منافع اور محفوظ ہیں۔ مارکیٹ میں اس کی اہمیت نوآبادیوں پر محصولات اور پابندیوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ایک دائمی اجارہ داری قائم کردی اور یہ قوانین نہ صرف نوآبادیوں کے لیے بلکہ اپنے ملک کے لیے بھی نقصان دہ تھے۔

سرمایہ داری، جیسا کہ اسمتھ نے تصور کیا تھا، سامراج کے ظہور کی ضمانت نہیں دیتا۔ اسمتھ نے ایک ملک کو مارکیٹ کو کنٹرول کرنے کی کوششوں میں خود کو شامل کرنے کے خطرات سے خبردار کیا۔ سرمایہ داری سب سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے جب اسے آزاد منڈی کی معیشت میں لاگو کیا جاتا ہے۔ اسمتھ کے مطابق حکومت کا کردار محدود ہونا چاہیے۔ وہ مارکیٹ کے معاملات میں ملوث ہونے کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ اس طرح ریاست معاشرے کے معاشی کاموں سے الگ رہ کر، خصوصی مفادات کے گروہوں کے زیر اثر ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا مقصد ملک کی آبادی کے لیے آفاقی دولت پیدا کرنا ہے، اور اجارہ داری، جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی، ریاست اور آبادی کی قیمت پر چند لوگوں کے لیے منافع کا کام کرتی ہے۔ اسمتھ نے مشورہ دیا کہ اگر برطانیہ نے اپنی نوآبادیوں کو ترک کر دیا اور انہیں اپنے عہدے داروں کو منتخب کرنے کی قانونی آزادی اور خود مختار حکومت بنانے اور دیگر مراعات کی اجازت دے تو برطانیہ کو اپنی نوآبادیوں کے دفاع کے لیے بہت زیادہ رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور پھر بھی ان کے درمیان تجارت سے ترقی ہو سکتی ہے۔

1.8 برطانوی سامراج اور ہندوستان (British Imperialism and India)

مورخین بپن چندرا (Bipan Chandra)، ہندوستان میں صنعتی انقلاب اور برطانوی سلطنت کی پیدائش کے بیک وقت ہونے کی طرف مبذول کراتے ہیں، جو کہ دلچسپ بات یہ ہے کہ محض اتفاق نہیں تھا۔ ایک طرف 1750 کے قریب برطانیہ میں صنعتی انقلاب کا آغاز شروع ہوا، دوسری طرف 1757 میں بنگال کی فتح نے ہندوستان کو منظم طریقے سے لوٹنے میں برطانیہ کی مدد دی۔ خاصکر 1765 کے بعد ہندوستان سے دولت کی نکاسی یا سرمائے کی یکطرفہ منتقلی سے برطانیہ کی قومی آمدنی کو دو سے تین فیصد کا اضافہ کیا۔ اس وقت برطانوی قومی آمدنی کا صرف پانچ فیصد سرمایہ کاری سے آتا تھا۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کے لئے تیار شدہ سامان، اناج اور خام مال کی فراہمی کے لیے ایک بڑی منڈی کے طور پر ابھرا۔ ہندوستان سے افیون چین میں فروخت کی جاتی تھی، جس سے برطانیہ کی چین کے ساتھ سہ رخی تجارت ہوتی تھی۔ ریلوے سرمائے کی سرمایہ کاری کا ایک بڑا شعبہ تھا۔ برطانیہ کے بین الاقوامی توازن ادائیگی کے خسارے کو ہندوستانی برآمدات سے حاصل ہونے والے زرمبادلہ سے پورا کیا گیا۔ ہندوستان کی ساحلی اور بین الاقوامی تجارت پر اپنے کنٹرول کی وجہ سے برطانوی جہاز رانی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ہندوستان نے اس مرحلے کے دوران برطانوی سرمایہ داری کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ برطانوی صنعتوں خصوصاً ٹیکسٹائل کا بہت زیادہ انحصار برآمدات پر تھا۔ ہندوستان نے 1860-1880 کے دوران برطانوی برآمدات کا 10 سے 12 فیصد اور

برطانیہ کی ٹیکسٹائل برآمدات کا تقریباً 20 فیصد جذب کیا۔ 1850 کے بعد ہندوستان انجن کے ڈبوں، ریل لائنوں اور دیگر ریلوے اسٹوروں کا بھی ایک بڑا درآمد کنندہ تھا۔

مزید یہ کہ ہندوستانی فوج نے ایشیا اور افریقہ میں برطانوی نوآبادیت کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سارے مرحلے میں دولت اور سرمائے کی برطانیہ کی طرف روانی جاری رہی۔ برطانیہ خاص طور پر ہندوستانی سلطنت کا خواہاں تھا کیونکہ اس نے کپاس کے سامان کے لیے ایک منڈی فراہم کی تھی۔ اس نے مشرق بعید کی تجارت کو چین کے ساتھ اپنے زائد برآمدی (افیون) سے کنٹرول کیا۔ دولت کی نکاسی اور ہندوستانی عوامی قرضوں پر سود کی ادائیگیاں، برطانیہ کے توازن ادائیگی کے خسارے کو پورا کرنے میں اہم تھیں۔ ہندوستان نے ایک بین الاقوامی مالیاتی مرکز کے طور پر برطانیہ کی پوزیشن کو مضبوط کیا۔ ہندوستان کے زری ذخائر نے بھی برطانیہ کی مدد کی۔ اس لیے ہندوستان میں آزاد تاجر بھی باقاعدہ کنٹرول چاہتے تھے۔ بھارت نے اپنی ترقی کی ساری قیمت خود برداشت کی۔ ہندوستان نے ریلوے، تعلیم، جدید قانونی نظام، آبپاشی کی ترقی اور دیہی علاقوں میں انتظامیہ کی تفصیلی رسائی کے لیے ادائیگی کی۔

1870 کے بعد دنیا کی تقسیم کے لیے جدوجہد شدید ہو گئی، ہندوستان برطانوی سامراج کا سب سے بڑا ملک تھا۔ اس نے اس کی توسیع اور دیکھ بھال کے لیے مادی اور انسانی وسائل دونوں مہیا کیے۔ افغانستان، وسطی ایشیا، تبت، خلیج فارس کا علاقہ، مشرقی افریقہ، مصر، سوڈان، برما، چین اور کسی حد تک یہاں تک کہ جنوبی افریقہ کو بھی ہندوستانی مردوں اور پیسے کی وجہ سے برطانوی اثر ورسوخ کے دائرے میں لایا یار کھا گیا۔ برطانوی ہندوستانی فوج واحد بڑے پیمانے پر فوج کا دستہ تھا جو برطانیہ کو دستیاب تھا۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک بار جب برطانیہ کا ہندوستانی فوج اور مالیات پر کنٹرول ختم ہو گیا تو ایشیا اور افریقہ میں برطانوی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

1.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہوبس بوم نے دنیا کی تاریخ کو پندرہویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے وسط تک یورپی طاقتوں کے تسلط کے عروج وزوال سے تعبیر کیا ہے۔ برطانیہ پہلی بلاشبہ عالمی طاقت تھا۔ 1870 کے بعد سے یہ پوزیشن یورپ کے ان ممالک کی طرف سے چیلنج کی گئی جو صنعتی اور فوجی اور اقتصادی طاقت حاصل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب یہ تسلط باضابطہ طور پر ختم ہوا، تب بھی برطانیہ اور پھر امریکا کا اثر ورسوخ جاری رہا، چاہے وہ ملٹی نیشنل بینکوں اور مالیاتی اداروں میں ہو، پارلیمانی جمہوریت ہو۔

1.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

سرمایہ داری	:	یہ ایک معاشی نظام ہے جہاں نجی کاروبار اور تجارت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔
اجارہ داری	:	کسی شے کی سپلائی یا تجارت کا خصوصی قبضہ یا کنٹرول، جو دوسروں کے لئے تقریباً ناممکن ہو۔
نوآبادیت	:	کسی دوسرے ملک پر سیاسی کنٹرول حاصل کرنا، اور معاشی طور پر اس کا استحصال کرنے کی پالیسی یا عمل۔

محکومیت	:	ماتحتی، غلامی۔
افزودگی	:	زیادتی، اضافہ
آزاد منڈی	:	جہاں قیمتوں کا تعین کھلے مقابلے پر مبنی ہو۔
مراعات	:	رعایت رکھنا، لحاظ کرنا
زمیندار	:	اعلیٰ سماجی حیثیت کے حامل لوگ جو زمین کے کافی حصوں کے مالک تھے۔
میٹروپولیس	:	ایک تکنیکی اصطلاح جس کا مطلب نوآبادیوں کا مالک سرمایہ دار ملک ہوتا ہے۔
مرکنٹالزم	:	تجارتی نظریہ زر، یہ ایک سیاسی اور معاشی فلسفہ جس کے مطابق قومی ریاست کا بنیادی مقصد برآمدات کو زیادہ سے زیادہ کرنا، درآمدات کو کم کرنا اور زیادہ سے زیادہ بلین (سونا اور چاندی) جمع کرنا تھا۔
بلین	:	یہ سلاخوں کی شکل میں سونا یا چاندی ہے جو اکثر سکوں میں بدل جاتا ہے۔
صنعتی سرمایہ داری	:	ایک سرمایہ دارانہ نظام میں جہاں دولت یا سرمایہ صنعت کاروں کے کنٹرول میں ہو۔
تجارتی سرمایہ داری	:	سرمایہ دارانہ نظام میں جہاں دولت یا سرمایہ تاجروں کے کنٹرول میں ہو۔

1.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سامراج کے دو اہم مقاصد کیا ہیں؟
2. 'Imperialism is the highest stage of Capitalism'، جس نے اس کا حوالہ دیا۔
3. نوآبادیت کیا ہے؟
4. کون سا یورپی ملک سب سے پہلے ہندوستان آیا؟
5. کس ملک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "ان کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا؟
6. سامراج نے کس براعظم کو تقریباً پورا طور پر متاثر کیا۔
7. کتاب *Transition from Feudalism to Capitalism* کس نے لکھی۔
8. *Communist Manifesto* کا مصنف کون ہے۔
9. صنعتی انقلاب کی اصطلاح سب سے پہلے انگریزی میں کس نے استعمال کی تھی۔
10. صنعتی انقلاب کا تجربہ کرنے والا پہلا ملک تھا۔

1.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. نوآبادیاتی نظام کی بنیادی خصوصیات پر بحث کریں۔
2. ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔
3. ہندوستان میں نوآبادیت کے اجارہ داری تجارتی مرحلے کی اہم خصوصیات بیان کریں۔
4. انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں انگریزوں کی جانب سے اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں لکھیے۔
5. یورپ کے دیگر ممالک کے مقابلے انگلینڈ کی کامیابی کو بیان کریں۔

1.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سامراج کی مختلف نظریاتی وضاحتیں کیا ہیں؟ تفصیل سے بیان کریں۔
2. مختلف تاریخی مراحل کی وضاحت کریں جن کے ذریعے سامراج نے عالمی سطح پر مختلف شکلیں اختیار کیں۔
3. برطانوی سامراج کی توسیع میں ہندوستان ایک کالونی کے طور پر کیوں اہم تھا؟

1.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Basu, Dipak and Victoria Miroshnik, *Imperialism and Capitalism: Historical Perspectives*, Volume I, Palgrave Macmillan, London, 2020.
2. Cameron, Kenneth Neill, *Humanity and Society*: *A World History*, Aakar, Delhi, 2009.
3. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Frank, Andre Gunder, *On Capitalist Underdevelopment*, Oxford University Press, London, 1976.
6. Jain & Mathur, *History of Modern World*, Jain Prakashan Mandir, Jaipur, 2018.
7. Lenin, Vladimir, *Imperialism: The Highest Stage of Capitalism*, Penguin, UK, 2010.
8. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
11. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*, Trinity Press Pvt. Ltd., New Delhi, 2012.
12. Piketty, Thomas, *Capital and Ideology*, The Belknap Press of Harvard University Press, Cambridge, 2020.

اکائی 2۔آزاد خیالی، اشتراکیت اور قوم پرستی

(Liberalism, Socialism, and Nationalism)

اکائی کے اجزاء

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 پس منظر

2.3 آزاد خیالی

2.3.1 انگلینڈ میں آزاد خیالی اور جمہوریت کا ارتقاء

2.3.2 1911ء کا پارلیمانی ایکٹ

2.3.3 فرانس میں آزاد خیالی اور جمہوریت کا ارتقاء

2.4 اشتراکیت

2.4.1 ابتدائی اشتراکی تحریکیں

2.4.2 اشتراکیت اور کارل مارکس

2.4.3 پہلی اور دوسری انٹرنیشنل

2.5 قوم پرستی

2.5.1 پہلا مرحلہ

2.5.2 دوسرا مرحلہ

2.6 اکتسابی نتائج

2.7 کلیدی الفاظ

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

2.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید (Introduction)

نشاۃ ثانیہ، نئی جغرافیائی دریافتوں، مذہبی اصلاحی تحریکوں اور جاگیردارانہ نظام کے زوال نے یوروپ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ بحری سفروں میں اضافہ ہوا اور یوروپی اقوام نئے نئے علاقوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئیں۔ معیشت کے نئے دروازے کھلنے لگے، سماجی حدبندیوں میں تبدیلی آئی۔ اوہام پرستی اور اندھی تقلید کی جگہ عقل و فراست اور دانشمندانہ افکار نے حاصل کرلی۔ نتیجتاً سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی غرض کہ ہر سطح پر انقلاب رونما ہونے لگا۔ وہ نئے نظریات جنھوں نے انسانی زندگی کو بحیثیت مجموعی سب سے زیادہ متاثر کیا اور جن کے سبب ایک نیا یوروپ وجود میں آیا۔ ایسا یوروپ نے جس کے بعد میں برسوں تک عالمی سطح پر اپنی برتری ثابت کی، اُن میں آزاد خیالی، اشتراکیت اور قوم پرستی کو فوقیت حاصل ہے۔ دبے کچلے، پسماندہ عوام کو آزادی سے سانس لینے کے مواقع حاصل ہوئے۔ مذہبی اجارہ داری اور بے جا دخل اندازی ختم ہوئی اور مطلق العنان حکمرانوں کے لامحدود اختیارات سمٹ گئے۔ ان نظریات کی نشر و اشاعت میں انگلینڈ اور فرانس کو اولیت حاصل ہے، لیکن آہستہ آہستہ تمام یوروپ ان کے دائرے میں آگیا، جس کے نتیجے میں انفرادی طور پر شخصی آزادی حاصل ہوئی اور اجتماعی سطح پر ملک و قوم مختلف اقسام کی ناہمواریوں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- آزاد خیالی کے آغاز وارتقاء اور یوروپ پر اس کے اثرات و نتائج کو سمجھ سکیں گے۔
- اشتراکیت کے نتیجے میں معاشی و سماجی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان سے واقف ہوسکیں گے۔
- قوم پرستی کے تصور نے مختلف ممالک کو جس طرح متحد و مضبوط کیا اس کا جائزہ لے سکیں گے۔

2.2 پس منظر (Background)

پندرہویں صدی نے یوروپ میں ایک نئے دور کو ابھرتے دیکھا۔ اس کے آغاز وارتقاء کا تجزیہ کرنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مندرجہ ذیل عناصر اس کے آغاز کا سبب بنے۔ عہدِ وسطیٰ کے نظام کی شکست و ریخت اور نئی تبدیلیاں ان ہی کی مرہون منت ہیں۔

- جغرافیائی دریافتیں
- جاگیردارانہ نظام کا زوال
- سرمایہ داری کا آغاز
- جدید سائنس
- آزادیٔ رائے
- پروٹسٹنٹ چرچ
- متوسط طبقہ
- ایشیاء و امریکہ میں یوروپ کا داخلہ

نشاۃ ثانیہ اور مذہبی اصلاحی تحریکوں کے نتیجے میں ایک طرف تو عوام، جاگیرداروں اور مذہبی رہنماؤں کے پنجے سے آزاد ہوتے ہیں، تو دوسری طرف نئی دریافتوں نے نوآبادیت کو جنم دیا۔ دستی صنعتوں کی جگہ مشینوں کے استعمال سے بڑے پیمانے پر پیداوار نے صنعتی انقلاب کی

راہ ہموار کردی۔ کارخانوں کے لیے خام مال کی ضرورت اور پھر تیار شدہ اشیاء کے فروخت کے لیے بازار کی ضرورت نے نوآبادیات کی دوڑ شروع کردی۔ ان مذہبی، سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ جنہوں نے سماج کے ہر طبقے کو متاثر کیا اور عوام میں ایک ایسی بیداری کی لہر پیدا کی جس نے پرانے نظام کی جڑیں کھوکھلی کردیں۔ اس دور میں ایسے مفکرین اور دانشور نظر آتے ہیں، جن کے افکار و نظریات نے ملک و قوم کی کایاپلٹ دی۔ پہلے حکومت اور اقتدار کے لیے مخصوص جغرافیائی خطہ ہی لازم تھا، لیکن اس دور میں لسانی، تہذیبی و ثقافتی اور رنگ و نسل جیسے عناصر کے اشتراک نے قومی ریاستوں کی تشکیل میں مدد دی۔ ان ہی مشترکہ اقدار نے قوم پرستی کے جدید تصور کو جنم دیا۔ اسی طرح شخصی آزادی، اظہارِ خیال کی آزادی اور حکومتوں کی تشکیل و تبدیلی میں عوام کے اہم کردار کو ہم آزاد خیالی کی بنیاد میں کارفرما پاتے ہیں۔ وسائل کی منصفانہ تقسیم اور پسماندہ و پچھڑے ہوئے کسان و مزدور طبقہ کو استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے جو اقدام کیے گئے انہوں نے اشتراکیت کے لیے راستہ بنایا۔

2.3 آزاد خیالی (Liberalism)

ایک اصول کے طور پر آزاد خیالی کے جدید تصور کا آغاز انگلینڈ کے شاندار انقلاب اور فرانسیسی انقلاب کے نتیجے میں ہوا۔ انگلینڈ کے شاندار انقلاب نے یہ واضح کردیا کہ کوئی بھی طرزِ حکومت الوہیت کا حامل نہیں ہے۔ اس نے عہدِ وسطیٰ کے حکمرانوں کے Divine Right کو مسترد کردیا، جو ان کو مطلق العنانیت کی بنیاد فراہم کرتا تھا۔ اسی طرح 1789ء کے فرانسیسی انقلاب نے اس تصور کو جنم دیا کہ شخصی آزادی کو کسی بھی طرح کا اقتدار ختم نہیں کرسکتا۔ تھامس ہابس، جان لاک، مانٹیسکو، ٹامس پین، ایڈاسمتھ، ریکارڈو، بینتھم اور اسٹوارٹ مل جیسے مفکرین نے سیاسی و معاشی میدانوں میں آزاد خیالی کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ ابتدائی مرحلے میں آزاد خیالی کے علمبرداروں کا مقصد عوام کی سیاسی و معاشی زندگی میں حکومت کی کم سے کم مداخلت کا اصول تھا۔ اسے سیاسیات کی اصطلاح میں منفی آزاد خیالی کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں سیاسی و معاشی تبدیلیوں کے سبب مثبت آزاد خیالی کے تصور نے جنم لیا، جس کے مطابق عوامی بہبود اور عام سکھ کے پیشِ نظر حکومت کی مداخلت کو جائز تسلیم کیا گیا۔

2.3.1 انگلینڈ میں آزاد خیالی اور جمہوریت کا ارتقاء

(The Evolution of Liberalism and Democracy in England)

1688ء کے انقلاب نے شہنشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان جاری اقتدارِ اعلیٰ کی رسہ کشی کا خاتمہ کردیا۔ پارلیمنٹ کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرلیا گیا، لیکن یہ ابھی صرف آغاز تھا، کیونکہ اس سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ سیاسی قوت جاگیردار اور اعلیٰ طبقہ کے ہاتھ میں ہی تھی۔ دھیرے دھیرے صورتحال بدلنے لگی۔ دانشوروں کے مختلف طبقات سے اس نظام میں اصلاح کے لیے آوازیں اُٹھنی شروع ہوئیں اور عملی اقدامات کا آغاز ہوگیا، جس کے نتیجے میں 1832ء کا پہلا اصلاحی ایکٹ وجود میں آیا۔ برطانوی آئین کے ارتقاء میں اس ایکٹ کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ اس نے انتخابی حلقوں کے مختلف تضادات کو دور کیا اور ان میں موافقت پیدا کی اور رائے دہندگان کی تعداد کو بھی دوگنا کردیا۔ اس

قانون نے زمینداروں اور امراء کی اجارہ داری ختم کر دی اور متوسط طبقہ کو سیاست میں مقام دلایا۔اس طرح پارلیمنٹ میں اصلاح کا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ 1867‘ 1884‘ 1918 میں اصلاحی قوانین پاس ہوئے۔ مشہور مورخ گرانٹ ٹیمپر لے کے مطابق 1832ء کے ایکٹ نے 1688ء کے انقلاب کی تکمیل کر دی۔اسی طرح 1867ء کے اصلاحی ایکٹ کے نتیجے میں دس لاکھ سے زیادہ رائے دہندگان بنے۔اس نے انتخابی حلقوں کو دوبارہ تقسیم کیا اور آبادی کے تناسب سے پارلیمنٹ میں اراکین بھیجنے کا موقع فراہم ہوا۔اس کے علاوہ شہروں میں رہنے والے صنعت کاروں وغیرہ کو بھی کچھ سیاسی حقوق حاصل ہوئے۔ان سب کے باوجود اس میں بہت سی خامیاں تھیں، مثلاً عورتوں ‘مزدوروں اور کان میں کام کرنے والے حق رائے دہی سے محروم ہی رہے۔

1884ء میں تیسرا اصلاح ایکٹ پاس ہوا، جس کے بعد مزدوروں ‘زمین سے محروم کسانوں اور چھوٹے شہروں کے باشندوں کو بھی حق رائے دہی حاصل ہوا۔انتخابی حلقوں کو بھی آبادی کے تناسب سے سیاسی حقوق حاصل ہوئے۔ مشہور ماہر معاشیات ایڈم اسمتھ نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ ”1867ء کے ایکٹ نے انگلینڈ کو جمہوریت کے دراوزہ تک پہنچایا تھا تو 1884ء کے ایکٹ نے جمہوریت کے دروازے کھول دیئے، لیکن ابھی بھی جمہوریت نامکمل تھی، کیونکہ سبھی بالغ افراد کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں تھا۔ تقریباً 30 فیصد بالغ افراد ووٹ نہیں ڈال سکتے تھے۔علاوہ ازیں عورتیں بھی اس حق سے محروم تھیں۔

2.3.2 1911ء کا پارلیمانی ایکٹ (The Parliamentary Act of 1911)

انگلینڈ میں دارالامراء (House of Lords) میں امراء و اعلیٰ طبقہ کی اجارہ داری تھی۔اس لیے بہت سے قانون جو دارالعوام (House of Commons) پاس کرتا، دارالامراء کے مسترد کرنے کی وجہ سے قانون نہیں بن پاتے۔اس سے عوام میں بالائی ایوان کے خلاف غصہ بڑھنے لگا۔ 1909ء میں دارالعوام کے غرباء کی مدد کرنے کی غرض سے مالدار طبقہ پر بجٹ میں بھاری ٹیکس عائد کیے تو دارالامراء نے اس کی مخالفت کی۔اس پر عوام کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے دارالعوام کو برخاست کر دیا گیا اور دوبارہ انتخاب کرائے گئے، جس میں آزاد خیال گروپ والی حکومت کو پہلے سے بھی زیادہ نشستیں حاصل ہوئیں اور دارالامراء کو وہ بجٹ پاس کرنا پڑا۔ دارالامراء کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے مقصد سے دارالعوام نے 1911ء میں پارلیمانی ایکٹ پاس کیا جس کو نہ چاہتے ہوئے بھی بالائی ایوان کو منظور کرنا پڑا۔

1911ء کے پارلیمانی ایکٹ نے دارالامراء کی طاقت کو بہت ہی کم کر دیا۔ بجٹ کو بالائی ایوان صرف 30 دن کی مدت کے لیے روک سکتا تھا۔اس کے بعد وہ نیا منظوری کے ہی قانون بن جاتا۔اگر لگاتار تین سیشن تک دارالعوام کسی بل کو منظوری دیتا تو پھر یہ نیا دارالامراء کے منظوری کے قانون بن سکتا تھا۔اس طرح انگلینڈ میں دارالعوام زیادہ مضبوط ہو گیا۔انیسویں صدی کے آخر سے خواتین کے حقوق کی آواز تیز ہو گئی۔ان کو رائے دہی کا حق دلانے کے لیے کوششیں کی جانے لگی۔ جے ایس مل نے اس موضوع پر کتابیں لکھ کر بیداری پیدا کی۔خواتین کی سوسائٹیاں بننے لگیں اور تحریک شروع ہو گئی۔ بالآخر 1918ء میں ایک قانون کے ذریعہ 30 سال سے اوپر کی سبھی خواتین کو ووٹ دینے کا

حق حاصل ہو گیا۔ 1928ء میں ووٹ دینے کی عمر گھٹا کر 21 کر دی گئی۔ اس طرح بیسویں صدی کے آغاز میں آزاد خیالی کے علمبرداروں کی کوششوں سے انگلینڈ میں جمہوریت اپنی واضح شکل میں نظر آتی ہے۔

2.3.3 فرانس میں آزاد خیالی اور جمہوریت کا ارتقاء

(The Evolution of Liberalism and Democracy in France)

1789ء میں ہونے والے فرانس کے عظیم انقلاب سے قبل مختلف دانشوروں نے اپنے نظریات وافکار کی اشاعت سے آزاد خیالی کے ارتقاء کا راستہ متعین کر دیا تھا۔ وہ شخصی آزادی کے ساتھ مساوات اور انتظامیہ میں حکومت کی مداخلت کو کم سے کم کرنے کے حامی تھے۔ وہ تنظیم میں غیر مرکزیت لانے اور بالائی طبقہ کی خصوصی مراعات کو ختم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ برطانیہ کے سیاسی نظام کو فرانس میں نافذ کرنے کے حق میں تھے۔ نپولین کے زوال کے بعد ویانا کانفرنس میں یوروپ سے متعلق جو فیصلے لیے گئے، ان میں بوربون خاندان کے لوئی اٹھارویں کو فرانس کا حکمران بنادیا گیا۔ اس نے اپنی حکومت کی مقبولیت کے لیے 2 جون 1814ء کو ایک آئینی اجازت نامہ کے ذریعے انگلینڈ کی مانند جواب دہ کابینہ اور دو ایوانوں پر مشتمل مقننہ کی تشکیل کی۔ یہ قدم اپنی خامیوں کے باوجود آئینی حکومت کے لیے ایک بنیاد فراہم کرنے کے لائق ضرور تھا۔ 1824ء میں لوئی اٹھارہویں کی موت کے بعد چارلس دہم تخت نشین ہوا۔ یہ پرانے نظام کا حامی اور کٹر خیالات کا علمبردار تھا۔ یہ کسی بھی طرح کے آئینی حقوق کو حکومت کے لیے نقصان دہ سمجھتا تھا۔ اس کی رجعت پسندانہ پالیسیوں نے عوام کو اس کا مخالف بنادیا۔ جولائی 1830ء میں اس نے آرڈیننس جاری کر کے اخبارات پر پابندی لگائی اور انتخاب کے لیے نئے قوانین وضع کیے۔ نتیجتاً عوام مشتعل ہو گئی۔ تشدد کے واقعات رونما ہوئے اور بالآخر اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ جولائی کا انقلاب کہلاتا ہے۔ اس نے الوہی حقوق پر مشتمل مطلق العنانیت کا تو خاتمہ کر دیا، لیکن اس کی جگہ کونسا نظام لے گا، یہ طئے نہیں ہو پایا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں لوئی فلپ 1848-1830 حکمراں مقرر ہوا۔ تخت نشین ہوتے وقت اس کی تصویر ایک لبرل شخص کی تھی اور اس نے ''شہری بادشاہ'' کا لقب اختیار کیا۔ آئین میں کچھ اصلاحات کیں جس سے رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ ہوا، لیکن اس کی پالیسیوں سے نچلا طبقہ خصوصاً مزدوروں اور کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ بدقسمتی سے اس مسئلہ کا حل بھی اس نے رجعت پسند حکمرانوں کی طرح تحریک کو طاقت کے ذریعہ کچلنا چاہا، جس سے یہ آگ مزید بھڑک گئی۔ تشدد اور تصادم شروع ہو گیا اور بالآخر جب فوج نے بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو تخت چھوڑنے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ ہی نہیں بچا۔ اور وہ بھیس بدل کر انگلینڈ فرار ہو گیا۔ 1848ء کے انقلاب نے اقتدار سے متوسط طبقہ کی اجارہ داری ختم کر دی۔ انتخابات کے بعد نپولین سوم نے صدر کا عہدہ سنبھالا اور فرانس جمہوری (Republic) ملک بن گیا۔ لیکن چار سال کے بعد ہی نپولین سوم نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا اور اقتدار نے ایک بار پھر مطلق العنانیت کی شکل اختیار کر لی۔ اور 1870ء تک فرانس اسی راستے پر چلتا رہا۔ 1870ء میں ''سیڈان کی جنگ'' میں پرشا نے حیرت انگیز طریقے سے فرانس کو شکست دی۔ نپولین سوم کا سورج غروب ہو گیا اور عوام نے ایک بار پھر جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس وقت فرانس مشکل میں تھا۔ فاتح پرشا سے معاہدہ کرنا تھا، لیکن اس نے ملک میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پیرس کی کمیون

اور حکومت کے درمیان خونریز تصادم شروع ہو گیا۔ اس خانہ جنگی میں بہت خون بہا۔ باغی کمیون پر قابو پانے کے بعد (Commune) حکومت نے پرشا سے معاہدہ کی تکمیل کی اور ایک نئے جمہوری آئین (1875) کی تشکیل کی۔ نئے آئین کے مطابق پارلیمانی نظام حکومت قائم کیا گیا جس میں صدر کی حیثیت ایک آئینی عہدار کی تھی۔ پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل رکھی گئی۔ بالائی ایوان' سینٹ اور زیریں ایوان ''ایوان نمائندگان'' کہلایا۔ دونوں ایوانوں کو قومی اسمبلی کا نام دیا گیا۔ فرانس میں اگلے 70 سال تک یہی آئین نافذ رہا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد خیالی کے زیر سایہ جمہوریت کا ارتقاء سب سے پہلے انگلینڈ اور فرانس میں ہوا، جس کے بعد یوروپ کے مختلف حصوں میں جمہوری مملکتیں قائم ہوئیں۔ مطلق العنان حکمرانوں سے عوامی حکومتوں تک کا سفر آزاد خیالی کی ہی دین ہے، جس سے یوروپ پر سیاسی ہی نہیں معاشی اثرات مرتب کیے اور صورتحال کو یکسر تبدیل کر دیا۔

2.4 اشتراکیت (Socialism)

انیسویں صدی کا یوروپ اشتراکیت اور مزدور تحریکوں کا گواہ ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد جدید عہد میں سماجی اور معاشی میدانوں میں زبردست تبدیلیاں ہوئیں۔ صنعتی انقلاب کا آغاز انگلینڈ سے ہوا اور جلد ہی یوروپ کے دیگر ممالک میں پھیل گیا۔ اس کے نتیجے میں سماج میں دو طبقے وجود میں آئے۔ پہلا سرمایہ دار طبقہ جسے ''بورژدا'' کہا گیا۔ یہ کارخانوں اور صنعتوں کا مالک تھا اور تجارت پر اسی کی اجارہ داری تھی۔ دوسرا صنعتی مزدوروں کا طبقہ جسے ''پرولتاری'' کہا گیا۔ اس کی حالت دگرگوں تھی۔ دھیرے دھیرے یہ مزدور منظم ہونے لگے۔ غیر قانونی قرار دیئے جانے کے باوجود ٹریڈ یونین قائم ہوئیں، جن کے ذریعے نہ صرف مزدوروں کے معاشی مطالبات کے لیے آواز اٹھائی گئی، بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو اُکھاڑ پھینکنے کے لیے بھی کوششیں ہوئیں۔ اس طرح اشتراکی تحریکوں کا آغاز ہوا۔ اشتراکی افکار اور نظریات کو سائنٹفک شکل دینے اور یوروپ کے مختلف ممالکمیں اس کے لیے تحریکوں کے قیام میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر تک یوروپ کے کئی ممالک میں سرمایہ داروں کے استحصال سے مزدوروں کے تحفظ کے لیے آوازیں اُٹھنے لگیں، حکومتوں پر دباؤ بنائے گئے، جس کے نتیجے میں اس نظرانداز طبقے کے مفاد میں کئی طرح کے قوانین وضع کیے گئے۔

صنعتی انقلاب سے متاثر ہو کر بڑی تعداد میں افراد زمینیں چھوڑ چھوڑ کر کام کی تلاش میں کارخانوں میں جانے لگے۔ ان کارخانوں کے حالات بڑے خراب تھے۔ انگلینڈ جہاں سے اس کی شروعات ہوئی تھی، وہاں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت انتہائی افسوسناک تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں پر کام کا اتنا بوجھ تھا جس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں، مزدوروں کے استحصال کو روکنے کے لیے اگر کوئی قانون بنایا جاتا تو کارخانوں کے مالک اس کی مخالفت کرتے، حالانکہ اس مخالفت کی بھی مخالفت کی جاتی۔ اس طرح ایک طرف تو صنعتی انقلاب کا اثر بڑھ رہا تھا، وہیں دوسری طرف انسانیت کے جذبے سے سرشار کچھ خوشحال لوگ اس بات کی حمایت میں اُٹھے کہ آسودگی پر سب کا حق ہے۔ مزدوروں کو بھی خوشحالی کا کچھ حصہ ملنا چاہیے اور سرمایہ دار و مزدور کے مابین خلیج کم ہونی چاہیے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے راستوں کے انتخاب میں یہ مفکر اتفاق رائے نہیں رکھتے تھے۔ کچھ کا خیال تھا کہ پیداوار کے ذرائع پر حکومت کا مکمل کنٹرول

ہونا چاہیے، تاکہ ان کی منصفانہ تقسیم ہوسکے۔ کچھ سمجھتے تھے کہ خود مختار، خود مکتفی ''کمیون'' جو اپنے اندرونی انتظام کے لیے آزاد ہوں اس مسئلے کا حل ہیں۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک یوروپ کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو صنعتی انقلاب سے متاثر نہ ہوا ہو۔ وہ ممالک جہاں انیسویں صدی میں ہی یہ انقلاب رونما ہوچکا تھا، اب اشتراکی نظریات اور مزدور تحریکوں کا سامنا کر رہے تھے۔

2.4.1 ابتدائی اشتراکی تحریکیں (The Early Socialist Movements)

انگلینڈ جو صنعتی انقلاب کے آغاز کا گواہ تھا۔ سب سے پہلے اس نظام کے تحت ہونے والے استحصال اور ناانصافی کے خلاف آواز بھی یہیں بلند ہوئی۔ یہاں ایسے دانشور پیدا ہوئے جنہوں نے غریب، پسماندہ اور کچلے ہوئے مزدور طبقہ کی فلاح اور ان کے مفاد کے لیے اپنی فکر اور قلم کا استعمال کیا اور سماج میں بیداری پیدا کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ اسپینس، اوگلوی اور ٹامس پین وغیرہ نے یہ خیال پیش کیا کہ زمین پر سماج کا قبضہ ہونا چاہیے نہ کہ مٹھی بھر افراد کا۔ ولیم گوڈرن نے نجی املاک کو غلط قرار دیا۔ مشہور شاعر شیلے نے مزدوروں کے استحصل کے لیے حکومت پر زبردست تنقید کی۔ 1818ء میں سوئیس مورخ سائمنڈ ڈی سسمونڈی نے انگلینڈ کے غریب طبقے کی حالت زار پر افسوس کا اظہار کیا۔ یہ پہلا ماہر معاشیات تھا، جس نے مروجہ مستند معاشی اصولوں پر نکتہ چینی کرنے کی جراءت دکھائی۔ اس نے تجربہ اور مطالعہ کی بنیاد پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ایڈم اسمتھ کی عدم مداخلت کی پالیسی کتنی نقصان دہ ہے۔ اس نے کہا کہ سماجی تبدیلیوں کے مضر نتائج سے محفوظ رہنے کے لیے حکومت کو معاشی شعبوں میں دخل اندازی کرنی چاہیے۔ ان مفکرین کے علاوہ رابرٹ اووین نے جو خود ایک کارخانہ دار تھا، مزدوروں کی حالت بہتر کرنے کے لیے کوششیں کیں۔ اس نے اپنے نجی کارخانوں میں مزدوروں کے کام کے اوقات کم کیے، ان کی اجرت میں اضافہ کیا، ان کی رہائش کے لیے صاف ستھرے مکانات تعمیر کیے اور تفریح گاہیں قائم کیں۔ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ رابرٹ اووین نے ہی سب سے پہلے لفظ ''اشتراکیت'' کا استعمال کیا۔ اس کا خیال تھا کہ مزدوروں کی سہکاری سمیتیاں قائم ہوں اور کارخانوں میں ان کا حصہ ہو۔ اشتراکی مفکرین میں رابرٹ اووین کا مقام بہت بلند ہے۔

انگلینڈ کے ساتھ ساتھ فرانس میں بھی اشتراکی نظریات کی ترویج ہو رہی تھی۔ 1789ء کے عظیم انقلاب کے نتیجے میں کسانوں اور صنعت کاروں کو تو فائدہ پہنچا تھا، لیکن مزدور طبقہ محروم ہی رہا۔ 1795ء میں بے بوف نامی ایک شخص نے کمیونٹس ریاست قائم کرنے کی ناکام کوشش کی اور اپنے ساتھیوں سمیت سزائے موت کا سامنا کیا۔ اس کے نظریات اس کے بعد بھی باقی رہے۔ اس کا ماننا تھا کہ کل املاک پر ریاست کا حق ہونا چاہیے، تاکہ غریبی ختم ہو اور مساوات قائم ہو۔ فرانس کے کاؤنٹ ہنری ڈی سینٹ سائمن نے اپنی کتاب ''دی نیو کرسچیانٹی'' (1825) میں اپنے اشتراکی خیالات کا اظہار کیا۔ وہ دوسرے اشتراکی مفکرین کی طرح نجی ملکیت کا بالکل مخالف نہیں تھا، بلکہ وہ اس میں اصلاح چاہتا تھا۔ وہ مزدوروں کا بہی خواہ تھا۔ وہ مذہبی رجعت پسندی کا مخالف اور سائنس کا زبردست حامی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سماج کی سائنٹفک طریقے پر تشکیل ہونی چاہیے۔ مزدوروں کا معیارِ زندگی بہتر ہو، مسابقت ختم ہو اور پیداوار پر حکومت کا کنٹرول ہو تاکہ مزدور بھی منافع سے محروم نہ رہے۔ سینٹ سائمن کو فرانسیسی اشتراکیت کا حقیقی بانی تصور کیا جاتا ہے۔ سائمن کے بعد فیوریئے نے اس کے تنقیدی نظریے کو آگے بڑھایا۔ اس نے سرمایہ دارانہ سماج کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ اس نے غریب مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کوآپریٹیو

سمیتیاں قائم کرنے کی وکالت کی۔اس طرح سائمن اور فیوریئے دونوں یہ مانتے تھے کہ مزدوروں کی فلاح صرف ایسی صورت میں ممکن ہے جب سرمایہ دارانہ نظام کے ذریعے قائم کردہ کنٹرول ختم ہو۔لیکن ان دونوں مفکرین کے اصول عملی طور پر نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئے۔

فرانسیسی مفکرین میں لوئی بلانک (1811-1882)سب سے گہرے اثرات مرتب کرنے میں کامیاب رہا۔ریاستی اشتراکیت کے عروج کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔اس نے معاشی معاملات میں شخصی آزادی کی مخالفت کی اور ریاست میں مزدور کے کام کے حق اور اس حق کے حصول کے لیے قومی کارخانوں یا سماجی ورکشاپ کے قیام کی وکالت کی۔اس نے مزدور یونینوں پر بھی زور دیا۔1839ء میں شائع اس کی تصنیف ''آرگنائزیشن آف لیبر'' کے ذریعے یہ افکار و نظریات عوام تک پہنچے۔1848ء میں ہوئے فرانسیسی انقلاب کے بعد جب لوئی فلپ (1830-1848)کا تختہ پلٹ گیا تو لوئی بلانک کو عبوری حکومت میں شامل کیا گیا اور معاشی اصلاحات کی ذمہ داری دی گئی۔بے روزگاروں کی امداد کے لیے اس نے سماجی ورکشاپ کے قیام کو حکومت سے منظور کرایا، جہاں حکومت کے فراہم کردہ خام مال سے مزدور پروڈکشن کرتے، مگر یہ سلسلہ بہت دن نہ چل سکا۔1852ء میں جب نپولین سوم شہنشاہ بنا تو فرانس میں اشتراکیت کے استحکام کی یہ پہلی کوشش بھی اپنی موت مر گئی۔

2.4.2 اشتراکیت اور کارل مارکس (Socialism and Karl Marx)

کارل ہینرک مارکس ایک جرمن یہودی تھا۔بلاشبہ اشتراکی نظریات کی دنیا میں اس کا مقام منفرد اور بہت اثر انگیز ہے۔جرمنی افسران سے ایک اخبار نکالنے کے مسئلے پر ہوئے اختلافات کے بعد وہ پیرس آگیا، جہاں اس کی اپنے ایک ہم وطن اینگلس سے ملاقات ہوئی جو انگلینڈ میں ایک کارخانے کا مالک تھا۔دونوں نہ صرف ہم عمر تھے بلکہ ہم خیال بھی تھے۔مارکس اپنے فرانس کے قیام کے دوران سائمن اور فیوریئے سے بھی ملا۔لیکن فرانس سے اسے اپنے انقلابی نظریات کے سبب نکال دیا گیا، جس کے بعد وہ اینگلس کے ساتھ مل کر اپنے افکار کی ترویج میں لگ گیا۔1848ء میں دونوں نے ''کمیونسٹ اعلامیہ'' شائع کیا، جس میں مزدوروں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ متحد ہو کر اقتدار پر قبضہ کریں اور متوسط طبقے کی بالادستی کو ختم کردیں۔اس نے اشتراکیت کو مضبوطی عطا کی۔مارکس فرانس واپس آگیا لیکن 1848ء میں انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے سبب اسے پھر جلاوطن کردیا گیا، جس کے بعد اس نے اپنی باقی ماندہ عمر 1883ء تک لندن میں گزاری۔یہاں رہ کر اس نے سینکڑوں کی تعداد میں مضامین لکھے اور ''داس کیپٹل'' جیسی عظیم تخلیق وجود میں آئی۔

مارکس نے اشتراکیت کے اصول و ضوابط، اس کے مقاصد اور ان مقاصد کے حصول کے طریقوں اور اشتراکی سماج کی شکل و صورت کی وضاحت پیش کی۔اس کے مطابق تاریخ کی سب سے اہم حقیقت مختلف طبقات کی آپسی کشمکش ہے، جس کا بنیادی سبب پیداوار اور تقسیم ہے۔ اس نے کہا کہ تاریخی عمل میں قدیم سماج کی بنیاد 'غلامی'، جاگیردارانہ سماج کی بنیاد 'زمین' اور متوسط طبقہ والے سماج کی بنیاد 'نقد سرمایہ' ہے۔ یہی اس کی تاریخ کی مادی توضیح ہے۔مارکس نے بتایا کہ سماج کی تاریخ معاشی عوامل پر منحصر ہوتی ہے اور تاریخ طبقاتی کشمکش کی دستاویز ہے۔ایک طبقہ وجود میں آتا ہے تو دوسرا تباہ ہو جاتا ہے۔

'کمیونسٹ مینی فسٹو' کے مطابق دنیا کے تمام مزدوروں کا ہدف سرمایہ داری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اور اشتراکیت کا قیام ہے۔ اس کے مطابق طبقات اور طبقاتی تفریق سے آلودہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ ایک ایسا سماج وجود میں لانا ہے، جس میں ہر شخص کی آزادانہ ترقی ممکن ہو۔ اس 'منشور' کے آخر میں دنیا کے مزدوروں سے اپیل کی گئی ہے کہ 'دنیا کے مزدوروں ایک ہو جاؤ، تمہارے پاس کھونے کو کچھ نہیں ہے سوائے اپنی غلامی کی زنجیروں کے اور پانے کو تمہارے سامنے دنیا پڑی ہے۔' مارکس کے مطابق صنعتی انقلاب نے سرمایہ اور محنت کے درمیان کشمکش میں اضافہ کیا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ سرمایہ دار اور مزدور کے مابین ہونے والی کشمکش میں بالآخر جہت محنت کش طبقے کی ہوگی۔ مارکسزم کا مطمع نظر ایک ایسے سماج کی تشکیل ہے جس میں طبقوں کا وجود نہ پایا جاتا ہو، جس میں فرد کے مفاد اور سماج کے مفاد میں کوئی فرق نہ ہو۔ اینگلس اور مارکس کو یقین تھا کہ یہ کام مزدور طبقہ کرے گا۔ ان کا خیال تھا کہ مزدور کی نجات ہی میں تمام انسانیت کے مسائل اور ناانصافی کا حل موجود ہے۔

2.4.3 پہلی اور دوسری انٹر نیشنل (The First and the Second Internationals)

اشتراکی تحریک کی تاریخ میں ایک انتہائی اہم سنگ میل 1864ء میں ''بین الاقوامی کا سگار کمیٹی'' کا قیام ہے۔ یہی ''فرسٹ انٹر نیشنل'' کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی اشتراکیت تاریخ کے اسٹیج پر ایک عالمی تحریک کی شکل میں نمودار ہوا۔ ''فرسٹ انٹر نیشنل'' کارل مارکس کی دین تھی۔ اس کے قیام کے لیے لندن میں اجلاس ہوا، جس میں شرکت کے لیے برطانیہ 'فرانس' جرمنی 'اٹلی' پولینڈ اور سوئٹزرلینڈ سے نمائندے آئے۔ مارکس نے مزدور طبقہ کے نام ایک خطبہ تیار کیا، جس میں انٹر نیشنل کے اُصول وضوابط کا خاکہ پیش کیا گیا۔ اس کے اختتام میں ''سب ممالک کے مزدوروں ایک ہو'' کا نعرہ دیا گیا۔ انٹر نیشنل کے دستور کی تمہید میں اشتراکی مقاصد کو واضح کیا گیا، جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ مزدوروں کی فلاح خود مزدوروں کے ذریعے ہی ہونی چاہیے۔ اس میں کہا گیا کہ مزدوروں کی بہبودی ایک سماجی مسئلہ ہے۔

'انٹر نیشنل' کو اس کے قیام کے آغاز سے ہی مختلف ممالک کی حکومتوں نے اپنے لیے ایک خطرہ سمجھا، اور اسے ختم کرنے کے لیے کوششیں کی گئیں۔ چنانچہ کئی جگہ اس کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اپنی چھوٹی سی عمر 1875-1864 میں ہی اس نے یوروپ اور شمالی امریکہ کی مزدور تحریکوں پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ جب بھی کسی ملک میں مزدور جدوجہد کا آغاز کرتے تو 'انٹر نیشنل' دیگر ممالک کے مزدوروں کو ان کی مدد کے لیے تیار کرتا۔ مزدوروں کے اتحاد کی سب سے بڑی مثال فرانس اور پرشا کے مابین جنگ کے دوران دیکھنے کو ملی۔ فرانسیسی اور جرمن مزدوروں نے اس جنگ کی مخالفت کی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو نیک خواہشات کے پیغام بھیجے۔ لیکن مزدور تحریکوں کو معاونت دینے اور متاثر کرنے کے باوجود یہ تنظیم جلد ختم ہوگئی۔ آپسی اصلاحات کے سبب 1872ء میں اس میں پھوٹ پڑ گئی، جس کے نتیجے میں 1876ء میں باضابطہ طور پر اس کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا۔

فرسٹ انٹر نیشنل کے ختم ہونے کے باوجود دنیا بھر کے مختلف حصوں میں اشتراکی تنظیمیں قائم ہوئیں، جن کے اراکین کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ یہ ملکی انتخابات میں حصہ لیتے اور پارلیمنٹ تک پہنچتے۔ اس طرح اشتراکیت بتدریج قوت پکڑتا رہا۔ چنانچہ مختلف مالک کی

اشتراکی پارٹیوں کو متحد کرنے کی غرض سے 14 جولائی 1889ء کو فرانسیسی انقلاب کی 100 ویں سالگرہ کے دن پیرس میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس میں 20 ممالک کے 400 نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں "سکنڈ انٹر نیشنل" کا قیام عمل میں آیا۔ اس نے اشتراکی تحریک کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا۔

دوسری عالمی کانفرنس میں یہ طئے کیا گیا کہ یک مئی کا دن مزدوروں کے اتحاد کے طور پر منایا جائے گا۔ یہ طئے کیا گیا کہ اس دن عالمی مظاہرہ کر کے پوری دنیا کے مزدور ایک ساتھ اپنی اپنی حکومتوں سے کام کے اوقات 8 گھنٹے مقرر کرنے کی مانگ کریں گے۔ چنانچہ یکم مئی 1890 کو پورے یوروپ و اریکہ میں عظیم الشان مظاہرے ہوئے۔ لیکن شکاگو میں نہتے مزدوروں پر پولیس نے گولی چلا کر سینکڑوں مزدوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تب سے ان شہیدوں کی یاد میں یکم مئی کو عالمی یوم مزدور کے طور پر منایا جاتا ہے۔ سکنڈ انٹر نیشنل کی سب سے اہم کامیابی ملٹری ازم اور جنگوں کی مخالفت تھی۔ اس نے نوآبادیت کی مذمت کی اور اشتراکی گروپس کو نوآبادیات کی لوٹ اور غلامی کی مخالفت کے لیے تیار کیا۔ پہلی عالمی جنگ سے قبل یہ تحریک اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ اس کی ہمعصر حکومتوں کو اپنے وجود کا خطرہ ہو گیا تھا۔ عالمی اشتراکی تحریک سے مزدوروں میں خوداعتمادی اور اُمید کی نئی طاقت پیدا ہوئی۔ اس یقین نے جنم لیا کہ تاریخ ان کے ساتھ ہے اور یہ اُمید جاگی کہ مستقبل میں ایک ایسی دنیا وجود میں آنے والی ہے، جس میں ایک طبقہ دوسرے طبقہ کا استحصال نہیں کر سکے گا۔

2.5 قوم پرستی (Nationalism)

جدید دور کی ایک اہم پیشرفت قومی ریاستوں کا عروج ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں ہر جگہ جاگیردارانہ نظام کا بول بالا تھا اور یہ جاگیردار اپنے علاقوں میں کسی بادشاہ کی طرح حکومت کرتے تھے۔ اس صورتحال میں ملک یا قوم کا کوئی خاص تصور نہیں تھا۔ اس نظام کے تحت ایک نسل' مذہب' زبان اور مشترک تاریخی روایات رکھنے والے افراد بھی قوم کی شکل میں متحد نہیں تھے۔ لیکن پندرہویں اور سولہویں صدی میں حالات بدلنے لگے۔ جس طرح رومی سلطنت کے زوال اور پوپ کے اقتدار کے کمزور ہونے سے عوام کی طاقت میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح بڑھتی ہوئی عوام کی اہمیت نے جاگیرداروں کے اختیارات پر کاری ضرب لگائی۔ کسانوں کی بغاوت اور عوامی تحریکوں کا سامنا کئی یوروپی ممالک کو کرنا پڑا۔ حالانکہ ان تحریکوں کو کوئی خاص کامیابی تو نہیں ملی، لیکن انہوں نے قدیم سیاسی اکائیوں اور اقتدار کے مراکز کو تباہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ دھیرے دھیرے جدید قومیت کا تصور پیدا ہونے لگا، جس کے نتیجے میں بالآخر قومی ریاستوں کی تشکیل ہوئی۔ مغربی یوروپ میں 1589ء سے 1715ء کے درمیان قومی ریاستوں کا عروج اسی دور کی خاصیت ہے۔ انگلینڈ' فرانس اور اسپین جیسے ممالک میں نہ صرف عوامی سطح پر وطن پرستی کا جذبہ گہرا ہوا، بلکہ سیاست کے میدان میں بھی قومی یکتا کی بنیاد پر مضبوط جمہوریتیں قائم ہوئیں۔

1789ء میں ہونے والے فرانسیسی انقلاب نے قومیت کے تصور پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس نے عوام کی طاقت اور متحدہ قومی ریاست کے اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے دانشور قوم پرستی کے ارتقاء کو دو مرحلوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا فرانسیسی انقلاب سے پہلے، جب نہ تو اس کی شکل واضح تھی اور نہ ہی یہ عوام کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ لیکن پھر بھی قدیم نظام اور روایات کے زوال کے ساتھ اس کا

احساس ہو رہا تھا۔ دوسرا مرحلہ 1789ء کے بعد کا ہے۔ خصوصاً انیسویں صدی میں جب اس کی شناخت مکمل ہو رہی تھی اور یہ ایک مضبوط اور بہت ہی واضح کردار ادا کرنے کے لائق تھا۔

2.5.1 پہلا مرحلہ (The First Stage)

پہلے مرحلے میں انگلینڈ، فرانس اور اسپین میں قوم پرستی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل انگلینڈ اور فرانس قرونِ وسطیٰ میں بھی مشترک روایات، زبان اور تہذیب و ثقافت کے علمبردار تھے اور یہاں کے باشندوں میں ان بنیادوں پر ایک قسم کا اتحاد اور یگانگت پائی جاتی تھی۔ چودہویں صدی میں انگلینڈ اور پندرہویں صدی میں فرانس میں ان متحدہ عناصر کی بنیاد پر قومیت کا جذبہ نشو نما پانے لگا تھا۔ بعد میں اسپین اور ہالینڈ بھی اسی عمل سے گذرا۔ مشترکہ روایات و اقدار اور تہذیب و ثقافت نے قومی اتحاد کو جنم دیا، جس کی بنیاد پر مضبوط قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔ قوم پرستی کے تصور سے سرشار ان ممالک میں انگلینڈ کو تفوق حاصل ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں سیاسی طور پر عوام زیادہ مضبوط تھے اور ملکی نظم و نسق میں دوسرے مذکورہ ممالک کے مقابلے میں بہتر کردار ادا کر رہے تھے۔ اسی لیے ان کی دلچسپی اپنے ملک کے سیاسی اغراض و مقاصد میں زیادہ تھی۔ فرانسیسی مورخ گیزوٹ (Guizot) کے مطابق انگلینڈ اور فرانس کے مابین لڑی جانے والی سو سالہ جنگوں (1337-1453) نے قوم پرستی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، کیونکہ جب انگلینڈ کے بادشاہ نے فرانس کے تخت پر اپنا دعویٰ پیش کیا تو فرانس کے عوام و خواص سبھی متحد ہو گئے۔ جاگیردار، مزدور، کسان غرض کہ ہر طبقہ کے افراد غیر ملکی حملہ آور کے خلاف یکساں جذبہ سے سرشار تھے اور یہی جذبہ حُب الوطنی تھا۔

2.5.2 دوسرا مرحلہ (The Second Stage)

انیسویں صدی میں قوم پرستی اپنے عروج پر دکائی دیتا ہے اور یوروپ کے بیشتر حصوں میں اپنی واضح شکل کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس صدی مس ی قومی ریاستوں کی تشکیل عمومی طور پر نظر آنے لگی۔ فریڈرک لسٹ کے مطابق یہ جدید سماج کا ناگزیر حصہ تھی۔ ایک مخصوص جغرافیائی حدود میں رہنے والی آبادی ریاست کا تعین کرتی ہے، جس میں مشترک روایات، زبان اور نسل و تہذیب کے ساتھ ساتھ کچھ مشترکہ مسائل بھی ہوتے ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے طاقتور و منظم ادارے بھی ہوتے ہیں۔ فریڈرک کے اس تصور کو میزنی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ 1850ء میں میزنی نے یوروپ کا ایک نقشہ تیار کیا تھا، جس میں صرف ایک درجن ریاستیں اور فیڈریشن تھیں، لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد یوروپ میں 26 قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔ اس سے پولینڈ کے کرنل پلیوڈسکی کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ قومیں، ریاستوں کی تشکیل کرتی ہیں نہ کہ ریاستیں قوموں کی۔

یوروپ پر 1789ء کے فرانسیسی انقلاب کے واقعات اور افکار و نظریات نے بھی اپنا اثر ڈالا۔ خود فرانس میں تو صورتحال بالکل ہی بدل گئی۔ شہنشاہ کی جگہ عوامی حکومت نے لے لی اور بھلے ہی عملی طور پر بہت زیادہ نہ ہو، لیکن وہ جمہوری حکومت ہی کہلاتی۔ سیاسی تنظیمیں اور افواج بادشاہ کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے سرگرم عمل ہونے لگیں۔ فرانسیسی افواج نے جس طرح اپنے ملک کے خلاف بننے والے متحدہ

محاذوں کو شکست دی، وہ اسی جذبہ کی غماز تھی۔ نپولین کی قیادت میں ہر فوجی کے اندر جو ولولہ اور جوش دکھائی دیتا ہے اور جس کی بنیاد پر فتوحات کے ڈھیر لگ گئے، وہ بھی اسی کا عکس ہے۔ قومی ریاستوں کی تشکیل اور قوم پرستی کے پنپنے میں خود نپولین نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ انقلابی اور جمہوری فکر کے حامل دانشوران اور بورژوا طبقے کے افراد نے اٹلی اور جرمنی کے اتحاد کے لیے ہونے والی تحریکوں میں اہم کردار ادا کیا۔ مشرقی یوروپ جو نسبتاً پسماندہ تھا، وہاں عوامی سیاست کے آغاز نے قوم پرستی کو جنم دیا۔

برطانیہ اور فرانس میں قوم پرستی کا آغاز دوسرے ممالک کے مقابلے میں پہلے ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ ان کی قدیم روایات اور تاریخی عوامل تھے اور وہ جغرافیائی حدود کے ساتھ اس کا شعور رکھتے تھے۔ لیکن جرمنی اور اٹلی میں اس طرح کی صورتحال نہیں تھی۔ یہ مختلف جغرافیائی اور سیاسی اکائیوں میں منقسم تھے۔ لیکن ان کے باشندے لسانی طور پر ایک تھے۔ یعنی جرمن اور اطالوی بولنے والے افراد مختلف ٹکڑوں اور حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کے اتحاد میں زبان نے ہی سب سے اہم کردار ادا کیا۔ ان دونوں ممالک میں قوم پرستی کو قوت دینے میں لسانی عوامل ہی نے بنیادی کردار ادا کیا۔ پولینڈ، بیلجیم اور ہالینڈ بھی قوم پرستی کے فروغ کے نتیجے میں آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں رہنے والی یوروپین اقوام نے بھی ترکی حکومت سے آزادی کی جدوجہد شروع کر دی۔ اور برطانیہ، فرانس وروس کی اعانت سے یونان، بلغاریہ، رومانیہ اور سربیا نے آزادی حاصل کر لی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جدید دور میں ریاستوں کی تشکیل و تعمیر میں جغرافیائی حدود سے زیادہ رنگ و نسل، زبان اور تہذیب و ثقافت کی مشترک روایات زیادہ کارفرما نظر آتی ہیں۔

2.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

آزاد خیالی: آزاد خیالی کا مطلب ہے آزادی و مساوات۔ ایسی آزادی و مساوات جو فرد اور سماج دونوں کے لیے یکساں سود مند ہو۔ اصطلاحی اعتبار سے اس کے معنی افراد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ریاست کی گرفت سے آزاد کرنا ہے۔ اس کا آغاز بھی سیاسی میدان سے ہی ہوا، لیکن بتدریج معاشی سرگرمیاں بھی اس کے دائرے میں آتی چلی گئیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مغربی یوروپ میں آزاد خیالی نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور بیسویں صدی تک دنیا کے دیگر خطوں میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اس کا آغاز عدم مساوات، آمریت اور غیر رواداری کے خلاف ایک مضبوط آواز کی شکل ہوا، لیکن وقت اور علاقہ کے ساتھ اس کی شکل میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ انگلینڈ میں اس کا آغاز 1688ء میں رونما ہونے والے شاندار انقلاب کے ساتھ ہوا، جس کے ساتھ شہنشاہ اور پارلیمنٹ کے مابین جاری اقتدارِ اعلیٰ کی کشمکش ختم ہو گئی اور پارلیمنٹ مقتدرِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو گئی۔ لیکن اس سے عوام کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا کیونکہ ایوان حکومت ان کی پہنچ سے باہر تھے۔ رفتہ رفتہ اس نظام کی اصلاح کے لیے آوازیں اُٹھنے لگیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں 1832، 1867 اور 1884 میں تین اصلاحی ایکٹ منظور ہوئے، جس کے بعد رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ انتخابی حلقوں کی تقسیم بہتر طریقے پر ہوئی۔ زمینداروں اور اعلیٰ طبقہ کی اجارہ داری ختم کر کے متوسط طبقے کو بھی سیاست میں جگہ حاصل ہوئی۔ یہی نہیں مزدور اور کسان بھی ووٹ دینے کے حقدار قرار پائے۔ اس سمت میں مزید کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب 1911ء کا پارلیمانی ایکٹ منظور ہوا، جس کے نتیجے میں ایوانِ بالا یعنی دارالامراء

کی بالادستی ختم ہو گئی۔اس کا مطلب تھا امراء اور اعلیٰ طبقہ کی سیاسی فوقت کا خاتمہ۔1918ء میں انگلینڈ میں خواتین کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا۔یوں تو فرانس میں 1789ء کے انقلاب نے ہی اس آزاد خیالی کی داغ بیل ڈال دی تھی، جس کے لیے انقلاب سے پیشتر ہی دانشور طبقے نے راہ ہموار کرنی شروع کردی تھی۔ لیکن اس سمت میں تھوڑی سی پیشرفت 1830ء کے انقلاب کے بعد لوئی 18ویں اور پھر 1848ء کے انقلاب کے بعد لوئی فلپ کے دور میں بھی ہوئی جو بہت قابل ذکر نہیں ہے۔ بعد ازاں نپولین سوم شہنشاہ بن گیا۔ لیکن 1870ء میں سیڈان کی جنگ میں پرشا کے ہاتھوں حیرت انگیز شکست نے اس کے سورج کو غروب کردیا۔ نتیجتاً 1875ء میں ایک نئے جمہوری آئین کی تشکیل ہوئی اور پارلیمانی جمہوریت فرانس میں بھی قائم ہو گئی۔

اشتراکیت: صنعتی انقلاب کے نتیجے میں یوروپین ممالک میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے اور پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا۔ان معاشی تبدیلیوں نے دو نئے طبقے پیدا کیے، بورژوا اور پرولتاری۔ یعنی کارخیانوں کے مالکان جو سرمایہ دار تھے اور ان کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور۔ سرمایہ داروں کے ہاتھوں محنت کش طبقے کے استحصال نے ایک طبقاتی کشمکش کا آغاز کیا۔ چنانچہ مزدوروں کے مفاد اور ان کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مختلف آوازیں اُٹھنے لگیں۔نہ صرف ٹریڈیونین قائم ہوئیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے بھی کاوشیں کی گئیں۔یہی اشتراکی تحریکیں کہلائیں۔ان اشتراکی افکار و نظریات کی ترویج میں کارل مارکس اور اینگلس جیسے مفکرین نے اہم کردار ادا کیا۔ولیم گوڈرن نے نجی املاک کو غلط قرار دیا۔ مشہور مورخ سالمینڈ ڈی سسمونڈی نے مروجہ معاشی اصولوں پر زبردست تنقید کی۔رابرٹ اووین نے بھی مزدوروں کے لیے اصلاحی کوششیں کیں۔انگلینڈ کی طرح فرانس میں بھی اشتراکیت نے اپنی مضبوط گرفت بنائی۔ 1795ء میں بے بوف نے کمیونٹس ریاست قائم کرنے کی کوشش کی۔کاؤنٹ ہنری ڈی سینٹ سائمن نے "دی نیو کرسچیانٹی" میں اپنے اشتراکی افکار کی وضاحت کی۔ سائمن کے بعد فیوریئے نے تنقیدی نظریہ کو آگے بڑھایا اور کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کرنے کی تجویز رکھی تاکہ مزدوروں کی حالت بہتر ہو سکے۔اشتراکی تحریک کو عالمی سطح پر لانے اور بین الاقوامی اتحاد و تعاون کے لیے فرسٹ انٹرنیشنل اور سکینڈ انٹرنیشنل نے نمایاں کردار ادا کیے۔اس پلیٹ فارم سے ہونے والے اجلاسوں میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، پولینڈ اور سوئٹزرلینڈ سمیت بہت سے ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی اور مزدوروں کی بہبود کے لیے منصوبہ بنائے اور عملی قدم اٹھائے۔

قوم پرستی: رنگ و نسل، زبان و تہذیب اور روایات کا اشتراک افراد کو متحد کرنے کا کام کرتا ہے، یعنی ایک نسل اور ایک زبان بولنے والے افراد جن کی تہذیبی روایات بھی یکساں ہوں متحد ہو سکتے ہیں۔یوروپ کے جدید دور نے اسی صورتحال کی بنیاد پر قوم پرستی کے تصور کو فروغ دیا اور پھر اس پر قومی ریاستوں کی تشکیل ممکن ہوئی۔ ہینس کوہن کو قوم پرستی کا بانی مفکر تسلیم کیا جاتا ہے۔مارکسٹ دانشوروں کا خیال ہے کہ سرمایہ داری اور جاگیردارانہ نظام کا زوال قوم پرستی کے بنیادی اسباب میں شامل ہیں، جس کے سبب یہ تصور سیاسی قوت کے ساتھ فروغ پا سکا۔ یہ مانا جاتا ہے کہ امریکی انقلاب اور فرانسیسی انقلاب کا زمانہ قوم پرستی کی پیدائش کا عہد ہے۔ حالانکہ 1789ء کے فرانسیسی انقلاب سے پیشتر قوم پرستی کا تصور واضح طور پر ابھرا تھا، لیکن پھر بھی پندرہویں صدی سے ہی متحدہ قومیت کا جذبہ نشونما پانے لگا تھا اور انیسویں صدی تک یہ اتنا مضبوط ہو چکا تھا کہ اس صدی کو قوم پرستی کی صدی مانا جاتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ اور فرانس میں تاریخی عوامل نے ہی جغرافیائی علاقے کے اندر قوم پرستی کو فروغ دیا۔ لیکن جرمنی اور اٹلی میں معاملہ مختلف تھا۔ یہاں قوم پرستی کی بنیاد لسانی تھی۔ جرمن اور اطالوی زبان بولنے والے افراد اور علاقوں نے مل کر قومی ریاستیں قائم کیں۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہدِ وسطیٰ تک مختلف سلطنتوں کی پہچان ان کی جغرافیائی حدود تھیں، لیکن جدید دور میں زبان، نسل اور تہذیب وثقافت ریاستوں کی تشکیل میں اہم ہو گئیں۔

2.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

صنعتی انقلاب	:	خانگی صنعتوں کی جگہ مشینوں کے ذریعہ پیداوار
طبقاتی کشمکش	:	سرمایہ داروں اور مزدوروں کے مابین تعلق کی نوعیت جس میں مزدوروں کا استحصال ہوتا تھا۔
چارٹسٹ تحریک	:	انگلینڈ میں پارلیمانی خامیوں کو دور کرنے کے لیے چلائی گئی تحریک۔
دارالعوام	:	برطانوی پارلیمنٹ کا ایوانِ زیریں۔
دارالامراء	:	برطانوی پارلیمنٹ کا ایوانِ بالا۔
مقتدرِ اعلیٰ	:	مقننہ و انتظامیہ کے کل اختیارات کا حامل۔
خود مکتفی	:	اپنی ضروریات کے لیے کسی دوسرے پر منحصر نہ ہونا۔

2.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ایک اصول کے طور پر آزاد خیالی کے جدید تصور کا آغاز کب ہوا؟
2. آزاد خیالی کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کرنے والے دو مفکرین کا نام بتایئے۔
3. 1688ء کے شاندار انقلاب کے نتیجے میں انگلینڈ میں کیا تبدیلی رونما ہوئی؟
4. انگلینڈ کے دارالامراء میں کس طبقے کی اجارہ داری تھی؟
5. بورژوا طبقہ کن افراد پر مشتمل تھا؟
6. نجی املاک کو کس مفکر نے غلط قرار دیا؟
7. ”دی نیو کرسچیانٹی“ کے مصنف کا نام بتایئے۔
8. کارل مارکس کس ملک کا باشندہ تھا؟
9. مشترکہ لسانی و تہذیبی روایات نے کس تصور کو فروغ دیا؟
10. فریڈرک لسٹ نے کس طرح کے نظریات کو پیش کیا؟

2.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. آزاد خیالی کے آغاز پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. 1911ء کے پارلیمانی ایکٹ پر روشنی ڈالیے۔
3. کارل مارکس کے اشتراکیت کی وضاحت کیجیے۔
4. فرسٹ اور سکینڈ انٹر نیشنل سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
5. قوم پرستی کے پس پشت کارفرما عوامل پر روشنی ڈالیے۔

2.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. انگلینڈ اور فرانس میں آزاد خیالی کے ارتقاء کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. اشتراکیت کے آغاز اور ابتدائی اشتراکی تحریکوں پر مضمون لکھیے۔
3. قوم پرستی کے دو مرحلوں پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

2.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Anderson, Benedict, *Imagined Communities: Reflections on the Origins and Spread of Nationalism*, Verso, London, 2006 (First Edition 1983).
2. Gombrich, E.H., *A Little History of the World*, Caroline Mustill trans., Yale University Press, New Haven and London, 2005.
3. Gottlieb, Anthony, *The Dream of Enlightenment*: *The Rise of Modern Philosophy*, Penguin, UK, 2017.
4. Gray, John, *Concepts in Social Sciences*: *Liberalism*, World View, Delhi, 1998.
5. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
6. Hobsbawm, Eric J., *On Nationalism*, edited and introduced by Donald Sassoon, Little Brown, Great Britain, 2021.
7. Hobsbawm, Eric J., *Nations and Nationalism since 1780*: *Programme, Myth, Reality*, Cambridge University Press, Delhi, 2013 (first published 1990).
8. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
9. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
10. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
11. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
12. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.

اکائی 3۔ پہلی عالمی جنگ

(The First World War)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 پہلی عالمی جنگ کے اسباب
3.2.1 یورپ کی دو مخالف خیموں میں تقسیم
3.2.2 سامراجی مقابلہ آرائی
3.2.3 ہتھیاروں کی ہوڑ
3.2.4 امن کی کوششیں
3.2.5 انتہاپسندانہ قوم پرستی
3.2.6 جنگ کی فوری وجہ
3.3 پہلی عالمی جنگ کی ذمہ داری
3.4 دوران جنگ کے واقعات
3.5 پہلی عالمی جنگ کے اثرات
3.5.1 جمہوریت اور قوم پرستی کا عروج
3.5.2 یورپ مرکزیت کی جگہ بین الاقوامیت
3.5.3 جان ومال کی تباہی
3.5.4 خواتین اور مزدوروں کے حقوق کے لیے جدوجہد
3.5.5 ریاستی کنٹرول اور جنگی معیشت کا قیام
3.5.6 غیر یورپی ممالک میں سرمایہ دارانہ ترقی
3.5.7 غیر منصفانہ معاہدے اور نازیت اور فسطائیت کا عروج

3.6 اکتسابی نتائج

3.7 کلیدی الفاظ

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید (Introduction)

اگست 1914 میں یورپ میں شروع ہونے والی جنگ ایک عالمی جنگ بن گئی کیونکہ یورپ کے ممالک نے اس میں اپنی نوآبادیاں بھی شامل کیں اور جاپان اور امریکہ جیسے نئے ترقی یافتہ ممالک بھی اس میں شامل ہو گئے۔ برٹرینڈ رسل(Bertrand Russell) نے لکھا ہے کہ 'یورپ کی بادشاہتیں فرانس کے خلاف ایک اتحاد میں یکجا ہو گئیں، بغیر اس بات کا احساس کیے کہ وہ اپنی رجعت پسندانہ (ردانقلاب) کاوشوں سے ناگریز طور پر نپولین کو پیدا کر دیں گی۔' نپولین نے پرشیا کو تباہ کرنا چاہا اور اس نے فکٹے(Fichte) کو عروج دیا۔ فکٹے سے بسمارک تک کا سفر ایک فطری پیش رفت ہے۔ بسمارک نے فرانس کو کچلنا چاہا اور نتیجتاً فرانس میں انتقامی جذبہ بیدار کر دیا۔ اسی باہمی نفرت اور عناد کی وجہ سے پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا۔ سیڈان کی جنگ کے بعد فرانسیسی ادیب وکٹر ہیوگو(Victor Hugo) نے کہا تھا کہ 'آج سے ان دو قوموں یعنی فرانس اور جرمنی پر نظر رکھنی چاہیے۔ انہی کے ذریعے مستقبل کا تعین ہوگا'۔ یہ سچ ہے کہ پہلی عالمی جنگ کا براہ راست سبب ان دونوں ممالک کے درمیان دشمنی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے اسباب کو بین الاقوامی تعلقات کے علاوہ ایک طرف صنعتی ترقی کی جدوجہد میں تو دوسری طرف یورپ میں بڑھتے ہوئے عدم اعتماد کی وجہ سے اسلحہ سازی اور کشید گی پھیلنے میں تلاشنا ہوگا۔ برطانوی وزیر خارجہ ایڈورڈ گرے (Edward Grey) نے اپنے آخری دنوں میں بارود کے ڈھیر پر بیٹھے یورپ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے دکھ سے کہا تھا کہ 'سارے یورپ میں چاروں طرف چراغ بجھ رہے ہیں اور ہم اپنی زندگی میں انہیں دوبارہ جلتے ہوئے نہیں دیکھیں گے۔'

یہ مایوسی بے وجہ نہیں تھی۔ جب سے یورپ میں قومی ریاستیں بنی تھیں، تب سے ان میں باہمی کشمکش جاری رہی۔ اس سے پہلے ریاستوں میں باہمی لڑائیاں ہوا کرتی تھیں لیکن ان لڑائیوں کا دائرہ محدود تھا۔ سولہویں صدی میں ریاستوں کی ایک نئی شکل ابھری اور تیس سالہ جنگوں کا آغاز ہوا۔ 18ویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس کے ذریعے قومی شعور پیدا ہونے کے بعد شروع ہونے والا جنگوں کا سلسلہ نپولین کے زوال کے بعد ہی ختم ہوا۔ ان دو بڑی جنگوں سے بھی بڑے واقعات انیسویں صدی میں رونما ہوئے۔ 1914 سے 1918 تک جاری رہنے والی پہلی عالمی جنگ نے 30 سالہ جنگ سے کئی گنا زیادہ تباہی مچائی۔ مؤرخ فشر(Fisher) کے مطابق اس عظیم جنگ میں پرانی دنیا جل کر راکھ ہو گئی اور اس کی تعمیر نو ضروری ہو گئی۔ 28 جون 1914 میں ایک سربیائی طالب علم نے جو کہ ایک خفیہ تنظیم 'بلیک ہینڈ' کا رکن تھا، ہنگری کے ولی عہد شہزادہ فرانسس فرڈینینڈ کو قتل کر دیا۔ اس قتل نے واقعات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیا جس کی وجہ سے پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی۔ ڈیوک خود آسٹریائی دربار میں زیادہ مقبول نہیں تھا۔ یہ بیان کرنا مشکل ہے کہ اس قتل عام سے پیدا ہونے والے

حالات عالمی جنگ میں کیسے بدل گئے۔ مفروضہ قوم پرستی یا سماجی ناانصافی کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے ممتاز شخصیات کا قتل کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آسٹریا کی ملکہ، اٹلی کے شہنشاہ اور پرتگال کے شہنشاہ کو بالترتیب 1808، 1900 اور 1908 میں قتل کردیا گیا تھا۔ 1914 کے وسط میں بین الاقوامی ماحول بظاہر پرسکون نظر آرہا تھا۔ کسی دفتر خارجہ کو کسی قسم کی پریشانی پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ درحقیقت سفارت کار اور فوجی افسران گرمیوں کی چھٹیوں پر جانے کا منصوبہ بنارہے تھے۔ لیکن آج سو سال بعد بھی تاریخ دانوں میں اس بات پر اتفاق نہیں ہے کہ سراجیو میں ہونے والا یہ قتل، پہلی عالمی جنگ کی وجہ کیوں بنا۔ پھر بھی کچھ ایسے واقعات اس سے قبل وقوع پذیر ہوئے جن کی طرف توجہ دے کر ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- پہلی عالمی جنگ کے اسباب جان سکیں گے۔
- پہلی عالمی جنگ کے واقعات سے واقف ہو سکیں گے۔
- پہلی عالمی جنگ کے نتائج اور اثرات پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- پہلی عالمی جنگ، جان سکیں گے۔

3.2 پہلی عالمی جنگ کے اسباب (Causes for the First World War)

3.2.1 یورپ کی دو مخالف خیموں میں تقسیم (The Division of Europe into Two Opposing Camps)

1914 میں پہلی عالمی جنگ کا آغاز عالمی تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ تھا۔ یورپ میں خفیہ معاہدوں کا سلسلہ اس جنگ کا بنیادی سبب تھا۔ اس عمل کو شروع کرنے والا جرمن سلطنت کا چانسلر بسمارک تھا۔ 71-1870 میں اس نے فرانس کو شکست دے کر اور ذلیل کر کے جرمنی کا اتحاد مکمل کیا اور اس سے دو صنعتی علاقے السائس اور لورین بھی چھین لیے۔ اس کے جواب میں فرانس میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوا۔ جرمنی کو فرانسیسی انتقامی کارروائیوں سے بچانے کے لیے، بسمارک نے ایک عملی خارجہ پالیسی اختیار کی، جس کی اہم خصوصیت فرانس کو یورپی سیاست میں الگ تھلگ رکھنا اور جرمنی کے لیے زیادہ سے زیادہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا تھا۔ اسی ہدایتی اصول کی بنیاد پر 1879ء میں اس نے آسٹریا ہنگری کے ساتھ ایک خفیہ باہمی معاہدہ کیا، جس میں 1882ء میں اٹلی بھی شامل ہوگیا۔ اس طرح جرمنی کی سربراہی میں وسطی یورپ کے تین ممالک کا ایک سہ فریقی اتحاد تشکیل دیا گیا جس کا بنیادی مقصد فرانس پر نظر رکھنا تھا۔ بسمارک روس کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس مقصد سے متاثر ہو کر اس نے 1872 میں روس، جرمنی اور آسٹریا کے شہنشاہوں کو ملا کر 'تین شہنشاہوں کا وفاق' تشکیل دیا۔ لیکن، یہ اتحاد بلقان کے علاقے میں روس اور آسٹریا کے درمیان دشمنی کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا۔ اس کے باوجود 1887ء میں روس کو اپنا دوست بنائے رکھنے کے مقصد سے اس کے ساتھ ایک دوبارہ یقین دہانی (Re-unification) کا معاہدہ

کیا۔اسی دوران 1890 میں بسمارک کو اپنا عہدہ چھوڑنا پڑااور جرمنی کی خارجہ پالیسی خود شہنشاہ قیصر ولیم نے سنبھال لی۔اس نے روس کی دوستی کو کوئی اہمیت نہیں دی اور روس کے خلاف آسٹریا کا ساتھ دیتے ہوئے پچھلے معاہدے کو ترک کر دیا۔

اس صورت حال نے روس اور فرانس کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع فراہم کیا اور 1894 میں ان کے درمیان خفیہ شرائط کی بنیاد پر ایک معاہدہ ہوا اور ایک جرمن مخالف دو فریقی اتحاد وجود میں آیا۔اس طرح یورپ اب واضح طور پر دو مخالف کیمپوں میں بنٹ گیا۔اسی دوران جرمنی نے برطانیہ کو نو آبادیوں کے معاملات اور بحریہ کے میدان میں چنوتی کی۔اس وقت برطانیہ یورپی سیاست میں علیحدگی کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔لیکن جب جرمنی نے اسے ہر جگہ چیلنج کرنا شروع کیا تو انگلینڈ کے لیے جرمنی کے مخالف ممالک سے اپنے تعلقات اور روابط بڑھانا ضروری ہو گیا۔اس کے نتیجے میں 1904ء میں انگلینڈ اور فرانس کے درمیان اور 1907ء میں انگلینڈ اور روس کے درمیان دو معاہدے ہوئے۔حالانکہ یہ معاہدے محض نو آبادیاتی تنازعات کے نپٹارے کے لیے کیے گئے تھے اور انگلینڈ کسی بھی طرح فوجی مدد فراہم کرنے کا پابند نہیں تھا، پھر بھی اس معاہدے نے انگلینڈ کو روس اور فرانس کے گٹ کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ دیا۔غیر سرکاری طور پر انگلینڈ بھی فرانس اور روس کے دو فریقی اتحاد کا رکن بن گیا اور اس طرح جرمنی کے خلاف ایک سہ طرفہ اتحاد بھی تشکیل دیا گیا۔1890 اور 1907 کے درمیان یورپ میں ایک سفارتی انقلاب آیا جس نے بسمارک کے ہی طریقے اختیار کر کے بسمارک کے ہی کاموں کو تباہ کر دیا۔سفارتی نقطہ نظر سے یورپ کی دو مخالف گروہوں میں تقسیم یورپی امن کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوئی۔دونوں گروہ آپس میں مشکوک اور دشمن بن گئے اور دفاع کے لیے حملے کی پالیسی اپناتے جا رہے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ اسلحے میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔اس کی وجہ سے بین الاقوامی کشیدگی پیدا ہوئی، جنگ کا ماحول تیار ہوا، بین الاقوامی تلخیاں نمودار ہوئیں اور بالآخر جنگ بھڑک اٹھی۔

3.2.2 سامراجی مقابلہ آرائی (Imperialist Competition)

صنعتی انقلاب کی توسیع کے نتیجے میں مغربی یورپ کے ممالک میں پیداوار کی تیز رفتار میکانیکیت (Mechanisation) ہوئی یعنی زیادہ سے زیادہ مشینوں کا استعمال شروع ہوا۔پیداوار کے اس نئے طریقہ کی صورت یہ ہے کہ ضرورت سے زائد پیداوار کی صورتحال جلد پیدا ہو جاتی ہے۔یہ پیداوار سرمایہ دارانہ معیشت کے تحت ہو رہی تھی،اس لیے اسے صارف کی ضروریات اور اس کی قوت خرید کو مد نظر رکھ کر نہیں بلکہ منافع کو مد نظر رکھ کر کنٹرول کیا جاتا تھا۔منافع خوری بھی قدر کے اصول سے منسلک ہوتی ہے۔اس توسیع کو قومی سرحدوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا تھا۔برآمدات اور ایک حد تک درآمدات بھی لازمی ہو جاتی ہیں۔برآمدی تجارت بین الاقوامی بازار کی نوعیت اور اس کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہی ہو سکتی ہے۔یہاں بین الاقوامی مسابقت (competition) ہوتی ہے کیونکہ تمام پیداکار اپنا سامان بیچنا چاہتے ہیں۔اس سے بچنے کا صرف ایک طریقہ اجارہ داری (monopoly) تھا۔یہ اجارہ داری سیاسی طاقت کے بغیر ممکن نہیں تھی۔یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کی بڑھتی ہوئی صنعت کاری کے ساتھ یورپی ریاستوں کی پالیسی توسیع پسند ہوتی جا رہی تھی۔سرمایہ داری نے سامراجیت کو ناگزیر بنا دیا تھا۔لینن نے اسی نام کی ایک کتاب لکھی تھی جس میں سامراجیت کو سرمایہ داری کا انتہائی مرحلہ ثابت کیا تھا۔اس سرمایہ دارانہ ترقی میں ہی ایک تضاد تھا۔مارکس نے اسے انیسویں صدی میں ہی اپنے سائنسی تجزیے کی بنیاد پر دیکھا تھا۔صنعتی شعبے میں برطانیہ کی طاقت کا کوئی

حریف نہیں تھا۔تب بھی برطانیہ نے نپولین جیسی قدامت پسند طاقت کو توڑ کر ہی دم لیا۔جب یورپ میں بھی صنعتی ترقی شروع ہوئی تو برطانیہ نے خود کو یورپ سے الگ کر کے اپنی نوآبادیاتی سلطنت کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔لیکن جب یورپ میں، برطانیہ کی طرح معاشی طاقت پیدا ہو گئی تو مسابقت نے بڑھ کر تصادم کی شکل اختیار کر لی۔

ان تمام چیزوں کے پیچھے 19ویں صدی کے نصف آخر میں صنعتی ترقی کا پھیلاؤ اور سرمایہ دارانہ سامراجی معیشت کی اپنی ناگزیریت تھی۔ بڑھتی ہوئی صنعتی مسابقت میں نوآبادیوں کی اہمیت کئی وجوہات کی بنا پر بڑھ گئی تھی۔ نوآبادیوں سے صنعت کے لیے سستا خام مال حاصل کیا جاسکتا تھا۔نوآبادیوں میں بیرونی مسابقت کو محدود کر کے اور اندرونی ترقی کے امکانات کو ختم کر کے نہ صرف خام مال من مانی قیمتوں پر خریدا جاسکتا تھا بلکہ پیداوار اور فروخت کو کنٹرول کر کے مطمئن ہوا جاسکتا تھا۔اس طرح انہی منڈیوں میں اپنے استعمال کے بعد بچ جانے والی اشیاء کو بغیر کسی مقابلے کے من مانی قیمتوں پر فروخت کیا جاسکتا تھا۔اس سلسلے میں سرمائے کی توسیع لازمی تھی۔اگر اپنے ملک میں استعمال کے بعد بقیہ سرمائے کی دوبارہ سرمایہ کاری نہ کی جاتی تو نظام زر (currency system) میں افراتفری پھیل سکتی تھی۔اس لیے نوآبادیوں میں اضافی سرمایہ لگا کر وہاں باقاعدہ طریقے سے صنعتیں شروع کی جاسکتی تھیں، نوآبادیوں سے خوراک جٹائی جاسکتی تھی کیونکہ اپنے ملک کی محدود محنت کا استعمال خوراک کی پیداوار میں اتنا منافع بخش نہیں تھا جتنا صنعتی کاموں میں۔دوسری بات یہ کہ یورپ کے اکثر ممالک کی زمین اتنی زرخیز نہیں تھی کہ خوراک میں خود کفیل ہو۔نوآبادیوں میں دستیاب سستی مزدوری اپنے ملک میں ممکن نہیں تھی،اس لیے اپنے ملک میں محنت کی بڑھتی ہوئی قدروقیمت کو نوآبادیوں کی سستی محنت سے متوازن کیا جاسکتا تھا۔

یوں نوآبادیاں اب ناگزیر ہو چکی تھیں۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر تک دنیا کے بیشتر حصوں پر یورپ کی پرانی طاقتوں کا قبضہ تھا۔ انگلینڈ، فرانس، بیلجیئم، ہالینڈ حتیٰ کہ اسپین اور پرتگال بھی نوآبادیاتی سلطنتیں تھیں ۔1870 کی دہائی میں نئے سامراجی نظام (Neo-Imperialism) کا دور شروع ہوا۔جو نئی سامراجی طاقتیں ابھر رہی تھیں وہ بھی حصہ چاہتی تھیں۔پہلے کے سامراجی ممالک کے گروپ میں تین نئی ریاستوں، جرمنی، اٹلی اور جاپان کی شمولیت سے سامراجی رقابت میں شدت آ گئی کیونکہ نوواردوں کے لیے بازار ختم ہو چکے تھے۔ نتیجتاً سامراجی طاقتوں کے درمیان افریقہ کی تقسیم، چین کو حلقہ اثر میں بانٹنے اور بحرالکاہل کے متعدد جزیروں پر تسلط قائم کرنے کی خواہش کو لے کر شدید مقابلہ شروع ہوا۔ابتدائی طور پر یورپی ریاستوں نے پرامن طریقے سے افریقہ کو آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے 1884 کی برلن کانفرنس میں کچھ رہنمایانہ اصول طے کیے گئے۔ لیکن، اس منصوبے پر زیادہ دیر تک عمل نہ ہو سکا اور یورپی ریاستوں کے درمیان افریقہ کی تقسیم کے حوالے سے شدید کشمکش شروع ہو گئی۔

کم از کم دو سامراجی بحرانوں نے یورپی امن کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا۔ایک جنوبی افریقہ میں بوئر جنگ (The Boer War) تھی جس نے جرمنی اور برطانیہ کے درمیان تناؤ پیدا کیا تھا اور دوسرا سوڈان کے حوالے سے فاسودا (Fashoda) کا واقعہ تھا جس کی وجہ سے انگلینڈ اور فرانس میدان جنگ میں ٹکراؤ سے بال بال بچے تھے۔نئے سامراجی نظام کا دوسرا علاقہ چین اور بحرالکاہل کے جزائر تھے۔

یورپی ممالک نے چین کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اثر ورسوخ کے مختلف حلقوں میں تقسیم کیا اور بہت سی خصوصی سہولتیں حاصل کر لیں۔ اس کے نتیجے میں چین کی آزاد حیثیت تقریباً ختم ہو گئی۔ چین کو جاپانی سامراجیت کا بھی شکار بننا پڑا۔ 95-1894 میں جاپان نے چین کے ساتھ جنگ کی اور اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جاپان کے توسیع پسندانہ عزائم کی وجہ سے روس کے ساتھ اس کی کشمکش ناگزیر ہو گئی۔ 5-1904 میں روس اور جاپان کے درمیان جنگ بھی ہوئی جس میں جاپان نے روس کو شکست دے کر اپنے آپ کو ایک طاقتور صنعتی ترقی یافتہ سامراجی طاقت تسلیم کروایا۔ روس جاپان جنگ کا اثر یورپی سیاست پر بھی پڑا اور وہاں کا ماحول کشیدہ ہو گیا۔ سامراجی کشمکش کا تیسرا اور سب سے خطرناک علاقہ 'جزیرہ نما بلقان' تھا جہاں ترکی، روس اور آسٹریا کے سامراجی مفادات آپس میں ٹکراتے تھے۔

روس اور آسٹریا دونوں ترکی کے اختیار کو ختم کر کے جزیرہ نما بلقان پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ روس بلقان میں اپنی پرانی توسیع پسندانہ پالیسی کو بڑھانا چاہتا تھا۔ اسی طرح قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے بحیرہ اسود اور بحیرہ روم کو ملانے والی دونوں آبناؤں کے ذریعے بحیرہ روم تک پہنچ جانا اور اس طرح گرم پانی کی مستقل بندرگاہوں تک رسائی حاصل کرنا (Warm Water Policy) روسی زاروں کا خواب تھا۔ بلقان کے ممالک اس کام میں رکاوٹ بن سکتے ہیں، لیکن پہلے تو روس کو جرمن ممالک سے نمٹنا تھا۔ جرمن ممالک کے لیے خصوصاً مغرب یا جنوب میں توسیع ممکن نہیں تھی اور شمال میں بحیرہ بالٹک تھا۔ اب صرف مشرق رہ گیا تھا۔ اس لیے خاص طور پر آسٹریا نے توسیع کی پالیسی اپنائی، جس کی وجہ سے ایک طرف بلقان کے سرکردہ ملک سربیا کے ساتھ اس کی نوک جھونک شروع ہوئی اور دوسری طرف روس کے ساتھ اس کے مفادات ٹکرانے لگے۔ جرمنی کے ساتھ بھی روس کی کشیدگی اس وقت ظاہر ہو گئی جب جرمن شہنشاہ ولیم نے روس کے ساتھ تین شہنشاہوں کے اتحادی معاہدے کو ختم کر دیا۔ درحقیقت روس، آسٹریا اور جرمنی کے درمیان مفادات کا یہی ٹکراؤ پہلی عالمی جنگ کا سبب بنا۔

نوآبادیوں کے علاوہ سامراجی طاقتوں کو اپنے لیے عام بازاروں کی تلاش کرنا ضروری تھا۔ پرانے بازار میں مقابلہ اور کشمکش ناگزیر ہوتی جا رہی تھی۔ 1892 کے آخر میں برطانیہ کے ایک معتبر اخبار *Economic Review* میں لکھا گیا: 'اگر کل جرمنی تباہ ہو جائے تو پرسوں ہی کوئی ایسا انگریز نہیں بچے گا جو پہلے سے زیادہ امیر نہیں ہو جائے۔' برطانیہ میں جرمنی کی بڑھتی ہوئی مخالفت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ بڑھتی ہوئی معاشی مسابقت تھی۔

3.2.3 عسکریت پسندی اور ہتھیاروں کی ہوڑ (Militarism and the Arms Race)

یورپی ریاستوں کے درمیان ہتھیاروں اور فوجیوں کی تعداد میں اضافے کی ہوڑ عالمی جنگ کی تیسری بنیادی وجہ بنی۔ پرشیا یورپ میں اپنی فوج کے لیے مشہور تھا۔ جنگ کو وہاں کی قومی صنعت سمجھا جاتا تھا۔ فریڈرک ولیم اور عظیم فریڈرک کے زمانے سے ایک روایت شروع ہوئی اور انیسویں صدی میں نپولین کے خلاف ابھرنے والی تحریک نے پرشیائی فوج کو بہت مضبوط کیا۔ مولٹکے اور فانرون نے اسے ایک جفاکش فوج بنا دیا۔ بسمارک کی جنگوں نے ثابت کر دیا تھا کہ پرشین فوج کتنی منظم اور ماہر ہے۔ یہ سلسلہ جرمن سلطنت میں بھی جاری رہا اور اگرچہ بسمارک نے 1870 کے بعد کوئی جنگ نہیں چھیڑی لیکن اس نے اپنی فوج کو مسلسل تیار رکھا اور اسے طاقتور بنایا۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ

فوجیں مضبوط ہوتی گئیں۔ جرمن مؤرخ ٹرائی ٹشکے (Treitschke) نے واضح طور پر کہا تھا: 'جس طرح جرمنی کی عظمت کی بنیاد جرمنی کا پرشیا کے زیرِ حکومت ہونا تھا، اسی طرح دنیا کی عظمت اور بھلائی کے لیے، جرمن ثقافت، جرمن ذہن، ایک لفظ میں، جرمن کردار کی بالادستی ضروری ہے۔' جب جرمن طاقت کی دہشت میں اضافہ ہوا تو دوسرے ممالک میں فوجی تیاریاں بڑھنے لگیں۔ پرشیا میں لازمی بھرتی کی اسکیم کو دوسرے ممالک میں بھی اپنایا جانے لگا۔ پرشین فوج کو اپنا معیار بنا کر، ہر ملک میں قومی فوجیں منظم ہونے لگیں۔ سب سے زیادہ شدید مقابلہ آرائی بحریہ کے شعبے میں تھی۔ جرمن بحریہ بڑے بڑے جنگی جہاز بنا رہی تھی اور بندرگاہیں فوجیوں کے گڑھ بن رہی تھیں۔ انگلینڈ نے بھی اپنی بحریہ کو بھاری ہتھیاروں سے لیس کرنا اور ترقی دینا شروع کر دیا۔ فرانس اور اٹلی بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ مجموعی طور پر، پہلی بار، یورپ کی جنگی تیاری سمندروں پر بھی اتنی ہی مضبوط تھی جتنی کہ وہ خشکی پر تھی۔

حقیقت پسندی کے اس دور میں یورپ کی تمام ریاستیں اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنا چاہتی تھیں۔ تمام ممالک میں لازمی فوجی خدمت نافذ تھی اور جدید ترین ہتھیاروں سے لیس فوجیوں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے پورے یورپ میں فوجی ماحول چھایا ہوا تھا۔ مجموعی صورت حال یہ تھی کہ لاکھوں افراد پر مشتمل مستقل افواج اور اس سے بھی زیادہ فوجی کام کے لیے تربیت یافتہ افراد ایک قسم کی ذہنیت پیدا کر رہے تھے جسے عسکریت پسندی (Militarism) کہتے ہیں۔ ایورٹ (Everett) نے عسکریت پسندی کو ایک ایسی فطرت قرار دیا ہے جو 'کچھ کو قوم اور فرد کے لیے سربلندی اور نفاست کا ذریعہ بناتی ہے۔' اس کی وجہ سے جنگ، قومی غیرت کا ہتھیار نظر آتی ہے اور جارحانہ جنگ کی بات کرنے والے ہی 'ہیرو' بن جاتے ہیں۔ وہ صنعتیں جو ہتھیار تیار کرتی ہیں یا جو ٹھیکے یا سپلائی کے ذریعے جنگ سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں، ان کا ایسی ذہنیت پیدا کرنے اور بڑھانے میں بڑا کردار ہے۔ ایسی ذہنیت بتدریج جنگ کو ناگزیر بنا دیتی ہے۔ اس وجہ سے اس دور کے سیاست دان اپنے آپ کو زیادہ جارحانہ بنا کر سفارتی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور وہ کسی بھی قیمت پر ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جس سے ان کے ملک کو معمولی نقصان بھی ہو۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ دوسرا حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا، ہر ملک خود دفاعی تیاری کر رہا تھا۔ اس طرح ایک غلط سلسلہ چل پڑا جس میں ہر کوئی ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ نظر آنے لگا۔

ایک طرح سے یہ بین الاقوامی انتشار کا دور تھا۔ قومی ریاستوں کے درمیان اس نقصان دہ مقابلے کو روکنے کے لیے موثر اقدامات نہیں کیے جا رہے تھے۔ ایسے ماحول میں ملکی سیاست میں فوجی افسروں کا مقام نمایاں ہو گیا اور وہ سول افسروں پر حاوی ہو گئے۔ یورپ میں جب بھی کوئی بحران پیدا ہوتا، فوجی حکام سول حکام پر دباؤ ڈالتے کہ انہیں جلد از جلد جنگ شروع کرنے کی اجازت دی جائے، ورنہ اسٹریٹجک صورتحال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ جولائی 1914 میں جب جنگ شروع ہوئی تو بالکل ایسی ہی صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ اگر یورپی ریاستوں کے فوجی افسران اس وقت تھوڑا سا بھی تحمل سے کام لیتے تو شاید ایک بڑی جنگ چھڑنے سے روکی جا سکتی تھی۔ عسکریت پسندی کی اس پالیسی کی مخالفت بھی ہوئی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ٹیکس بڑھ رہے تھے اور عام آدمی پر معاشی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ بریلزفورڈ (Brailsford) نامی انگریز نے اپنی کتاب *The War of Steel and Gold* میں کہا تھا کہ 'فوجی تیاری بڑھنے سے جنگ مزید قریب آتی چلی جاتی ہے'، لیکن اس کی کون سنتا۔ ویسے بھی دانشوروں کا سیاست پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔

3.2.4 امن کی کوششیں (Efforts at Peace)

عسکریت پسندی کی اس پالیسی کی مخالفت بھی ہوئی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ٹیکس بڑھ رہے تھے اور عام آدمی پر معاشی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ بریلز فورڈ (Brailsford) نامی انگریز نے اپنی کتاب *The War of Steel and Gold* میں کہا تھا کہ 'فوجی تیاری بڑھنے سے جنگ مزید قریب آتی چلی جاتی ہے'، لیکن اس کی کون سنتا۔ ویسے بھی دانشوروں کا سیاست پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔ پورے یورپ میں امن کی تمام کوششیں، تحریکوں میں بدل رہی تھیں۔ امن تحریک کے لیے ہر ملک میں کمیٹیاں بنائی گئیں۔ اٹلی میں 55، انگلینڈ میں 22، فرانس میں 36، امریکہ میں 17، حتیٰ کہ لاطینی امریکہ میں 7 اور آسٹریلیا میں 4 ایسی تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ دنیا بھر کے نامور دانشور اپنا وقت اور پیسہ امن کے مقصد کے لیے لگانے میں مصروف تھے۔ روسی ادیب ٹالسٹائی(Tolstoy)، سویڈش سائنسدان نوبل(Nobel)، فرانسیسی دانشور کانسٹنٹ(Constant)، انگریز مصنف ایچ جی۔ ویلز (H.G. Wells) اور امریکی امیر کارنیگی(Carnegie) اس سمت میں سب سے آگے تھے۔ لیکن ان کی کوششوں کا سیاست اور سیاستدانوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ حالانکہ زار نکولس متاثر ہوا۔ اس نے روس کی مثالی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے ہیگ(Hague) میں کانفرنسیں بلائیں۔ ان کانفرنسوں میں قراردادیں منظور کی گئیں۔ تخفیف اسلحہ ضروری سمجھا گیا۔ لازمی ثالثیت کی بات بھی کی گئی لیکن یہ اونچی آوازیں کھوکھلی ثابت ہوئیں کیونکہ یہاں اصول پیش کیے جا رہے تھے، پالیسیاں نہیں، اور ان اصولوں پر عمل درآمد کی نہ کوئی ضمانت تھی اور نہ مجبوری۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امن کے لیے ہیگ کے اعلانات، نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ پرامن طریقے سے معاہدے ہو ہی نہیں رہے تھے۔ الاباما کے قضیہ کا حل نکالا گیا تھا۔ ارجنٹائن اور چلی کے درمیان سرحدی تنازعات بھی بات چیت سے سلجھا لیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ 'مراکش کا بحران' بھی گفتگو اور اجلاس سے ٹلا تھا۔ لیکن ایسا امکان کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔

3.2.5 انتہا پسندانہ قوم پرستی (Chauvinism)

جب یورپ ان حالات سے گزر رہا تھا، اسی دوران انتہا پسندانہ قوم پرستی نے سر اٹھایا اور عالمی جنگ کی چوتھی بنیادی وجہ بن گئی۔ قوم پرستی سولھویں صدی سے ہی ایک سیاسی قوت کے طور پر پنپنا شروع ہوئی۔ نپولین کے زوال کے بعد پورے یورپ میں قوم پرستی تیزی سے ابھر رہی تھی۔ اٹلی اور جرمنی کے اتحاد کے بعد مسابقت میں تیزی آئی۔ اب تک مقابلہ صرف مقامی سطح پر ہو سکتا تھا۔ کیونکہ برطانیہ اور فرانس کے علاوہ یورپ میں کوئی ایسی طاقت نہیں تھی جس کے مفادات عالمی ہوں۔ لیکن جیسے جیسے صنعتی انقلاب پھیلتا گیا، مفادات بھی پھیلتے گئے۔ برطانیہ، فرانس، اٹلی، جرمنی، روس ہی نہیں چھوٹے چھوٹے ممالک بھی اپنی قوم کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔ یہ ہوا ایشیا تک پہنچی اور جاپان کی جارحانہ قوم پرستی اس کا واضح ثبوت تھی۔ اس پرجوش قوم پرستانہ شعور کے نتیجے میں ہر ملک اپنی پالیسی کے علاوہ دوسرے فریق کو کسی بھی طرح جائز ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سوال ماننے کا نہیں بلکہ ہر قیمت پر اپنی بات منوانے کا تھا۔ ایک طرف وہ قومیں تھیں جو اپنی قومی سرحدیں بڑھانے کا سوچتی تھیں۔ دوسری طرف، ایسے ممالک تھے جو اپنی قوم کی سالمیت کی خاطر وہ علاقے واپس لینا چاہتے تھے جو اب بھی دوسرے ممالک کے قبضے میں تھے۔ شمال اور شمال مشرق میں بحیرہ ایڈریاٹک پر تسلط ہونے کے باوجود اٹلی اب بھی خود کو نامکمل (*Italia*

Irredenta) سمجھتا تھا۔ اس کا عدم اطمینان اکثر غصے اور جارحیت میں بدل جاتا تھا۔ جرمن قوم پرست، نپولینی جنگوں کی وجہ سے فرانس کے خلاف تھے اور فرانسیسی قوم پرست جرمنی کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے پرعزم تھے۔ وہ 1871 کی ذلت آمیز شکست کا بدلہ لینے اور الساس اور لورین کے صوبوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے جسے بسمارک نے چھین لیا تھا۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ جزیرہ نما بلقان کا تھا جہاں اب قوم پرستی کی افزائش عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ابھرتی ہوئی قوموں میں سے کوئی بھی وہاں مطمئن نہیں تھا۔ یونان کا ایک حصہ ابھی تک ترکی کے کنٹرول میں تھا۔ وہ تھریس اور ایجیئن جزائر واپس لے کر قدیم بازنطینی سلطنت کا وقار دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سربیا، کل سلاف (Pan-Slav) تحریک کے زیر اثر، بوسنیا اور ہرزیگووینا پر آسٹریا کے تسلط کے خاتمے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کے لیے پرعزم تھا۔ یہ تحریک آسٹریا کی سخت مخالف تھی اور تمام سلاو نسل کے لوگوں کو آزاد دیکھنا چاہتی تھی۔ اس تحریک کو روس کی بھی حمایت حاصل تھی۔ تھریس، مقدونیہ کے ایک حصے اور ایجین جزائر پر بلغاریہ کی بھی نظر تھی۔ رومانیہ، ٹرانسلوینیا اور بیسارابیا کے علاقوں میں رہنے والے رومانوی لوگوں کی وجہ سے انہیں اپنا سمجھتا تھا۔ اس طرح بلقان میں ہر کوئی غیر مطمئن تھا اور اب سلطنت عثمانیہ کے خلاف ان کا پرانا علاقہ نئے حریفوں آسٹریا اور روس کے خلاف ہو رہا تھا۔ خاص طور پر بوسنیا اور ہرزیگووینا پر آسٹریا کا زبردستی قبضہ، سربیا اور آسٹریا کے تعلقات کو دھماکہ خیز بنا رہا تھا۔ اس طرح قومی حدود اور حقوق کی غیر واضح تعریف کی وجہ سے یورپ میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔

بین الاقوامی تعلقات میں ایک قسم کی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ یورپ کے تمام 25 آزاد ممالک خود کو عالمگیر سمجھتے تھے اور عالمگیریت کا مطلب تھا کچھ بھی کرنے کی آزادی۔ جاہل لوگ ذاتی سطح پر آزادی کا مفہوم اسی معنی میں سمجھتے ہیں۔ انہیں اپنی قومی عزت اور سلامتی کے خلاف کسی بھی قسم کا بین الاقوامی اصول قبول نہیں تھا۔ یہ واضح تھا کہ کوئی بھی اپنے اقتدار کے علاوہ کسی اور کا اختیار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ بڑھتے ہوئے قوم پرست رجحان کی یہ شکل خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اخبارات، یورپی اقوام میں انتہا پسندی کے جذبات پھیلانے میں بڑا کردار ادا کر رہے تھے۔ اخبارات نے واقعات کو پیش کرنے کا انوکھا انداز اپنایا جس سے عوام میں اشتعال پیدا ہوتا تھا اور کسی بھی مسئلے کو پرامن طریقے سے حل کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ادب اور تاریخ کے ذریعے بھی ایسے شکوک و شبہات، جارحیت، اپنے آپ کو صحیح اور دوسروں کو غلط سمجھنے کے رجحان پر قابو پانے یا ختم کرنے کے بجائے بڑھاوا دیا جا رہا تھا۔ تعلیم ایک ایسی نسل کو جنم دے رہی تھی جو اپنے ماضی سے متاثر تھی اور اپنی قوم کی آرزو سے جڑی تھی۔ قومی مفاد ہی صحیح اور غلط کے تعین کا پیمانہ بن چکا تھا۔ ادب میں قوم کے قصیدے پڑھائے جا رہے تھے۔ تاریخ کو اپنے ملک کو صحیح اور دوسروں کو غلط ثابت کرنے کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا تھا۔ نہ صرف قومی بلکہ نسلی برتری ثابت کرنے کے لیے بعض ذاتوں (یہودیوں) کے خلاف ماحول بنایا جا رہا تھا۔ اخبارات پروپیگنڈے کا ذریعہ بن چکے تھے۔ مجموعی طور پر قوم پرستی کے بخار میں مبتلا لوگ، قوم اور حکومت کو مترادف سمجھنے لگے تھے اور اپنی حکومت پر تنقید یا اس کی پالیسیوں کی مخالفت کو ملک دشمن تصور کرنے لگے تھے۔ ایسی صورتحال میں صحت مندانہ غور و خوض ممکن نہیں تھا۔ اس طرح جنگ شروع ہونے سے پہلے یورپ کا سیاسی ماحول بہت پراگندہ تھا۔ ایسے میں عالمی جنگ کا پھوٹ پڑنا کوئی حیران کن واقعہ نہیں تھا۔

3.2.6 جنگ کی فوری وجہ (Immediate Cause of the War)

دریں اثنا، بوسنیا اور ہرزی گونیا کے صوبوں کو لے کر آسٹریا اور سربیا میں شدید تنازع شروع ہو گیا۔ بوسنیا اور ہرزیگوینا پر آسٹریا کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ جب بسمارک کی سفارت کاری نے انہیں آسٹریا کے حوالے کر دیا، تو سربیا، جو انہیں اپنا سمجھتا تھا، کو خاص طور پر بہت رنج پہنچا۔ جب آسٹریا نے ان ممالک کو 1908 میں مکمل طور پر اپنی سلطنت میں ضم کر لیا تو سربیا میں احتجاج شدید تر ہوتا چلا گیا۔ دونوں صوبوں کے باشندوں کا تعلق سرب برادری سے تھا اور سربیا انہیں آسٹریا کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ اس منصوبے میں روس کی پوری طاقت سربیا کے حق میں تھی اور زار نکولس نے واضح طور پر کہا تھا کہ وہ سربیا کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ دوسری طرف آسٹریا، بلغاریہ جیسے ممالک کو سربیا کے متوازی کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ بلقان لیگ کی تحلیل نے روسی سفارت کاری کو ایک دھچکا پہنچایا اور آسٹریا کی حوصلہ افزائی کی۔ اسی طرح ترکی کے سلطان کے اصلاحی پروگراموں نے اس کی سیاست کو یورپ میں کشیدگی کا مرکز بنا دیا تھا۔ اس نے ایک انگریز کو اپنے ملک کے مالی مسائل کے حل کے لیے مدعو کیا تھا۔ ایک فرانسیسی، ترک پولیس کو دوبارہ منظم کر رہا تھا۔ ایک انگریز بحریہ کا انچارج تھا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان نے ترک فوج کی تنظیم نو کی ذمہ داری ایک جرمن کو سونپ دی۔ روس میں کھلبلی مچ گئی۔ روس کا وزیر خارجہ سازونوف تو اسی معاملے پر جنگ کے لیے تیار تھا لیکن جب برطانیہ اور فرانس کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی نہ ہوئی تو روس تنہا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بلقان ہر لحاظ سے ایک آتش فشاں بن چکا تھا۔

1914 میں یورپ کی صورت حال ایسی تھی کہ کھلے عام صرف جنگ کی تیاری ہی نہیں ہو رہی تھی، بلکہ جنگ کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ روس میں جرمنی اور اس کی سلطنت کی تباہی کی باتیں دہرائی جانے لگیں۔ فرانس میں کہا گیا کہ روس تیار ہے، فرانس کو بھی تیار رہنا چاہیے۔ جرمن شہنشاہ نے ان باتوں سے فائدہ اٹھایا اور اپنے ہم وطنوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: 'جس کسی کو بھی اب بھی روس اور فرانس کی جارحیت پر یقین نہ ہو، اسے پاگل خانے بھیج دینا چاہیے۔' برلن کی حالت دیکھ کر کرنل ہاؤس نے لکھا کہ 'ایک چنگاری دھماکے کے لیے کافی ہو گی۔' پیرس کی حالت دیکھ کر جرمن سفیر نے لکھا: 'امن ایک حادثے کے رحم و کرم پر ہے۔'

بالآخر وہ چنگاری بھی بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ ایک حادثہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ آسٹریا کے شہزادہ فرانسس فرڈیننڈ نے سراجیو جانے کا فیصلہ کیا۔ پورے بوسنیا میں 'عظیم تر سربیا' کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور 'نیشنل ڈیفنس' اور 'یونین آر ڈیتھ' جیسی خفیہ تنظیمیں بہت سرگرم تھیں۔ وہاں آسٹریا مخالف موقف شدت اختیار کر رہا تھا۔ بوسنیا اور ہرزیگوینا میں آسٹریائی حکمرانی کے خلاف دہشت گردانہ تحریکوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہاں حالات بہت کشیدہ تھے اور آسٹریا کے کسی بھی اہلکار کا دورہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پہلے بھی فرڈیننڈ کو قتل کرنے کی تیاریاں کی گئی تھیں لیکن اب وہ خود شیر کے منہ میں آ رہا تھا۔ تین آدمیوں کو پوری طرح سے تیار کر کے سراجیو بھیج دیا گیا۔ 28 جون 1914 کو شہزادہ ٹاؤن ہال میں اپنی استقبالیہ تقریب کے لیے جا رہا تھا، کہ تبھی اس پر بم پھینکا گیا جس میں وہ بچ گیا لیکن واپس آتے ہوئے سرب دہشت گرد گروہ بلیک ہینڈ کے ایک رکن نے اس کی گاڑی پر چھلانگ لگا دی اور اس کے حملے سے شہزادہ اپنی بیوی سمیت ہلاک ہو گیا۔

غضبناک آسٹریا نے اسے سربیا کو سبق سکھانے کا بہترین موقع سمجھا۔ جب اس نے جرمنی سے مشورہ مانگا تو اس نے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کیا۔ دونوں جانتے تھے کہ روس، سربیا کی طرف سے مداخلت کر سکتا ہے، پھر بھی سربیا کو الٹی میٹم دیا گیا: 'سربیا نے معاندانہ رویہ اپنا رکھا ہے اور اسے اپنی پالیسی واضح کرنے کے لیے آسٹریا مخالف پالیسی کی مذمت کرنی چاہیے، آسٹریا کے خلاف سرگرم تنظیموں کو ختم کرنا چاہیے، نصاب سے آسٹریا مخالف اسباق کو ہٹا دینا چاہیے اور آسٹریا کی مدد سے سخت کاروائی کرتے ہوئے سازش کرنے والوں کو گرفتار کروانا چاہیے اور ان دو افسران کو فوری طور پر گرفتار کیا جائے جن کا نام الٹی میٹم میں ذکر کیا گیا ہے۔' اس کا جواب 48 گھنٹے میں طلب کیا گیا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ اتحادیوں نے وقت میں توسیع کی درخواست کی لیکن آسٹریا راضی نہیں ہوا۔ آخرکار، وقت رہتے، سربیا نے سب کچھ مان لیا، سوائے اس کے کہ آسٹریائی افسران کو سربیا میں سازشیوں کو کچلنے میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔ کوئی بھی خودمختار ملک اسے قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پورا معاملہ ہیگ کی عدالت کے حوالے کرنے کی بھی تجویز دی۔ سربیا کا جواب اتنا مصالحانہ تھا کہ اس مسئلے پر جنگ کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ آسٹریا نے اتفاق نہیں کیا اور سربیا سے تعلقات توڑ دیے اور سربیا کی سرحدوں پر فوجیں جمع کرنا شروع کر دیں۔ سربیا اس صورتحال کے لیے تیار تھا۔ آسٹریا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی جیسے فتح کا جشن منایا جا رہا ہو۔ روس بھی سمجھ گیا کہ اب آسٹریا سے نمٹنے کا آخری موقع آ گیا ہے۔ برطانوی وزیر چاہتا تھا کہ وہ ممالک جن کا براہ راست تعلق بلقان سے نہیں ہے، یعنی انگلینڈ، فرانس، جرمنی اور اٹلی مل کر روس اور آسٹریا کے درمیان ثالثی صلح صفائی کرا دیں۔ روس میں جنگ کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اب فوجی معاہدوں نے گل کھلانا شروع کر دیا تھا۔

3.3 دوران جنگ کے واقعات (Events during the War)

آسٹریا نے سربیا کے دارالحکومت بلغراد پر حملہ کر دیا۔ روس نے سربیا کی مدد کی اور فرانس نے بھی روس کا ساتھ دیا۔ مورخ سڈنی براڈشا فے (Sidney Bradshaw Fay) نے روس کی طرف سے فوج کے متحرک کرنے کو جنگ کی اہم فوری وجہ قرار دیا ہے۔ اب جرمنی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور رفتہ رفتہ پورا یورپ جنگ میں الجھتا چلا گیا۔ برطانیہ نے بیلجیئم کی غیر جانبداری کی ضمانت مانگی۔ فرانس نے یہ ضمانت دی، لیکن جب جرمنی نے بیلجیم پر حملہ کیا تو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس طرح تقریباً پورا یورپ بالواسطہ یا بلاواسطہ جنگ میں شامل ہو گیا۔ نوآبادیوں کو بھی اس میں شامل ہونا پڑا۔

جرمنی کو مشرق اور مغرب دونوں محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ جرمنی نے فوری طور پر فرانس پر قبضہ کرنے کے بعد تمام طاقت کو روس کے خلاف لگانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن فرانس میں داخل ہونے کے بعد اسے سخت مقابلے کا سامنا کرنا پڑا۔ برطانیہ پوری قوت کے ساتھ فرانس کے ساتھ تھا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود جرمن فوج پیرس تک نہ پہنچ سکی۔ مغرب میں اب آمنے سامنے کی شدید لڑائی شروع ہو گئی۔ جرمنی نے مشرق میں روس کو بری طرح شکست دی لیکن روسی فوج آسٹریا کے خلاف کامیاب ہو رہی تھی۔ اگر جرمن مدد نہ پہنچتی تو حالات اس نہج پر پہنچ جاتے کہ آسٹریا کو جنگ سے دستبردار ہونا پڑتا۔ اسی دوران ترکی، جرمنی کی طرف سے جنگ میں داخل ہوا اور روس کو بحیرہ اسود کے راستے اپنے اتحادیوں سے مدد ملنا بند ہو گئی۔ ترکی کو دوسری طرف عراق اور فلسطین میں عربوں کی غداری کی وجہ سے شکست کا سامنا کرنا

پڑا۔ 1915 میں ایک طرف بلغاریہ نے جرمن گروپ کی حمایت کی تو دوسری طرف اسی گروہ کے رکن اٹلی نے اپنے اتحادیوں سے غداری کرکے اپنی قومی امنگوں کی تکمیل کے لیے اتحادیوں کی جانب سے اعلان جنگ کردیا۔ اگر بروقت مدد نہ پہنچتی تو آسٹریا کی افواج اٹلی پر قبضہ کر لیتیں۔ اسی طرح اگر اتحادی افواج بلقان تک نہ پہنچتی تو یونان جرمنی کی طرف سے جنگ میں شامل ہو جاتا۔ ایک طرف پورا یورپ جل رہا تھا اور جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ دور دکھائی دے رہا تھا تو دوسری طرف بحری جنگ بھی شروع ہو چکی تھی۔ برطانیہ نے جرمنی کی ناکہ بندی کی۔ تمام تر لڑائیوں کے باوجود جرمنی اس ناکہ بندی کو نہ توڑ سکا۔ اسی دوران جرمنی نے آبدوزیں یا پنڈبیاں (Submarines) ایجاد کرلی تھیں۔ اس نے اس نئے آلات کا استعمال کرتے ہوئے برطانیہ کی ناکہ بندی شروع کردی۔ برطانیہ کی تجارت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ بڑی تعداد میں تجارتی جہاز ڈبویے جانے لگے۔ جنگ کے نشے میں دھت جرمنی نے اندھا دھند بحری جنگ شروع کردی۔ آبدوزوں کے خلاف ہتھیار ابھی دریافت ہو ہی رہے تھے کہ جرمنی نے غیر جانبدار ممالک کے جہازوں کو بھی ڈبونا شروع کردیا۔ اب تک امریکہ اتحادیوں سے ہمدردی رکھنے کے باوجود، باضابطہ طور پر غیر جانبدار تھا۔ لیکن جب امریکی جہاز بھی ڈبوئے جانے لگے تو اس نے جرمنی کو خبردار کیا۔ جرمنی کا کہنا تھا کہ امریکہ اپنے تجارتی جہازوں سے اتحادیوں کو مدد فراہم کررہا تھا۔ 1917 میں ایک امریکی مسافر بردار بحری جہاز لوسی ٹانیا (Lusitania) بحر اوقیانوس میں ڈبادیا گیا۔ ناراض امریکہ کے لیے جرمنی کے خلاف لڑائی میں شامل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔ امریکی فوجیں یورپ میں اتر گئیں۔ امریکی بحریہ نے اتحادیوں کے ساتھ فعال تعاون شروع کردیا۔ اب امریکی افواج اور معیشت اتحادیوں کی مدد کے لیے تیار تھی۔ اس سے جنگ کا نقشہ بدل گیا۔

روس میں 1917 میں ہی ایک تاریخی انقلاب برپا ہوا، جس کا ہم الگ سے مطالعہ کریں گے۔ انقلاب کے بعد روس بریسٹ لیتوسک کے معاہدے کی رو سے جنگ سے دستبردار ہو گیا۔ جرمنی نے ایک محاذ ختم ہو گیا اور وہ اپنی تمام افواج مغرب میں تعینات کرسکتا تھا۔ جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ شروع ہوا۔ دونوں فریقین آخری جنگ لڑنے لگے۔ ایک طرف امریکی مدد تھی اور دوسری طرف برطانوی نوآبادیات سے فوجی اور پیسہ اکٹھا کیا جارہا تھا۔ خاص طور پر ہندوستان کی شراکت بہت اہم کردار ادا کررہی تھی۔ شدید گولہ باری سے تباہی بڑھتی جارہی تھی۔ جنگ کے آخری دنوں میں ہوائی جہاز بھی استعمال ہونے لگے۔ یہ جنگ زمین، پانی اور ہوا تینوں میدانوں میں لڑی جارہی تھی۔ جنگ سے عام لوگ بری طرح متاثر ہوئے اور ہلاکتیں بڑھ رہی تھیں۔ جرمن عوام کی مشکلات کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انہیں جنگ اور ناکہ بندی دونوں کا سامنا تھا۔ بلغاریہ اور ترکی شکست تسلیم کرچکے تھے۔ آسٹریا اور جرمنی پر دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ اپنی تمام تر طاقت استعمال کرنے کے باوجود جرمنی مفتوحہ علاقوں کو ترک کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بالآخر جرمن سرحدوں پر بھی حملہ ہوا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جرمن سرزمین پر تباہ کن جنگ چھڑ جائے گی۔ قیصر ولیم ثانی کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ اس کی مخالفت بھی بڑھنے لگی۔ اس کے پاس بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے بھاگتے ہی جرمنی میں بادشاہت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور وائمر نامی ایک جمہوریہ قائم ہو گئی۔ 11 نومبر 1918 کو جنگ ختم ہوئی اور معاہدوں کے تفصیلی مذاکرات کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جنگ کے خاتمے کے بعد پوری دنیا میں جشن کا سماں تھا لیکن جنگ کے نتائج رفتہ رفتہ سامنے آئے۔

3.4 پہلی عالمی جنگ کی ذمہ داری (Responsibility for the First World War)

جیسے ہی اگست 1914 میں یورپی جنگ شروع ہوئی، تقریباً تمام متحارب ممالک میں جنگی ذمہ داری کے حوالے سے ایک شدید تنازعہ شروع ہو گیا۔ کوئی بھی فریق جنگ کی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سب کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے قیامِ امن کے لیے زیادہ سے زیادہ کوششیں کی ہیں لیکن مخالف قوموں کی پالیسیوں کی وجہ سے جنگ چھڑ گئی۔ اپنے فریق کو جنگی جرائم سے پاک رکھنے اور تمام تر ذمہ داری دشمن ملک پر ڈالنے کے لیے مختلف متحارب ممالک کی حکومتوں نے خفیہ سفارتی دستاویزات کو اس طرح سجا کر شائع کرنا شروع کر دیا کہ عالمی رائے عامہ کے سامنے ان کے اپنی غلطیوں پر پردہ پڑ جائے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جنگ کی ذمہ داری کا تعین ایک بار پھر موضوع بحث بن گیا۔ معاہدہ ورسائی کی دفعہ 231 میں جنگ کی تمام تر ذمہ داری مرکزی طاقتوں پر ڈال دی گئی۔ کہا گیا کہ جنگ چھڑنے کی تمام تر ذمہ داری جرمنی اور اس کے اتحادیوں پر عائد ہوتی ہے۔ معاہدہ ورسائی کے اس یکطرفہ فیصلے کے بعد بھی یہ سوال زیر بحث رہا کہ کیا جرمنی تنہا اس جنگ کا ذمہ دار تھا؟ کیا اس نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر دوسرے ممالک پر جنگ مسلط کی؟ کیا جرمن گروپ کی مخالف قومیں مکمل طور پر بے قصور تھیں یا ان کی بھی کچھ ذمہ داری تھی؟ اس بحث کے تناظر میں جرمنی نے کچھ ریاستی دستاویزات شائع کیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عالمی جنگ شروع ہونے سے پہلے کے نازک دنوں میں جرمنی نے جنگ کو ہونے سے روکنے کی حقیقی کوششیں کی تھیں۔ اس سے یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ جرمنی نے جان بوجھ کر جنگ بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح دیگر ممالک کی حکومتوں نے بھی اپنی سرکاری دستاویزات شائع کیں۔ نئے دستاویزی ثبوتوں اور عظیم غیر جانبدارانہ تاریخی تحریروں کے منظر عام پر آنے کے بعد، اب کوئی بھی غیر جانبدار شخص 1919 کے فاتحین کے اس دعوے کو قبول نہیں کرے گا کہ جرمنی اور اس کے اتحادی جنگ کے شروع ہونے کے لیے مکمل طور پر ذمہ دار تھے۔ اس مواد کا مطالعہ کرنے کے بعد صرف یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہر چھوٹے یا بڑے ملک کی جنگ کی کوئی نہ کوئی ذمہ داری تھی اور اس کے لیے صرف جرمنی کو مورد الزام ٹھہرانا سراسر ناانصافی ہے۔

سربیا کی ذمہ داری: سب سے پہلے، جنگ شروع ہونے کے لیے سربیا کی حکومت کی ذمہ داری کو دیکھا جانا چاہیے۔ قوم پرستی کے جذبے سے متاثر ہو کر سربیا تمام بکھرے ہوئے لوگوں کو ایک ریاست میں متحد کرنا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے اس کا آسٹریا کے ساتھ تنازعہ ناگزیر تھا۔ اس صورتحال میں اسے روس کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ سراجیو (Sarajevo) میں ہونے والا قتل اسی ہمہ گیر قوم پرستی کا نتیجہ تھا۔ سربیا کی حکومت کے کئی اہم اہلکار اس سازش سے پوری طرح باخبر تھے۔ وہ ان آدمیوں کو بھی جانتے تھے جو آسٹریا کے ولی عہد کو قتل کرنے کے لیے سراجیو جا رہے تھے۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے سازش کرنے والوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ آسٹریا کو کوئی انتباہ یا اطلاع نہیں دی گئی۔ ایک بار پھر، سربیا کی حکومت نے ولی عہد کے قاتلوں یا ان کے ساتھی سازشیوں کو گرفتار کرنے اور انہیں مقدمے کے کٹہرے میں لانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ ان میں سے ایک کو فرار ہونے میں بھی مدد ملی۔ قتل کے بعد جب آسٹریا نے ملزمان کی تلاش میں آسٹریائی حکام کا تعاون لینے کا مطالبہ کیا تو سربیا کی حکومت نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ ایسا رویہ اختیار کرتے ہوئے سربیا نے جنگ شروع ہونے کی فوری وجہ پیش کی اور اسی بنیاد پر وہ جنگ کا ذمہ دار بنتا ہے۔

آسٹریا کی ذمہ داری: ایل سی ایف ٹرنر(L.C.F. Turner)یہ دلیل دیتے ہیں کہ جنگ 'ایک غلط اندازے کے خمیازے' کے طور پر ہوا۔آسٹریا نے غلط اندازہ لگایا کہ روس، سربیا کا ساتھ نہیں دیگا۔ جرمنی نے بنا شرط آسٹریا کو مدد دے کر غلط اندازہ لگایا؛ جرمنی اور روس کے سیاست دانوں نے یہ غلط سوچا کہ کہ ایک جٹ ہونے سے جنگ نہیں ہوگی۔اس طرح آسٹریا کی ذمہ داری پر غور کرتے ہوئے سربیا کے خلاف اس کی جارحانہ پالیسی، سربیا کی آسٹریا مخالف پالیسی اور آسٹریا کی اس سے ناراضگی اور آسٹریا کی اندرونی کمزوری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس کے وجود کو عظیم تر سربیا کے منصوبے اور پان سلاو کی تحریکوں سے خطرہ لاحق تھا۔ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ کوئی بھی قوم اپنے پڑوسیوں کے ہاتھوں اپنے ٹوٹنے کا انتظار کرتی رہے گی۔ جس انداز میں آسٹریا کے مستقبل کے شہنشاہ کو انتہا پسندوں نے قتل کیا،اس کے پیش نظر سربیا کو سزا دینا ضروری تھا۔اگر ایسا نہ کیا جاتا تو آسٹریا کا وقار مکمل طور پر تباہ ہو جاتا۔ لہذا، ورسٹولڈ نے سربیا کو کچلنے کا فیصلہ کیا اور ایک ایسا الٹی میٹم تیار کیا جسے سربیا کو بہر حال مسترد کرنا پڑا۔اس امکان سے بچنے کے لیے کہ کوئی ثالث مداخلت نہ کر سکے،آسٹریا نے فوری طور پر جنگ کا اعلان کر دیا۔انہوں نے امید ظاہر کی کہ جرمنی روس کو روک دے گا اور جنگ مقامی رہے گی۔ لیکن،اس کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔اس نے سربیا پر حملہ کر کے روس کو اکسایا اور اس سلسلے میں آسٹریا کو جنگ شروع کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

روس کی ذمہ داری: آسٹریا اور سربیا کے تنازعے کے لیے کسی حد تک روس براہ راست ذمہ دار تھا۔اس نے ہمیشہ آسٹریا کے خلاف سربیا کی حوصلہ افزائی کی۔ سربیا نے آسٹریا کے ساتھ جنگ کی صورت میں روس کے تعاون کی بھی امید ظاہر کی۔ روس عظیم طاقتوں میں پہلا ملک تھا جس نے اپنی فوج کو متحرک کیا۔ایک طرف وہ سیاسی مذاکرات کر رہا تھا اور دوسری طرف خفیہ طور پر فوجی تیاریاں بھی کر رہا تھا۔ یہ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری تھی۔اس نے جرمنی اور آسٹریا دونوں کو خوفزدہ کر دیا۔اسی وقت جب جرمنی،آسٹریا پر مسئلے کے پرامن حل کے لیے دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا،اسی وقت روس نے افواج کو سرحدوں پر پہنچنے کا حکم دیا۔ روس کا یہ اعلان جرمنی کی فوجی نقل و حرکت اور اعلان جنگ کی وجہ بن گیا۔ روسی حکام بخوبی جانتے تھے کہ اگر روس نے اپنی فوج کو متحرک کیا تو جرمنی کو نہ صرف روس کے اسٹریٹیجک منصوبوں پر بلکہ فرانس کے منصوبوں پر بھی توجہ دینی پڑے گی۔اس طرح روس کی جلد بازی نے مسئلہ کو سفارتی دائرے سے فوجی میدان میں منتقل کر دیا۔اگر روس ایسی کارروائی نہ کرتا تو شاید جنگ کے بغیر ہی مسئلہ حل ہو جاتا۔

جرمنی کی ذمہ داری: کچھ مورخین، جن میں ایک جرمن مورخ فرٹز فشر بھی شامل ہیں، یہ مانتے ہیں کہ 'جرمنی نے دنیا میں سب سے اعلیٰ ترین بننے کے ارادے سے جان بوجھ کر انگلینڈ، فرانس اور روس کے ساتھ جنگ کی۔' کچھ دوسروں کا ماننا ہے کہ جرمنی جنگ کا خواہشمند نہیں تھا۔ آسٹریا اس کی دوست ریاست تھی، جس پر وہ مکمل اعتماد کر سکتا تھا۔ نتیجے کے طور پر وہ آسٹریا چھوڑ نہیں سکتا تھا اگر وہ ایسا کرتا تو اس کے لیے بڑی مشکل پیدا ہو جاتی۔ یہ ایک طرف سے روس اور دوسری طرف فرانس سے گھرا ہوا تھا۔ سب سے افسوس ناک بات یہ تھی کہ سہ فریقی معاہدے کے رکن ممالک نے اس پر بالکل اعتماد نہیں کیا۔ روس، فرانس اور برطانیہ میں ایک عام خیال تھا کہ آسٹریا ہر کام جرمنی سے پوچھ کر اور اس کے تمام مشورے لے کر کرتا ہے۔ لیکن، ایسا نہیں تھا۔ جب جرمن چانسلر بیتھ مین ہالویگ (Bethmann Hollweg)نے سمجھ لیا کہ روس سربیا کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے، برطانیہ غیر جانبدار نہیں رہ سکتا اور یورپی جنگ کا امکان ہے۔ جولائی کے طوفانی دنوں میں

بیتھ مین نے آسٹریا کو روکنے اور جنگ کو ٹالنے کی دیانتداری سے کوشش کی لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔اس صورت حال میں جرمنی اپنی جغرافیائی پوزیشن کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔جب جنگ چھڑ گئی تو اس کے لیے جلدی سے کاروائی کرنا ضروری ہو گیا تھا۔پہلے تو اسے فرانسیسی فوج کو مکمل شکست دینی تھی اور پھر روس کی خبر لینی تھی۔اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیلجیم کے راستے اپنی فوج فرانس بھیجے۔روس کے متحرک ہونے کے تناظر میں خاموش رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔عام طور پر تمام ممالک کے فوجی افسران ،فوجی نقل و حرکت ہونے کا مطلب اعلان جنگ سمجھتے تھے۔اس صورت حال میں روس کے متحرک ہونے کی خبر ملتے ہی جرمنی نے بھی روس اور فرانس کو الٹی میٹم دے دیا۔فرانس سے اپنا رویہ واضح کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور روس کو متنبہ کیا گیا کہ اگر اس نے اپنی فوج کی نقل و حرکت منسوخ نہ کی تو جرمنی کو بھی عام فوجی نقل و حرکت کا حکم دینے پر مجبور کیا جائے گا۔جب دونوں کی طرف سے جوابات تسلی بخش نہ ہوئے تو جرمنی نے اعلان جنگ کر دیا۔یوں جرمنی آسٹریا سے دوستی اور اپنی حماقت کا شکار ہو گیا۔

فرانس کی ذمہ داری: فرانس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس نے روس کی مکمل حمایت کی اور کسی بھی وقت تحمل سے کام لینے کا مشورہ نہیں دیا۔روس کے اپنے دورے کے دوران، فرانسیسی صدر ریمنڈ پوئنکارے (Raymond Poincaré) نے زار کو یقین دلایا تھا کہ ایک اتحادی کے طور پر فرانس، آسٹریا کو سربیا کو کچلنے سے روکنے کے لیے ہر قیمت پر روس کا ساتھ دے گا۔اس نے روس کو سخت موقف اختیار کرنے کی ترغیب دی۔اس نے روس کو فوجی کارروائی شروع کرنے سے نہیں روکا، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر روس ایسا کرتا ہے تو جرمنی خاموش نہیں بیٹھے گا۔

برطانیہ کی ذمہ داری: برطانوی خارجہ سیکریٹری، سر ایڈورڈ گرے (Edward Grey) نے قیام امن کے لیے بہت سے کام کیے لیکن وہ سب ناکام رہے۔اس کے لیے جرمنی کا رویہ جزوی طور پر ذمہ دار تھا۔اس کے باوجود برطانیہ کو الزام سے بری نہیں کیا جا سکتا۔سر ایڈورڈ گرے کے لیے درج ذیل دو چیزوں میں سے ایک کام کرنا ضروری تھا۔بحران کے ابتدائی دنوں میں ،اسے جرمنی کو واضح انتباہ دینا چاہیے تھا کہ اگر یورپی جنگ چھڑ گئی تو برطانیہ اپنے اتحادیوں (فرانس اور روس) کا ساتھ دے گا۔اگر ایسا ہوتا تو جرمنی آسٹریا پر مکمل دباؤ ڈالتا اور روس اور آسٹریا کے درمیان مذاکرات کامیاب ہوتے۔یا فرانس اور روس کو واضح وارننگ دی جا سکتی تھی کہ اگر وہ جنگ میں شامل ہوئے تو وہ غیر جانبدار رہے گا۔اس صورتحال میں روس نے متحرک ہونے کے فیصلے کے بارے میں سو بار سوچا ہو گا۔لیکن، سر ایڈورڈ گرے نے ایسا کچھ نہیں کیا۔یہ درست ہے کہ کچھ سیاسی اور قانونی رکاوٹیں تھیں۔انہیں اپنی کابینہ کی مکمل حمایت حاصل نہیں تھی۔برطانوی رائے عامہ بھی بہت غیر یقینی تھی۔اس کا یہ تاثر بھی تھا کہ جرمنی اپنے اتحادی آسٹریا کے غلط کاموں کی حمایت کر رہا ہے اور برلن کی صورت حال شہری حکام نہیں بلکہ پرشین عسکریت پسندوں کے کنٹرول میں ہے۔اس تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ جنگ کی ذمہ داری کسی ایک ملک پر عائد کرنا مناسب نہیں۔پہلی عالمی جنگ کے ذمہ دار تقریباً تمام ممالک تھے۔اس کے لیے اکیلے جرمنی کو ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہے۔

3.5 پہلی عالمی جنگ کے اثرات (Impact of the First World War)

3.5.1 جمہوریت اور قوم پرستی کا عروج (The Rise of Democracy and Nationalism)

نتائج کے لحاظ سے پہلی عالمی جنگ عالمی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس نے بیک وقت کئی سلطنتوں اور خاندانوں کو تباہ کیا۔ آسٹریا ہنگری سلطنت بکھر گئی اور ہیپسبرگ خاندان کا خاتمہ ہوا۔ 1917 میں ہی، روسی انقلاب نے رومانوف خاندان کا خاتمہ کیا، وہاں ایک جمہوریہ قائم کیا اور مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرایا۔ جرمنی اور ترکی کا بھی یہی حشر ہوا۔ پوری دنیا میں بادشاہتوں کے خلاف ماحول پیدا ہو گیا کیونکہ جرمن بلاک میں صرف بادشاہتوں کا بول بالہ تھا اور اتحادی ممالک میں جمہوریہ کی برتری تھی۔ جنگ کے بعد سیاسی میدان میں یورپ کو غیر یورپی نوآبادیوں کی طرف سے سخت چنوتیوں ملنی شروع ہویں اور یورپی حکمرانوں اور نوآبادیاتی غلام عوام کے درمیان تعلقات میں ایک نئی تبدیلی جھلکنے لگی۔ جنگ کے دوران دوست اور اتحادی ممالک نے بڑے اور پرکشش نعرے لگائے تھے۔ جمہوریت کے لیے دنیا کو محفوظ بنانے کی باتیں ہوئیں اور خودارادیت کا اصول پیش کیا گیا۔ اس سے محکوم لوگوں کے ذہنوں میں ایک نئی امید پیدا ہوئی اور وہ امید کرنے لگے کہ جنگ کے بعد انہیں بھی خود مختاری کا حق مل جائے گا۔ لیکن مغربی جمہوریتوں کا کھوکھلا پن اس وقت عیاں ہو گیا جب انہوں نے اپنی نوآبادیوں کو آزاد نہیں کیا اور ان کی استحصالی فطرت قائم رہی۔ جنگ ختم ہوتے ہی سامراجی ریاستوں کا نوآبادیوں کے ساتھ وہی پرانا رویہ شروع ہو گیا۔ نتیجتاً نوآبادیوں میں شدید مایوسی کی فضاء چھاگئی۔ جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران دونوں گروہوں نے قوم پرستی کے اصول کا استعمال کیا، لیکن جنگ کے اسی اصول کو سامراجی ممالک نے یورپ سے باہر نافذ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مثال کے طور پر، ہندوستان کے پر امید تعاون کے باوجود رولٹ ایکٹ منظور ہوا، جلیانوالہ باغ کا ہولناک قتل عام ہوا اور 1919 کے 'گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ' میں متوقعہ سیاسی تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ اس طرح مغربی ممالک کا جمہوریت کا مکھوٹا اتر گیا۔

لہٰذا اب نوآبادیات میں سامراجی حکمرانی کی شدید مخالفت شروع ہو گئی۔ فعال قوم پرستی بیدار ہوئی اور یورپی ممالک کو اپنی نوآبادیوں میں مضبوط قومی تحریکوں کا سامنا کرنا پڑا اور محکوم عوام عالمی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے لگے اور پورے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں قوم پرست قوتوں کی تحریک تیزی سے ترقی کرنے لگی۔ نوآبادیت بنام قوم پرستی کی جنگ میں قوم پرستوں کو بالشویک روس سے مدد ملنا شروع ہو گئی۔ انقلاب سے پہلے روس خود ایک سامراجی ملک تھا لیکن انقلاب کے بعد اس نے محکوم نسلوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ روس میں کومنٹرن کا قیام عمل میں آیا اور اس انقلابی تنظیم نے نوآبادیاتی عوام کو سامراج کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ دنیا پر یورپی تسلط کے خلاف تمام تحریکوں کو روس کی حمایت کی وجہ سے دنیا پر یورپی تسلط کے دور کا خاتمہ نظر آنے لگا۔ اس طرح پہلی 'عالمی جنگ' اپنے نتائج کے ساتھ ایک عہد ساز واقعہ ثابت ہوئی، کیونکہ اس نے دنیا کے نقشے پر یورپی تسلط کے خاتمے کا آغاز کیا۔

3.5.2 یورپ مرکزیت کی جگہ بین الاقوامیت (Internationalism in Place of Eurocentrism)

تاہم پہلی عالمی جنگ کا ایک زیادہ اہم اور دوررس نتیجہ عالمی سیاست میں یورپی غلبے کے خاتمے کے دور کا آغاز تھا۔ اب تک پوری دنیا

میں یورپ کی طوطی بولتی تھی۔ یورپی ممالک، پوری دنیا کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچارہے تھے اور کسی میں ان کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ پہلی عالمی جنگ نے وہ عمل شروع کیا جس کی وجہ سے یورپی غلبہ کے اس دور کا خاتمہ ہوا۔ جنگ کے دوران بین الاقوامی تعاون کی اہمیت واضح ہو گئی۔ تاریخ نے سبق دیا کہ 'مقدس اتحاد(Holy Alliance)اور یورپی نظام(European System)جیسا اشتراک کام نہیں کرتا۔ اسی لیے بڑے پیمانے پر شراکت کا آغاز ہوا۔ جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد یورپ کے زوال کی تمام علامات ایک ساتھ نظر آنے لگیں۔ عالمی جنگ کے بعد پیرس میں امن کانفرنس کا آغاز ہوا۔ اس کانفرنس میں نہ صرف یورپ کی اقوام بلکہ ایشیا، افریقہ اور امریکہ کی اقوام نے شرکت کی اور کانفرنس میں کیے گئے فیصلوں میں ان کا بڑا کردار تھا۔ پچیس تیس سال پہلے ایسے واقعے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جنگ کے بعد کے دور میں دنیا کا عظیم ترین شخص کوئی یورپی سیاست دان نہیں تھا بلکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر روڈرو ولسن تھا، جس کی خوشامد میں فاتح اور مفتوح دونوں فریق لگے ہوئے تھے۔ پیرس امن کانفرنس میں غیر یورپی براعظموں کے سیاست دانوں نے جو کردار ادا کیا اس سے ثابت ہوا کہ وہ وقت گزر چکا ہے جب یورپی رہنما پوری دنیا کے معاملات آپس میں طے کرتے تھے۔ امریکی صدر ولسن کی تحریک اور اقدام سے مجلس اقوام(League of Nations)کا قیام عمل میں آیا۔ اگرچہ مجلس اقوام نے زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی لیکن ایسی تنظیم کی لازمی ضرورت واضح ہو گئی۔ چھوٹی سطح پر باہمی تعاون کو اہمیت دی جانے لگی اور خفیہ معاہدوں کی پالیسی کے مہلک نتائج کی وجہ سے 'کھلی سفارت کاری' شروع ہو گئی۔ لیگ آف نیشنز کا قیام دنیا کے یورپی اور غیر یورپی حصوں کے درمیان بدلتے تعلقات کی سب سے نمایاں علامت تھی۔ یہ 1815 کے یورپی اجلاس سے مختلف تھا، کیونکہ اس کے رکن ممالک میں نہ صرف یورپ کے ممالک، بلکہ دنیا بھر کے ممالک بھی شامل تھے۔ جنگ سے پہلے یورپی طاقتوں کے فیصلوں کو غیر یورپی دنیا نے کبھی چیلنج نہیں کیا تھا، لیکن اب لیگ آف نیشنز کے قیام سے ان کی پالیسی اور طرز عمل کو بھی منظم اور کنٹرول کیا جاسکتا تھا اور وہ چھوٹی طاقتوں کو جواب دینے پر مجبور کیے جاسکتے تھے۔ بدلی ہوئی معاشی صورتحال نے مؤثر طریقے سے یورپ کو اپنے زوال کا احساس دلایا۔ یہ جنگ بہت مہنگی اور خرچیلی تھی۔ ٹیکس کے ذریعے بے تحاشا اخراجات پورے نہیں کیے جا سکے۔ اس لیے تمام حکومتوں کو قرضہ لینا پڑتا تھا اور یہ قرض اسے صرف امریکہ سے ہی مل سکتا تھا جس کی وجہ سے یورپ کی معاشی حالت میں امریکہ کے مقابلے میں واضح گراوٹ دیکھنے میں آئی۔ یورپی طاقتیں قرض دینے کی طاقتوں کے بجائے قرض لینے کی طاقتوں کے زمرے میں آ گئیں۔ امریکہ سے قرض لے کر یورپی اقوام نے اپنا مستقبل گروی رکھ لیا۔ برسوں تک وہ اپنی برآمد سے زیادہ درآمد کرنے پر مجبور تھے۔

دنیا کے ان ممالک کو بھی عالمی سیاست میں اہمیت ملنے لگی جن کا اس سے پہلے ذکر تک نہیں ہوتا تھا۔ بین الاقوامی سیاست اب یورپی ممالک کے خارجہ تعلقات تک محدود نہیں رہی۔ ان کے علاوہ دو اور اہم سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ امریکہ کی اصل قوت ظاہر ہوئی اور اسے دنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھا جانے لگا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد خواہی نخواہی، اس کا عالمی کردار جاری رہا۔ مورخ ہارڈی(Hardy)کے مطابق یورپی نظام کی جگہ ایک عالمی نظام ناگزیر ہو گیا اور اس نظام میں کچھ ممالک پہلے کی طرح من مانی طریقے سے کام نہیں کر سکتے تھے۔ سب سے اہم تبدیلی روس میں جنگ کے دوران رونما ہونے والے انقلاب کے ذریعے ایک مکمل طور پر نئے معاشی، سیاسی، سماجی ڈھانچے کا قیام تھا۔ روسی اشتراکی نظام(Socialist System)نے پہلی بار معاشرے کو یکسر بدل کر استحصال پر مبنی معاشرے کا خاتمہ کیا۔ اب دنیا کے

پاس ایک انتخاب تھا۔ رفتہ رفتہ دنیا میں اشتراکی تحریکیں پروان چڑھنے لگی اور عالمی سیاست میں سرمایہ دار سامراجی طاقتوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ دنیا کے استحصال زدہ اور مظلوم ممالک کو امید کی ایک نئی کرن دکھائی دی۔ اب وہ نہ صرف نئے سرے سے حوصلہ مند ہوئے بلکہ مضبوط بھی ہونے لگے۔ پوری دنیا میں عوامی تحریکیں پھیل گئیں اور مغربی ممالک کی بھی استحصال شدہ عوام، اپنے حقوق کی جنگ کی تیاریاں کرنے لگی۔

3.5.3 جان ومال کی تباہی (Destruction of Life and Property)

اس جنگ میں مال و دولت کی بے پناہ تباہی ہوئی۔ چالیس سال سے کم عمر کے تقریباً ایک کروڑ افراد ہلاک اور دو کروڑ کے قریب زخمی ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ میں مرنے والے فوجیوں کی تعداد 1790 سے 1913 عیسوی تک دنیا کے مختلف حصوں میں ہونے والی تمام بڑی جنگوں میں مارے جانے والے فوجیوں کی دگنی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ آبادی کے اس بڑے نقصان کا اثر جنس (Sex) اور عمر (Age) پر بھی پڑا۔ جنگ میں مرنے والوں میں خواتین کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے جنگ کی وجہ سے مردوں اور عورتوں کے تناسب میں بہت فرق آگیا۔ انگلینڈ میں 1911 میں، ہر 1000 مردوں کے مقابلے میں 1067 خواتین تھیں۔ 1921 میں ہر 1000 مردوں کے لیے 1093 خواتین تھیں۔ یہ عدم توازن، جنگ کے بعد 'فاضل خواتین' کے مسئلے پر بحث کا باعث بنا۔ یورپ کی شرح پیدائش، جو کہ 1914 سے پہلے ہی گراوٹ کا شکار تھی، جنگ کے دوران تیزی سے گرگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے دوران خاندانی زندگی درہم برہم ہو گئی تھی۔ لیکن جنگ کے فوراً بعد آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس حقیقت کا اندازہ 1930 میں یورپی اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے اعداد وشمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ 1930 میں اسکولوں میں گیارہ سے پندرہ سال کے بچوں کی تعداد بہت کم تھی جبکہ پانچ سے دس سال کی عمر کے بچوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ عمری ابھار (Age Bulge) کے اس مسئلہ کا اثر 1960ء تک نظر آتا رہا۔ املاک کی تباہی کے حوالے سے بھی یہ جنگ بے مثال تھی۔ جنگ میں شامل تمام فریقوں کو تقریباً 18 کروڑ 60 لاکھ ڈالر خرچ کرنے پڑے۔ مزید برآں، جنگ میں تقریباً 39 ارب ڈالر مالیت کی املاک تباہ ہوئی۔ مجموعی طور پر مختلف ممالک کو جنگ کی وجہ سے تقریباً 337 کروڑ ڈالر کا معاشی بوجھ اٹھانا پڑا۔ تقریباً تمام حکومتوں کو اپنی مالی صورتحال کو کنٹرول کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں نوٹ چھاپنا پڑے، جس کے نتیجے میں مہنگائی کا سنگین مسئلہ پیدا ہوا۔ ہر طبقے کے لوگوں کو مہنگائی کا کڑوا پھل چکھنا پڑا۔ مقررہ آمدنی والے لوگ خاص طور پر تباہ ہوئے۔ اس مالی صورتحال کا براہ راست اثر، ان کی سماجی حیثیت، وقار اور معیار زندگی پر پڑا۔ جنگ کے دوران تمام ممالک کی حکومتوں نے خطیر رقم کے قرضے لیے تھے۔ ان قرضوں کی ادائیگی کے لیے عوام کو سالوں تک زیادہ سے زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑا۔

3.5.4 خواتین اور مزدوروں کے حقوق کے لیے جدوجہد

(Struggle for the Rights of Women and Workers)

پہلی عالمی جنگ نے خواتین کی آزادی کی راہ ہموار کی۔ زیادہ تر صحت مند آدمی فوج میں شامل ہوئے یا فوجی کام کیا۔ اس لیے فیکٹریوں اور دکانوں، اسپتالوں اور اسکولوں، دفاتر اور رضاکارانہ تنظیموں میں عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ یہ صورت حال عارضی نہیں بلکہ مستقل

ثابت ہوئی۔اب عورتیں وہ کام کرنے لگیں جو پہلے صرف مرد کرتے تھے۔اس طرح معاشرے میں خواتین کے مقام میں انقلابی تبدیلی آئی۔ میاں بیوی کے تعلقات اور شادی کی نوعیت میں بھی بدلاؤ دیکھنے کو ملے۔لاکھوں خواتین کی سوچ، بیرونی دنیا سے جڑ گئی۔خواتین اب مردوں کے برابر حقوق کا دعویٰ کرنے لگیں۔پہلی عالمی جنگ کے بعد ہی یورپی ممالک میں خواتین کو ووٹ کا حق ملا۔1918 میں پہلی بار برطانیہ میں خواتین کو ووٹ کا حق حاصل ہوا۔جنگ کے دوران کھائیوں میں ساتھ ساتھ رہنے، مشترکہ قومی خطرے اور محنت کی وجہ سے پیدا ہونے والے سماجی بھائی چارہ نے طبقے اور جائیداد کی بندشوں کو اگر مکمل طور پر نہیں ختم کیا تو کم از کم اسے کمزور ضرور کر دیا۔سماجی روایات میں نمایاں تبدیلی آئی۔امیر اور غریب کو یکساں جنگ کے بحران کا سامنا کرنا پڑا۔منافع خور اور کالا بازاری کرنے والے نفرت اور حقارت کا نشانہ بن گئے۔ جنگ نے معاشی مساوات کے مثالی نظریے کی نئی حوصلہ افزائی کی۔'خطرہ ہم سب کو اشتراکی بناتا ہے۔' یہی وجہ تھی کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران اور اس کے بعد اشتراکیت (Socialism) تیزی سے پھیلی۔

محنت کش طبقے کی حالت پر بھی اس جنگ کا انقلابی اثر پڑا۔جنگ کے دور میں پیداوار میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔اسے روکنا ممکن تھا۔اس کی نوعیت بھلے ہی بدل بھی جائے تو اسے روکا نہیں جا سکتا۔اس لیے کارکنوں کی تعداد کے ساتھ ساتھ ان کی طاقت بھی بڑھنے لگی۔ روس میں 'مزدوروں کی ریاست' (Proletariat State) قائم ہونے کے بعد دیگر ممالک میں مزدور مزید خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ مزدوری کے لیے سازگار حالات، بیما، تحفظ وغیرہ کے شعبوں میں نمایاں اصلاحات ہوئیں۔ان اصلاحات نے مزدور تحریک کو کمزور کرنے کی کوشش کی لیکن محنت کش اپنی طاقت اور اہمیت سے واقف ہو گئے اور جہاں تک ممکن ہو سکا وہ اصلاحات کی پالیسی کے مقصد کو سمجھنے لگے۔ مزدوروں کی طرح نوجوانوں کی تحریکوں کو بھی کافی تقویت ملی۔دنیا بھر کے نوجوانوں اور طلباء نے اب سماجی اور سیاسی میدانوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔جنگی دور کی مجبوریوں نے خواتین کو رسوئی سے نکال کر کارخانوں اور دفاتر تک پہنچا دیا تھا۔خواتین کی آزادی کی تحریک کو اس سے کافی تقویت ملی۔رفتہ رفتہ اسے سیاسی حقوق ملنے لگے اور مردوں کے برابر درجہ دیا جانے لگا۔'خواتین کی تحریک آزادی کا اصل پس منظر پہلی عالمی جنگ کے دوران تشکیل دیا گیا تھا۔

3.5.5 ریاستی کنٹرول اور جنگی معیشت کا قیام

(State Control and the Establishment of a War Economy)

پہلی عالمی جنگ کا سب سے اہم سماجی واقتصادی نتیجہ سرمایہ داری کی شکل میں بنیادی تبدیلی تھی۔پرانی یا کلاسیکی سرمایہ داری، آزاد تجارت (*Laissez Faire*) کے اصول پر مبنی تھی۔جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی حکومتوں نے چنگی (Custom Duty) عائد کرنا، قومی صنعتوں کی حفاظت، سامراجی توسیع کے ذریعے منڈیوں اور خام مال کی تلاش اور محنت کش طبقے کے مفادات میں حفاظتی سماجی قوانین نافذ کرنا شروع کر دیے تھے۔جنگ کے دوران تمام متحارب ممالک کی حکومتوں نے معیشت کو زیادہ باریکی سے کنٹرول کیا۔درحقیقت پہلی عالمی جنگ کے دوران ہی منصوبہ بند معیشت نافذ کی گئی تھی۔پہلی بار ایک متعین مقصد کے لیے ریاست نے تمام املاک، وسائل اور سماج کے اخلاقی مقاصد کو منظم کرنے کی کوشش کی۔چونکہ کسی کو اتنی طویل جنگ کا اندازہ نہیں تھا، اس لیے جنگ کی ضروریات کو پورا کرنے کے

لیے کسی نے کوئی پیشگی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔اس لیے فوری طور پر ہر چیز کا بندوبست کرنا پڑا۔1916تک، ہر حکومت نے جنگی کوششوں کو مربوط کرنے کے لیے بورڈز، بیورو، کونسلز اور کمیشن قائم کیے تھے۔ضرورت اس امر کی تھی کہ تمام انسانی وسائل، خام مال اور درآمدی سامان کو جنگ کے لیے موثر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ جنگ کی مصیبتوں میں، آزاد مسابقت کا طریقہ مہنگا پایا گیا اور غیر ہدایتی فرداً فرداً کاروبار انتہائی سست اور متلون محسوس ہونے لگا۔ منافع کی نوعیت بدنام ہو گئی۔ جو تاجر مال کی قلت کا فائدہ اٹھا کر منافع کما رہے تھے انہیں 'منافع خور' قرار دیا گیا۔تاجروں کو ان کی مرضی کے مطابق کارخانے کھولنے اور بند کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔ حکومتی اجازت کے بغیر نیا کاروبار شروع کرنا ناممکن ہو گیا، کیونکہ اسٹاک اور بانڈز کے گھٹنے بڑھنے(flotation) کو کنٹرول کیا گیا اور حکومت کی مرضی سے خام مال دستیاب کرایا گیا۔ جنگ سے متعلقہ اشیاء کی پیداوار سے متعلق صنعتوں کو بند کرنا ناممکن ہو گیا۔ اگر ایسے کارخانے گھاٹے میں چل رہے تھے یا چلنے سے قاصر تھے تو حکومت نقصان اٹھا کر یا مالی امداد دے کر انہیں چلاتی تھی۔ یہاں مقابلہ اور منافع کی پرواہ نہیں کی گئی۔اب نیا مقصد پورے ملک کے مفاد میں پیداوار کو مربوط یا معقول بنانا تھا۔مزدوروں کو کام کے اوقات یا اجرت پر احتجاج کرنے سے روک دیا گیا اور بڑی مزدور یونینوں نے ہڑتالوں سے پرہیز کرنے پر اتفاق کیا۔اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لیے اپنی مراعات کا اظہار شرمناک بن گیا۔ کم کھانا اور پرانے کپڑے پہننا حب الوطنی کا مظہر تھا۔جنگ نے مشترکہ خطرے میں امیر اور غریب سبھی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے معاشی مساوات کے خیال کو نئی تحریک دی۔

افرادی قوت کے اختصاص(allocation) کی طرف پہلا قدم فوجی بھرتی تھا۔ تمام حکومتوں کے سامنے سوال یہ تھا کہ دستیاب مرد آبادی کو فوجی اور سویلین مقاصد کے لیے کیسے تقسیم کیا جائے، تاکہ کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ فوجی ضروریات کے پیش نظر مرد آبادی سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے لیے حکومت نے ان صنعتوں کو بند کر دیا یا ان کی تعداد بہت کم کر دی جن کی عسکری نقطہ نظر سے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ حکومت نے نہ تو لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کیا اور نہ ہی انہیں کوئی پیشہ جوائن کرنے یا چھوڑنے پر مجبور کیا۔ لیکن اجرتوں کی شرحیں طے کر کے، کچھ لوگوں کو فوجی بھرتی سے مستثنیٰ قرار دے کر، کچھ صنعتوں کی توسیع کا حکم دے کر اور کچھ کو محدود کر کے اور اس خیال کو پھیلا کر کہ اسلحہ ساز فیکٹریوں میں کام کرنا حب الوطنی ہے، حکومت نے بڑی تعداد میں لوگوں کو اسلحہ سازی کی صنعتوں میں جانے کی تحریک دلائی۔ پہلی عالمی جنگ میں بندھوا مزدوری کا استعمال نہیں ہوا اور نہ ہی جنگی قیدیوں سے مزدوری کرائی گئی۔البتہ، جرمنی نے اس معاملے میں بعض مقامات پر بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ضرور کی۔

حکومت نے تمام غیر ملکی تجارت کو کنٹرول کیا۔ یہ ناقابل برداشت تھا کہ لوگ اپنی مرضی سے قومی وسائل بیرون ملک برآمد کریں ۔شہریوں کے ذریعے غیر ضروری اشیا درآمد کر کے زرمبادلہ کا غلط استعمال یا مسابقت کے ذریعے قیمتیں بڑھانا حکومت کے لیے انتہائی ناقابل برداشت تھا۔ بیرونی تجارت پر ریاستی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ پرائیویٹ فرمیں سخت لائسنس اور کوٹے کے تحت چلائی جانے لگیں۔ غیر جانبدار ممالک بھی اس سے متاثر ہوئے۔ مثال کے طور پر ہالینڈ کی حکومت نے درآمدات اور برآمدات کو کنٹرول کرنے کے لیے 'نیدرلینڈ اوورسیز ٹرسٹ' قائم کیا۔امریکی حکومت نے بھی 1917 میں قانون کے ذریعے اناج اور صنعتی اشیا کی قیمتوں کو کنٹرول کیا۔ ہر حکومت کو ایک جہاز رانی بورڈ قائم کرنا پڑا، تاکہ فوجوں کی آمدورفت اور سامان کی ڈھلائی منظم طریقے سے ہو سکے۔ کنٹرول اور اختصاص نے بالآخر بین الاقوامی شکل

اختیار کرلی۔ جنگ کے دوران ایک 'انٹر الائیڈ شپنگ کونسل' بنائی گئی جس کا امریکہ بھی ممبر تھا۔ انگلینڈ اور فرانس میں جہاں تمام پیداکنندگان کا دارومدار درآمد پر تھا وہ حکومتی کنٹرول میں آگئے اور اس طرح پوری معیشت پر حکومت کا کنٹرول قائم ہو گیا۔ روس اور مغربی یورپ تک رسائی سے محروم جرمنی کو بھی غیر متوقع طور پر معاشی خود انحصاری کی پالیسی اپنانی پڑی۔ جنگ کے آخری دنوں میں رومانیہ سے حاصل کیا جانے والا تیل اور یوکرین سے حاصل کی جانے والی گندم جرمنی کی ضروریات سے بہت کم پڑ رہی تھی۔ جرمنی دوسرے متحارب ممالک سے زیادہ بھوکا تھا۔ اس لیے جرمنی کو زیادہ مضبوط اور موثر حکومتی کنٹرول قائم کرنا تھا، جسے جنگی اشتراکیت کہا جاتا ہے۔ جرمنی کو والٹر ریتھنو (Walter Rathnau) کی صورت میں ایک باصلاحیت منتظم ملا۔ وہ ایک صنعت کار، جرمن بجلی کے ٹرسٹ کے مالک کا بیٹا، اور ایک جرأت مند اور آگے کی سوچ رکھنے والا آدمی تھا۔ وہ ان چند لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے ایک طویل جنگ کی توقع کی تھی۔ اسے جنگ کے دوران خام مال کی نقل و حرکت کا انچارج بنایا گیا۔ جنگ کے آغاز میں ایسا لگتا تھا کہ بارود بنانے کے لیے درکار نائٹروجن کی کمی کی وجہ سے جرمنی ہار جائے گا۔ ریتھنو نے تیزی سے ہر مفروضہ قدرتی ذریعہ، یہاں تک کہ کسانوں کے بون یارڈ سے کھاد بھی جمع کرلی۔ جرمن کیمیائی صنعت میں بہت سے متبادل تیار کیے گئے، جیسے مصنوعی ربڑ۔ ریتھنو نے ہر صنعت کے لیے ایک جنگی کمپنی بنا کر جرمن پیداوار کو منظم کیا۔ یہ کمپنیاں ایک قسم کا ٹرسٹ ہوتی تھیں جو صنعت سے متعلق مختلف کاروباری اداروں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ حکومت کے کنٹرول میں، ہر کمپنی نے پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا، قیمتوں کو کنٹرول کیا، ممبر فرموں اور اداروں کو خام مال مختص کیا اور یہ طے کیا کہ ہر کان اور فیکٹری کو کس طرح پیداوار کرنی چاہیے۔ جنگ، کمپنیوں کی مسابقت پر پابندی کی علامت تھی اور 1890 عیسوی سے یورپ اور امریکہ میں ٹرسٹ اور اجارہ داری کے بڑھتے ہوئے رجحان کا موضوع تھی۔

ریتھنو کا خیال تھا کہ اس کی جنگی کمپنیاں، نجی کارپوریشن اور سرکاری بیورو سے الگ ایک درمیانی راستہ ہے اور اس کا خیال تھا کہ جنگ کے بعد ایسا نظام مستقل طور پر تشکیل دیا جائے گا۔ اپنی کتاب *In Days to Come* میں، اس نے ایک صنعتی معاشرے کی تصویر کشی کی جس میں مسابقت اور منافع خوری ختم کردی جائے گی اور منتظم اور کارکن مل کر صنعتیں چلائیں گے، منصوبے بنائیں گے، آپس میں ذمہ داریاں بانٹیں گے اور ایمانداری سے منافع بانٹیں گے۔ اس کے خیالات کا اثر جنگ کے بعد جرمنی اور جرمنی سے باہر دوسرے ممالک میں نظر آتا ہے۔ اس میں ہمیں روسی اشتراکیت، جرمن نازیت اور اطالوی فسطائیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ جرمنی میں تو جنگ نے آزادانہ مقابلے پر لوگوں کے بھروسے کو ہی ختم کر دیا۔ دیگر متحارب حکومتوں نے بھی آزاد فرموں اور کارخانوں کے درمیان مقابلے کے بجائے ربط وضبط قائم کیا۔ فرانس میں صنعت کاروں کے گٹھبندھن نے مختلف صنعتوں کے درمیان خام مال الاٹ کیا۔ امریکہ میں برنارڈ برچ (Bernard Bruch) کی سربراہی میں 'وار انڈسٹریز بورڈ' نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ نظام برطانیہ میں بھی بہت کامیاب رہا۔ کوئی بھی حکومت کسی بھی قسم کے ٹیکس لگا کر جنگ کے لیے مطلوبہ اخراجات نہیں بڑھا سکتی تھی۔ لہٰذا، ہر متحارب ملک کو کاغذی کرنسی چھاپنی پڑتی تھی، بھاری بانڈز جاری کرنا پڑے اور بینکوں کو زیادہ سے زیادہ رقم فراہم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اشیا کی قلت اور کرنسی کی ضرورت سے زیادہ گردش کی وجہ سے مہنگائی پیدا ہوئی۔ قیمتوں اور اجرتوں کو منضبط کیا گیا تھا، لیکن 1914 سے پہلے کی قیمت قائم نہیں ہو سکی۔ مہنگائی کا سب سے زیادہ شکار تنخواہ دار طبقہ

ہوا جس کی آمدنی میں آسانی سے اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ تنخواہ دار کارکن اور مقررہ آمدنی والے لوگ جنگ سے پہلے یورپی معاشرے میں ایک مستحکم طبقہ تھے۔ ہر جگہ جنگ نے ان کے وقار، ان کے معیار زندگی اور ان کی اہمیت کو خطرے میں ڈال دیا۔ بڑھتے ہوئے قومی قرض کا مطلب آنے والے سالوں میں زیادہ ٹیکس لگانا تھا۔ دوسرے ممالک سے لیے گئے قرضوں کی وجہ سے قرضوں کا مسئلہ مزید سنگین ہو گیا۔ جنگ کے دوران یورپی ممالک نے برطانیہ سے قرض لیا اور سب نے مل کر امریکہ سے قرض لیا۔ اس طرح اس نے اپنے مستقبل کو یرغمال بنالیا۔ قرض کی ادائیگی کے لیے وہ سالوں سے برآمد (export) سے زیادہ درآمد (import) کرنے پر مجبور تھے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ 1914 میں ہر ترقی یافتہ یورپی ملک عادتاً درآمد سے زیادہ برآمد کرتا تھا۔

تمام متحارب حکومتوں نے معاشی پیداوار کے طور پر نظریات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ وہ آزادی فکر، جو تقریباً پچاس سال سے یورپ میں پائی جاتی تھی، اب عملی طور پر سلب کر دی گئی تھی۔ پروپیگنڈا اور سنسر شپ کو مزید موثر بنایا گیا۔ حکومتی کنٹرول کو چیلنج کرنے کی عادت ناپسند کی جانے لگی۔ مخالف ممالک کے درمیان الزامات اور جوابی الزامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ طویل جدوجہد، لاحاصل لڑائی، ناقابل حل جنگی سوالات اور بھاری جانی نقصان سے عوام کے حوصلے ٹوٹ رہے تھے۔ اس کا مقصد عام آزادیوں سے محروم، محنت کرنے، سادہ کھانا کھانے اور فتح کے آثار نہ دیکھنے والے عوام کے حوصلے کو جذباتی انداز میں بلند رکھنا تھا۔ پوسٹرز، اشتہارات، سفید دستاویز، اسکول کی کتابوں، عوامی تقاریر، رسمی ادارتی مضامین، اخباری رپورٹس وغیرہ کے ذریعے لوگوں کے حوصلے بلند کرنے کی کوشش کی گئی۔ عالمگیر خواندگی، بڑی تعداد میں اخبارات اور متحرک تصاویر کے ذریعے رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کی کوششیں کی گئیں۔ دانشوران اور پروفیسرز نے پیچیدہ تاریخی دلائل کے ذریعے مخالف ممالک کی شکست کے ناگزیر ہونے کی پیشین گوئی کی۔ اتحادی ملکوں میں جرمن قیصر کو جلتی آنکھوں اور ضرورت سے زیادہ کھڑی مونچھوں والے ایک عفریت کے طور پر پیش کیا گیا تھا جو ساری دنیا کو فتح کرنے کے لیے جنونی ہو رہا تھا۔ جرمن عوام کو اس دن سے ڈرنے کا کہا گیا جب کوزاک اور سینیگالی حبشی جرمن خواتین کی عصمت دری کریں گے۔ جرمنی میں انگلینڈ کو ایک ایسے کٹر دشمن کے طور پر پیش کیا گیا جو ناکہ بندی کے ذریعے معصوم بچوں کو بھوکا مار رہا تھا۔ ہر ملک نے اپنے آپ کو صحیح اور دوسرے کو غلط، برا اور وحشی قرار دیا۔ اس خوفناک جدوجہد میں مشتعل عوامی رائے نے مردوں اور عورتوں کو ہمت دی۔ لیکن جب امن قائم کرنے کا وقت آیا تو انہیں تعصبات، سخت نظریات، گہری نفرت، خوف اور بے حسی کی وجہ سے پائیدار امن کا قیام مشکل ثابت ہوا۔

3.5.6 غیر یورپی ممالک میں سرمایہ دارانہ ترقی (Capitalist Development in Non-European Countries)

پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں غیر یورپی ممالک میں لگائے گئے سرمائے میں بہت زیادہ کمی آئی اور یورپی ممالک کے لیے دوسرے براعظموں میں اقتصادی ترقی پر اثر انداز ہونے کے مواقع کم ہونے لگے۔ جنگ کے دوران یورپی ممالک نے اپنی صنعتی پیداوار کو جنگ پر مبنی کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی برآمدی تجارت مکمل طور پر ٹھپ ہو گئی۔ نتیجتاً، غیر یورپی ممالک کو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنی معاشی زندگی کو دوبارہ ترتیب دینا پڑا۔ یورپ چار سال تک جنگ میں پھنسا رہا۔ دریں اثنا، باقی دنیا نے اپنی صنعت کاری کی رفتار میں اضافہ کیا۔ امریکہ کی پیداواری صلاحیت بہت بڑھ گئی۔ جاپانیوں نے ایشیا اور جنوبی امریکہ کے ممالک کو اپنی منڈی بنالیا جہاں پہلے یورپی ممالک کی اجارہ

داری تھی۔ ارجنٹائن اور برازیل، جو انگلینڈ سے ریلوے انجن کے پرزے اور کان کنی کے آلات حاصل کرنے سے قاصر تھے، انہیں اپنے آپ بنانا شروع کر دیا۔ پہلے کے پسماندہ ممالک اب نئی صورت حال میں صنعت کاری کی راہ پر آگے بڑھنے کے لیے تیار تھے اور انہوں نے بھی 1920 کی دہائی میں غیر معمولی ترقی کی۔

3.5.7 غیر منصفانہ معاہدے اور ناتسیت اور فسطائیت کا عروج

(Unfair Treaties and the Rise of Nazism and Fascism)

پہلی عالمی جنگ کے بعد ناتسیت (Nazism) اور فسطائیت (Fascism) کا عروج بڑی حد تک شکست خوردہ ممالک پر مسلط کیے گئے غیر منصفانہ معاہدوں سے جڑا ہوا تھا، خاص طور پر 1919 میں ہونے والے معاہدہ ورسائی سے۔ اس معاہدے نے جرمنی پر سخت سزائیں عائد کیں، جن میں بھاری تاوان، علاقائی نقصان اور غیر مسلح کرنا شامل تھا، جس نے اس کی معیشت اور قومی فخر کو تباہ کر دیا۔ ان سخت اقدامات نے جرمن عوام میں وسیع پیمانے پر ناراضگی اور ذلت کے احساس کو جنم دیا، جس سے قوم پرستی کے جذبات پروان چڑھے۔ اٹلی میں بھی ایسی ہی مایوسی پائی گئی، جو کہ فاتح ممالک میں شامل ہونے کے باوجود، اپنے موعودہ علاقائی فوائد سے محروم رہا۔ اس کے نتیجے میں سیاسی عدم استحکام، معاشی بدحالی، اور جمہوری حکومتوں سے مایوسی نے انتہا پسند نظریات کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا۔ جرمنی میں ناتسیت اور اٹلی میں فسطائیت نے اس عوامی ناراضگی کو استعمال کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا کہ وہ قومی طاقت کو بحال کریں گے، جنگ کے بعد کے معاہدوں کی ناانصافیوں کا ازالہ کریں گے، اور اپنے ممالک کو طاقتور، آمرانہ ریاستوں میں تبدیل کریں گے۔

3.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

جون 1914ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی، جس میں ایک طرف برطانیہ، فرانس، اٹلی، روس، جاپان اور امریکا اور دوسری طرف جرمنی، آسٹریا ہنگری اور ترکی تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دنیا کے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں میں بلا شرکت غیرے، منڈیاں اور نوآبادیاں حاصل کرنے کی جدوجہد، بلکہ مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے دنیا کا فتح کیا جانے والا حصہ بہت کم باقی بچا تھا، اس لیے مقابلہ شدید تر ہو گیا تھا۔ جرمنی اور اٹلی جیسے ملک جو عالمی منظر پر دیر سے نمودار ہوئے تھے ان کے حصے میں دنیا کا اتنا علاقہ نہیں آسکا تھا جتنا کہ برطانیہ اور فرانس جیسے پہلے سے صنعت یافتہ ملکوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اب وہ طاقتیں نوآبادیوں کی تقسیم نو کا مطالبہ کر رہی تھیں اور اس مطالبے کو طاقت کے زور سے پورا کرانے پر تلی تھیں۔ دنیا کا ہر بڑا ملک اپنی نوآبادیات پر قابض رہنے کے لیے، یا نئی نوآبادیاں حاصل کرنے کے لیے جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں عالمی طاقتیں اسلحہ اندوزی کے شدید مقابلے میں مبتلا تھیں۔ نوآبادیوں کے حصول کی جدوجہد میں ان ملکوں کے عوام بھی جذباتی طور پر بے طرح مبتلا ہو گئے تھے، کیوں کہ حکمرانوں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ کسی بھی ملک کے وقار اور اس کی قوت و شہرت کا انحصار اس پر ہے کہ کتنی نوآبادیاں اس کے قبضے میں ہیں۔ اس نوع کے پروپیگنڈے میں جنگ نواز اخبارات بھی پیش پیش تھے۔ اس طرح سے برطانیہ کو اس پر غرور تھا کہ اس کی سلطنت میں کبھی

آفتاب غروب نہیں ہوتا، جرمنی بھی اسی غرور کا متلاشی تھا۔ حریف طاقتیں زیادہ سے زیادہ ملکوں کو حلیف بنانے کی کوشش میں لگی تھیں تاکہ سیاسی وعسکری اعتبار سے وہ یکہ وتنہا نہ رہ جائیں۔ جلد ہی دنیا کے تمام ملک دو حریف کیمپوں میں بٹ گئے۔ بالآخر اگست 1914ء میں جنگ نے شروع ہوگئی اور اس نے جلد ہی عالم گیر شکل اختیار کرلی۔ اکتوبر 1918 میں ختم ہونے والی اس جنگ نے بے مثال تباہی مچائی۔ کئی برسوں تک جنگ کے لیے کھودی گئی خندقوں میں سپاہی لڑتے رہے اور پہلی بار جنگ میں کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا گیا۔ ہوائی جہازوں سے شہریوں پر بموں کی بارش کی گئی۔ یہ ایک ایسی مکمل جنگ تھی جس میں تمام طبقات کے لوگوں نے حصہ لیا اور تمام قومی وسائل استعمال کیے گئے۔ معاصرین نے بھی اسے عظیم جنگ کہنا شروع کردیا۔ اس جنگ کے دوران یا اس کے بعد، چار سلطنتوں (جرمنی کی ہوہنزولرن سلطنت، آسٹریا ہنگری کی ہیپس برگ سلطنت، روس کی رومانوف سلطنت اور ترکی کی عثمانی سلطنت) کا خاتمہ ہوگیا۔ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں اور یورپ کے نقشے کی وسیع تر ترمیم نے بیسویں صدی کے مستقبل کی سمت کا تعین کیا۔ اس نے ان تمام امیدوں اور اعتماد کو ہمیشہ کے لیے تباہ کردیا جس کے ساتھ صدی کا آغاز ہوا تھا۔ معاصر تاریخ دانوں نے اسے 'تمام جنگوں کو ختم کرنے کی جنگ' قرار دیا۔ پھر بھی، 20 سال بعد ایک اور تباہ کن جنگ لڑی گئی، جو اس سے بھی زیادہ دیر تک جاری رہی۔ پہلی عالمی جنگ کے اسباب اور اس میں شامل ممالک کی ذمہ داریوں سے متعلق مسائل پر صدیوں سے بحث ہوتی رہی ہے لیکن یہ جنگ کیوں لڑی گئی اس پر کوئی اتفاق رائے آج تک نہیں ہوسکا ہے۔

3.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

متحارب	:	ایک دوسرے سے لڑنے والے
عمری ابھار	:	(Age Bulge) 1930 میں اسکولوں میں گیارہ سے پندرہ سال کے بچوں کی تعداد بہت کم تھی جب کہ پانچ سے دس سال کی عمر کے بچوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اسے ہی عمری ابھار (Age Bulge) کہا جاتا ہے جس کا اثر 1960 تک نظر آتا رہا۔
سوراج	:	حکومت خوداختیاری، اپنے اوپر خود حکمرانی کرنے کا کسی ملک یا قوم کا حق

3.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. پہلی عالمی جنگ کے وقت جرمنی پر کس خاندان کی حکومت تھی؟
2. پہلی عالمی جنگ کس سال شروع ہوئی؟
3. یورپ میں خفیہ معاہدوں کا سلسلہ کس نے شروع کیا؟
4. ابتدائی طور پر یورپی سامراجی طاقتوں نے پرامن طریقے سے کس براعظم کو آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا؟
5. 1904 میں کس ایشیائی ملک نے روس کو شکست دی؟

6. سامراجی کشمکش کا تیسرا اور سب سے خطرناک علاقہ کون سا تھا؟

7. جنگ کا فوری سبب کس کا قتل تھا؟

8. جنگ کے دوران تمام تر غیر ملکی تجارت کو کس نے کنٹرول کیا؟

9. کون سی ہندوستانی کمپنی برطانوی سلطنت میں سب سے بڑی اسٹیل کی فیکٹری بن گئی؟

10. خلافت تحریک کے دو رہنماؤں کے نام بتائیے۔

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. یورپ کی دو مخالف خیموں میں تقسیم پر ایک نوٹ لکھیے۔

2. سامراجی کشمکش پر ایک نوٹ لکھیے۔

3. پہلی عالمی جنگ میں فرانس اور برطانیہ کی ذمے داری پر ایک نوٹ لکھیے۔

4. جنگ کے فوری سبب پر روشنی ڈالیے۔

5. کانگریس کے لکھنؤ اجلاس پر ایک نوٹ لکھیے۔

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پہلی عالمی جنگ کی ذمہ داری کے تعلق سے ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

2. پہلی عالمی جنگ کے اثرات پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

3. ہندوستان پر پہلی عالمی جنگ کے کیا اہم اثرات مرتب ہوئے؟ تفصیلی وضاحت کیجیے۔

3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Brown, Judith M., *Modern India*: *The Origins of an Asian Democracy*. Oxford University Press, Oxford and New York, 1994.
2. Ferguson, Niall, *The War of the World*: *Twentieth-Century Conflict and the Descent of the West*, Penguin Press, New York, 2006.
3. Hall, Gardner, *The Failure to Prevent World War I*: *The Unexpected Armageddon*, Routledge, 2015.
4. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
5. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
6. Stevenson, David, *The First World War and International Politics*, Oxford University Press, 1988.
7. Winter, Jay ed., *The Cambridge History of the First World War* (2016 ed.). Cambridge University Press, 2014.

اکائی 4۔ پیرس معاہدۂ امن: ایک تخمینہ

(Paris Peace Settlement: An Appraisal)

اکائی کے اجزاء

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 پیرس امن کانفرنس

4.2.1 ورسائی معاہدہ

4.2.2 سینٹ جرمین معاہدہ

4.2.3 نیولی معاہدہ

4.2.4 ٹرائینن معاہدہ

4.2.5 سیوریس معاہدہ

4.3 مینڈیٹ نِظام

4.4 پیرس امن کانفرنس کی اہمیت

4.5 معاوضے

4.6 پیرس امن کانفرنس پر تنقید

4.7 اکتسابی نتائج

4.8 کلیدی الفاظ

4.9 نمونہ امتحانی سوالات

4.9.1 معروضی سوالات

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید (Introduction)

علمی جنگ میں کثیر تعداد میں انسانی جان اور سامان استعمال ہوا۔ دنیامیں یورپ کی بالادستی ختم ہونے لگی اور امریکہ عظیم طاقت بن کر ابھرنے لگا۔ جاپان نے مشرق میں اپنی بالادستی قائم کی۔ یہ جنگ اتحادیوں) برطانیہ، فرانس، امریکہ اور اٹلی(اور مرکزی طاقتوں) جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ترکی(کی ریاستوں کے درمیان پانچ الگ الگ معاہدوں کے سلسلے کے ذریعے ختم کی گئی۔ یہ معاہدے جرمنی کے ساتھ ورسائی معاہدہ، آسٹریا کے ساتھ سینٹ جرمین معاہدہ، بلغاریہ کے ساتھ نیویلی معاہدہ، ہنگری کے ساتھ ٹریانون معاہدہ اور ترکی کے ساتھ سیورس معاہدہ تھے۔ جبکہ پہلے چار پر 1919 میں دستخط کیے گئے تھے، آخری معاہدہ پر 1920 میں دستخط کیے گئے تھے۔ ان معاہدوں کی نمایاں خصوصیات میں مجلسِ اقوام (The League of Nations) کی بنیاد شامل تھی۔ صرف یورپ میں حق خودارادیت کی اجازت دی گ جبکہ ایشیا اور افریقہ میں یورپی طاقتوں کی نوآبادیوں میں اس نظریے کی قید تھی۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس باب کے مقاصد یوں ہیں

- پیرس امن کانفرنس کے متعدد پہلوؤں کا تجزیہ کیا جائے گا۔
- عالمی سیاست میں نئے آغاز کی وضاحت کی جائے گی۔
- حق خودارادیت کے تصور کی وضاحت کی جائے گی۔
- پیرس کانفرنس میں موجود قائدین کے اہداف اور محرکات کے ساتھ ساتھ دیگر مندوبین پر گفتگو ہوگی۔
- پیرس کانفرنس مستقبل کے تنازعات کو روکنے، معاوضے اور علاقائی تبدیلیوں کا تعین کرتی ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو ہوگی۔
- مختلف دستخط شدہ معاہدوں کا جائزہ لیا جائے گا، خاص طور پر جرمنی کے ساتھ ورسائی معاہدہ کا۔

4.2 پیرس امن کانفرنس (The Paris Peace Conference)

جنگیں عام طور پر ختم ہو جاتی ہیں اور متحارب ریاستوں کے درمیان امن معاہدوں پر دستخط کے بعد امن بحال ہو جاتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ بھی امن معاہدوں کے ذریعے ختم کی گئی تھی۔ جب جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی تو اتحادی طاقتوں نے دنیا میں پائیدار امن کے لیے مختلف حلقوں کی جانب سے پیش کیے گئے منصوبوں اور تجاویز پر غور شروع کر دیا۔ نتیجتاً پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد 1919 اور 1920 میں رسمی اور غیر رسمی سفارتی ملاقاتیں ہوئیں، جن میں فاتح اتحادیوں نے شکست خوردہ مرکزی طاقتوں کے لیے امن کی شرائط طے کیں۔ چنانچہ 1919 میں پیرس امن کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں برطانیہ، فرانس، امریکہ اور اٹلی کے رہنماؤں کا غلبہ تھا، اس کانفرنس کے پانچ معاہدوں کے نتیجے میں یورپ اور ایشیا کے کچھ حصوں، افریقہ اور بحر الکاہل کے جزائر کے نقشوں کو دوبارہ ترتیب دیا گیا، اور مالی جرمانے بھی لگائے۔ جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ترکی اور دیگر ہارنے والے ممالک کو کانفرنس میں بولنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جس نے بعد میں سیاسی

ناراضگیوں کو جنم دیا جو کئی دہائیوں تک جاری رہی۔اس کانفرنس کے ذریعے کیے گئے انتظامات کو بیسویں صدی کی جغرافیائی سیاسی تاریخ کے عظیم سنگ میلوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔

جرمنی کے ہتھیار ڈالنے اور جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد اتحادیوں نے امن کانفرنس کے انعقاد کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔ یہ کانفرنس بالآخر جنوری 1919 میں پیرس میں منعقد کی گئی۔ یہ تقریباً چھ ماہ تک جاری رہی۔ اس کانفرنس میں بتیس (32) ممالک کے سفارت کاروں نے شرکت کی جن میں بنیادی طور پر اتحادی ممالک شامل تھے۔ یہ اجتماع متاثر کن تھا، کیونکہ زیادہ تر عالمی رہنما موجود تھے۔ اس کے بڑے فیصلے مجلسِ اقوام 1920 کی تشکیل ہوئی اور شکست خوردہ ریاستوں کے ساتھ پانچ امن معاہدوں پر دستخط ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا، اس طرح کی کانفرنس میں غیر یورپی طاقتوں یعنی امریکہ، جاپان وغیرہ نے شرکت کی۔ روس نے حصہ نہیں لیا کیونکہ اس نے دورانِ جنگ ہی، جنگ سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔ مرکزی طاقتوں میں سے کسی کو بھی کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔ یہ کانفرنس بنیادی طور پر چار بڑی طاقتوں ––– امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے منعقد کی تھی۔

تاہم، متضاد اور تنگ نظر قومی مفادات، چھوٹے چھوٹے اور غیر منصفانہ دعوے، اور نوآبادیوں پر قبضہ کرنے کے رجحانات نے کانفرنس کی کارروائیوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ کانفرنس کو کئی پیچیدہ مسائل سے نمٹنے کے لیے بلایا گیا، جن میں یورپ میں سابقہ زیر تسلط قوموں کی بڑھتی ہوئی قومی خواہشات، جنگ کے دوران دستخط کیے گئے خفیہ معاہدے، یورپی اتحادی طاقتوں کو ہونے والے نقصانات کے معاوضے کے مطالبات، اور جنگ کے دوران جرمنی کی جانب سے کیے گئے جرائم کا ازالہ شامل تھا۔ جرمنی کو جنگ کے اعلان اور بڑے پیمانے پر جان ومال کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

پیرس میں امن کانفرنس نے اپنی رسمی افتتاحی تقریب کے بعد مختلف مسائل اور موضوعات کا مطالعہ کرنے اور ان سے نمٹنے کی مناسب سفارشات پیش کرنے کے لیے ماہرین اور سفارت کاروں کی کمیٹیاں مقرر کیں۔ شریک ممالک کے متضاد مطالبات، مقاصد اور اہداف کے پیش نظر کانفرنس کے لیے ایک معروضی اور معقول نتیجے پر پہنچنا آسان نہیں تھا۔ امریکی صدر ووڈرو ولسن نے 1917 میں تقریباً 150 تعلیمی ماہرین کا ایک گروپ تشکیل دیا کہ وہ یورپی سفارتی مذاکرات میں پیش آنے والے موضوعات پر تحقیق کریں اور امن مذاکرات کے لیے اصولوں کا ایک مجموعہ تیار کریں تاکہ پہلی عالمی جنگ کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اس تحقیق کے نتائج کا "چودہ نکات" کے نام سے ایک دستاویز میں خلاصہ کیا گیا، جو جرمنی کے ساتھ جنگ بندی کی بنیاد بنی۔ ان "چودہ نکات" کی فہرست درج ذیل ہیں:

- خفیہ سفارت کاری کا خاتمہ۔
- جنگ اور امن میں تمام اقوام کے لیے بحری راستے کا آزادانہ استعمال۔
- ریاستوں کے درمیان اقتصادی رکاوٹوں کا خاتمہ۔
- اسلحے کی ہر سطح پر کمی۔
- متعلقہ آبادی کے مفاد میں نوآبادیاتی دعووں کا غیر جانبدارانہ حل۔

- روسی علاقے کی انخلاء۔
- بیلجیئم کی بحالی۔
- فرانس کی آزادی اور الساس اور لورین کی فرانس میں بحالی۔
- اطالوی سرحدوں کی قومی خطوط کے مطابق دوبارہ ترتیب۔
- آسٹریا ہنگری کے لوگوں کے لیے خود مختار حکومت۔
- رومانیہ، سربیا اور مونٹی نیگرو سے انخلا اور سربیا کو سمندر تک رسائی دی جائے گی۔
- سلطنت عثمانیہ کے غیر ترک لوگوں کے لیے خود مختار حکومت اور دردانیلز کا مستقل افتتاح۔
- سمندر تک محفوظ رسائی کے ساتھ ایک آزاد پولینڈ۔
- امن کے قیام کے لیے اقوام کی ایک عمومی انجمن۔

کانفرنس کا بنیادی نتیجہ جرمنی کے ساتھ ورسائی معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کے آرٹیکل 231 نے جنگ کا سارا قصور "جرمنی اور اس کے اتحادیوں کی جارحیت" پر عائد کیا۔ یہ فراہمی جرمنی کے رہنماؤں، فوج اور شہریوں کے لیے یکساں طور پر ذلت آمیز ثابت ہوئی۔ اُس وقت چار بڑی طاقتیں جن میں برطانیہ، فرانس، اٹلی اور امریکہ کانفرنس پر کنٹرول رکھتی تھیں۔ اور ان ممالک کے لیڈروں میں برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ لائیڈ جارج، فرانسیسی وزیر اعظم جارج کلیمینسو، امریکی صدر ووڈرو ولسن، اور اطالوی وزیر اعظم وٹوریو ایمانوئل اور لینڈو شامل تھے۔ ان رہنماؤں نے سفارت کاروں اور قانونی ماہرین کی ٹیموں کے ساتھ غیر رسمی طور پر 145 بار ملاقات کی اور تمام اہم فیصلوں پر اتفاق کیا جو بعد میں منظور کیے گئے۔ کانفرنس 18 جنوری 1919 کو شروع ہوئی۔ اس کے اختتام کے حوالے سے، پروفیسر مائیکل نیبرگ نے نوٹ کیا، "اگرچہ سینئر سیاستدانوں نے جون 1919 میں کانفرنس پر ذاتی طور پر کام کرنا چھوڑ دیا تھا، لیکن باقاعدہ امن کے عمل کا اختتام واقعی جولائی 1923 تک ختم نہیں ہوا تھا، جب معاہدہ لوزان پر دستخط کیے گئے تھے"۔ اس پورے عمل کو اکثر "ورسائی کانفرنس" کہا جاتا ہے، حالانکہ پہلے معاہدے پر دستخط تاریخی محل کوئی ڈورسی) پیرس (میں ہوئے تھے۔

کانفرنس کا باقاعدہ آغاز 18 جنوری 1919 کو پیرس کے کوئی دورسی میں ہوا۔ یہ علامتی تاریخ تھی) جرمنی کے لیے ایک تاریخی دن تھا (کیونکہ یہ 1871 میں، ولیم اول کے جرمن شہنشاہ کے طور پر سالگرہ تھی۔ تاہم اسی دن بتیس اتحادی ممالک کے نمائندوں کو باون کمیشنوں کے لیے تفویض کیا گیا تھا، جنہوں نے کئی ماہرین کی مدد سے رپورٹیں تیار کرنے کے لیے 1,646 اجلاس منعقد کیے تھے۔ کلیدی سفارشات کو جرمنی کے ساتھ ورسائی معاہدے میں جوڑ دیا گیا تھا، جس میں 15 ابواب اور 440 شقیں تھیں، ساتھ ہی دیگر شکست خوردہ اقوام کے لیے معاہدے بھی تھے۔ چار طاقتوں نے 145 مرتبہ غیر رسمی طور پر ایک ساتھ ملاقات کی اور تمام اہم فیصلے کیے، جن کی توثیق دیگر شرکاء نے کی۔ تمام وفود کے کھلے اجلاسوں نے "چار بڑے رہنماؤں" کے ذریعہ کیے گئے فیصلوں کی منظوری دی۔ یہ کانفرنس 21 جنوری 1920 کو مجلسِ اقوام کی افتتاحی جنرل اسمبلی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

پیرس امن کانفرنس میں پانچ بڑے امن معاہدے، تیار کیے گئے، جن میں متاثرہ ممالک کے نام قوسین میں دیے گئے: معاہدہ ورسائی، 28جون1919(جرمنی)، معاہدہ سینٹ جرمین، 10ستمبر1919(آسٹریا)، نیویلی معاہدہ، 27نومبر1919(بلغاریہ)، ٹرائینن معاہدہ، 4جون1920(ہنگری)، سیورلیس معاہدہ، 10اگست1920)ترکی(۔ جن اہم فیصلوں پر اتفاق کیا گیا وہ یوں تھے: مجلسِ اقوام کا قیام، شکست خوردہ ممالک کے ساتھ پانچ امن معاہدے، جرمن اور عثمانی ملکیتوں کو "مینڈیٹ" کے طور پر تقسیم کرنا، بنیادی طور پر برطانوی سلطنت اور فرانس میں، جرمنی پر عائد معاوضے، اور نئی قومی سرحدوں کا تعین، بعض اوقات عوامی رائے شماری کے ذریعے، نئی قومی سرحدوں کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

4.2.1 ورسائی معاہدہ (The Treaty of Versailles)

اتحادیوں اور جرمنی کے درمیان ورسائی معاہدے پر دستخط ہوئے تھے۔ یہ پانچ معاہدوں کی فہرست میں سب سے اہم تھا۔ یہ معاہدہ 440آرٹیکل پر مشتمل تھا۔ اس میں مرکزی طاقتوں کے علاقائی، جنگی جرائم اور امن کے قیام سے متعلق معاشی، سیاسی اور دیگر پہلوؤں کا جامع جائزہ لیا گیا۔ جرمنی، جس پر جنگ شروع کرنے کا الزام تھا اس کے ساتھ سختی سے نمٹا گیا۔ شہنشاہ قیصر ولیم دوم پر انسانیت کے خلاف جرائم کا ارتکاب کرنے کا الزام تھا اور جنگ کی وجہ سے ہونے والے قتل عام کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

جب پیرس امن کانفرنس کا آغاز ہوا تو برطانیہ اور فرانس نے ولسن کے امن کے نظریہ سے اتفاق کرنے کے کوئی آثار نہیں دکھائے۔ خاص طور پر فرانسیسی جرمنی کو سزا دینے کے لیے پُر عزم تھے کیونکہ ماضی میں جرمنی نے فرانس پر بری طرح حملے کیے تھے۔ اِس نے ایک ملین سے زیادہ فوجیوں کو کھو دیا تھا اور اس نے اپنی زمین کا بڑا حصہ تباہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ کلیمنسو چاہتا تھا کہ جرمنی جنگ کی وجہ سے ہونے والے مصائب کی ادائیگی کرے۔ دوسری طرف برطانیہ جرمنی کے ساتھ نرمی کا معاہدہ چاہتا تھا کیونکہ ایک خوشحال جرمنی برطانوی برآمدات کے لیے ایک منڈی کا کام کرے گا۔ امریکہ بھی جرمنی کے ساتھ نرمی کا معاہدہ چاہتا تھا، لیکن وہ روسیوں کے ساتھ جرمنی کے دستخط کردہ سخت معاہدے اور فرانس اور بیلجیئم سے پسپائی کے دوران جرمنی کی جانب سے شہری ساخت کی تباہی سے مایوس تھا۔ فرانسیسی، برطانوی اور امریکی مقاصد کے درمیان اختلافات کی وجہ سے ان رہنماؤں کے درمیان بہت دیر تک گرما گرم بحثیں ہونے کے بعد آخر کار ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ "ورسائی معاہدہ" جرمنی اور اتحادی طاقتوں کے درمیان 28جون1919کو دستخط ہوا۔ اس کے اہم نکات درج ذیل تھے۔

- جرمنی نے یورپ میں ایک اہم علاقہ کھو دیا کیونکہ السیس لورین فرانس کو دے دیا گیا۔
- ایسٹونیا، لٹویا اور لتھوانیا کو آزاد قومیں بنا دیا گیا۔
- جرمن سرزمین کے کچھ حصے ڈنمارک، بیلجیم، پولینڈ اور لتھوانیا کو دیے گئے۔
- سار اور ڈانزگ کی جرمن آبادی تھی لیکن انہیں مجلسِ اقوام کے زیر انتظام لایا گیا۔
- ڈینزگ مغربی پرشیا کا ایک بڑا حصہ تھا۔

- سار کو پندرہ سال تک مجلسِ اقوام کے تحت رکھا جانا تھا اور پھر ووٹ کے ذریعے فیصلہ کیا جانا تھا کہ آیا یہ فرانس کے پاس جائے گا یا جرمنی کے پاس۔
- فرانس کو ان پندرہ سالوں کے لیے سار کی کوئلے کی کانوں کے استعمال کا حق دیا گیا تھا۔
- آسٹریا اور جرمنی کے اتحاد پر پابندی عائد کی گئی حالانکہ آسٹریا میں جرمن آبادی بہت زیادہ تھی۔
- جرمنی کی افریقی نوآبادیوں کو چھین لیا گیا اور مجلسِ اقوام کے تحت مینڈیٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔
- مجلسِ اقوام کے ممبران کو ان نوآبادیوں کی "دیکھ بھال" کرنی تھی اور انہیں مستقبل میں آزادی کے لیے تیار کرنے کا مینڈیٹ دیا گیا۔
- جرمنی کو سپاہیوں کی نئی بھرتی متعارف کرانے سے روک دیا گیا تھا۔
- رائن لینڈ (جرمنی) کو مستقل طور پر غیر فوجی کر کے فرانس اور جرمنی کے درمیان حائلی علاقہ (Buffer Zone) بنا دیا گیا۔
- جرمنی کو صرف چھ جنگی جہاز اور زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ فوجی رکھنے کی اجازت تھی۔
- اس کے پاس کوئی ہوائی جہاز، کوئی ٹینک اور کوئی آبدوز نہیں رکھنی تھی۔
- جنگی جرم کے الزام میں، پہلی عالمی جنگ کا الزام صرف جرمنی اور اس کے اتحادیوں پر ڈالا گیا۔
- جرمنی کو تیس سالوں کے دوران، اتحادیوں کو تینتیس بلین ڈالر معاوضہ ادا کرنے پر مجبور کیا گیا۔

معاوضے کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ جرمنی طویل عرصے تک اپنی معیشت کے مسائل میں مبتلا رہے اور اس طرح مستقبل میں فرانس اور برطانیہ کے لیے کبھی خطرہ نہ بن سکے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ معاہدہ جرمنی کو مفلوج کرنے اور اسے اتحادی طاقتوں کے ماتحت رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ علاقوں کے کھو جانے سے جرمنی ان قدرتی وسائل سے محروم ہو گیا جو اس کی اقتصادی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ بیلجیم، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، ہنگری وغیرہ کو آزاد ریاستوں کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ جرمنی اور روس کے درمیان بریسٹ لیٹوسک معاہدے کو غیر متعلقہ قرار دے دیا گیا۔ ورسائی معاہدہ نے دنیا میں پہلی بار ایک بین الاقوامی تنظیم مجلسِ اقوام قائم کی جس کا مقصد دنیا میں امن برقرار رکھنا تھا۔ اس معاہدے نے دنیا میں پہلی بار ایک اور بین الاقوامی ادارہ 'بین الاقوامی مزدور تنظیم (International Labour Organisation) بھی قائم کی تاکہ محنت کش لوگوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا جا سکے۔ اس معاہدے نے مینڈیٹ والے علاقوں کے لیے ایک نظامِ حکومت تیار کی۔

برطانوی مؤرخ اے جے پی ٹیلر کے مطابق، یہ معاہدہ جرمنوں کو 'شر پسند، غیر منصفانہ، من مانی، غلامی کا معاہدہ' لگتا تھا لیکن ایک ایسا معاہدہ جسے وہ کسی مرحلے پر مسترد کر دیں گے اگر یہ "اپنی ہی مضحکہ خیزی کے ٹکڑوں میں نہ پڑ جائے۔" چونکہ کانفرنس کے فیصلے یکطرفہ طور پر اور بڑے پیمانے پر چار بڑے رہنماؤں کی خواہشات پر نافذ کیے گئے تھے، پیرس دراصل کانفرنس کے دوران ایک عالمی حکومت کا مرکز تھا، جس نے یورپ کے سیاسی جغرافیہ میں ہونے والی بڑی تبدیلیوں پر غور و خوض کیا اور ان پر عمل درآمد کیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ورسائی معاہدے نے جرمن فوج کو کمزور کر دیا اور جنگ اور مہنگے معاوضوں کا پورا الزام جرمنی کے کندھوں پر ڈال دیا، اور بعد میں جرمنی میں ہونے

والی تذلیل اور ناراضگی کو اکثر مؤرخین نازی پارٹی کی انتخابی کامیابیوں کی ایک براہ راست وجہ اور دوسری عالمی جنگ کی ایک بالواسطہ وجہ کے طور پر سمجھتے ہیں۔ ورسائی معاہدے کے بعد مختلف چھوٹے معاہدے ہوئے، جن کا مختصر طور پر ذکر نیچے کیا گیا ہے۔

4.2.2 سینٹ جرمین معاہدہ (Treaty of Saint-Germain)

اس پر 10 ستمبر 1919 کو اتحادیوں اور جمہوریہ آسٹریا نے دستخط کیے تھے۔ اس کے اہم نکات درج ذیل تھے:

- معاہدے کے تحت کہ آسٹرو ہنگری سلطنت کو تحلیل کیا جانا تھا۔
- آرٹیکل 177 کے مطابق، آسٹریا نے مرکزی طاقتوں کے ساتھ مل کر جنگ کی ذمہ داری قبول کی۔
- جمہوریہ آسٹریا نے ہنگری، چیکوسلوواکیا، پولینڈ، یوگوسلاویہ، سرب، کروٹس اور سلووینیوں کی سلطنت کی آزادی کو تسلیم کیا۔
- معاہدے کے تحت آسٹریا کو اپنی جنگ سے پہلے کی سلطنت کا ساٹھ فیصد سے زائد علاقہ کھونا پڑا۔

4.2.3 نیولی معاہدہ (Treaty of Neuilly)

نیولی معاہدہ 27 نومبر 1919 کو اتحادی قوتوں اور بلغاریہ کے درمیان دستخط ہوا۔

- جنوبی ڈوبروجا رومانیہ کو دیا گیا (حالانکہ وہاں بہت کم تعداد میں رومانیہ باشندے رہتے تھے)، جبکہ مغربی تھریس یونان کو دیا گیا تھا۔
- بلغاریہ نے یونان، یوگوسلاویہ اور رومانیہ کا علاقہ کھو دیا۔
- بلغاریہ کو اپنا ایجیئن ساحل یونان کے حوالے کرنے پر مجبور کیا گیا۔
- انہیں اپنی فوج کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس ہزار تک محدود کرنی پڑی۔
- انہیں چار سو ملین ڈالر سے زیادہ کا معاوضہ ادا کرنا پڑا، حالانکہ اس میں سے پچھتر فیصد (75%) بعد میں معاف کر دیا گیا۔
- انہیں یوگوسلاویہ کے وجود کو تسلیم کرنا پڑا۔

4.2.4 ٹرائینن معاہدہ (Treaty of Trianon)

یہ معاہدہ 4 جون 1920 کو اتحادیوں اور ہنگری کے درمیان ہوا، جو مرکزی طاقتوں میں سے ایک شکست خوردہ ملک تھا۔ معاہدے کی شرائط کے مطابق، ہنگری کے رقبے اور آبادی میں کمی کی گئی۔ اس کا مقصد وسطی یورپ میں سرحدوں کا از سر نو تعین کرنا تھا۔ اس معاہدے کے ہنگری پر گہرے اثرات مرتب ہوئے، جس کے نتیجے میں اسے بڑے علاقائی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا اور خطے کی سیاسی صورتحال کو از سرِ نو تشکیل دی گئی۔ اس کی اہم شرائط یہ تھیں:

- علاقائی نقصانات: ہنگری نے اپنے تقریباً دو تہائی اور نصف سے زیادہ آبادی کو کھو دیا۔ ان علاقوں کو پڑوسی ممالک میں تقسیم کیا گیا:
- ٹرانسلوانیا رومانیہ کو دے دیا گیا۔
- سلوواکیہ اور روتھینیا چیکوسلوواکیہ کو دیے گئے۔

- کروشیا اور سلاوونیا سرب، کروٹ اور سلووینیوں کی مملکت (بعد میں یوگوسلاویہ) کا حصہ بن گئے۔
- برجن لینڈ آسٹریا کو دے دیا گیا۔

اس معاہدے نے لاکھوں نسلی ہنگریوں کو متاثر کیا، جو اچانک ہنگری کی نئی سرحدوں سے باہر رہ گئے۔ بہت سے لوگ نئی تشکیل شدہ یا توسیع شدہ ریاستوں میں اقلیت بن گئے، جس کی وجہ سے اقلیتوں کے حقوق پر تناؤ پیدا ہوا جو دہائیوں تک جاری رہا۔ ہنگری کی فوج کو صرف پینتیس ہزار رضاکاروں تک محدود کر دیا گیا، جبری بھرتی کی اجازت نہیں تھی۔ بھاری اسلحہ، ٹینک اور فضائیہ پر پابندی عائد کی گئی۔

4.2.5 سیورے معاہدہ (Treaty of Sèvres)

یہ معاہدہ اگست 1920 میں اتحادیوں اور ترکی کے درمیان ہوا۔ اس معاہدے کے تحت ترکی سے عثمانی سلطنت چھین لی گئی۔ اس معاہدے کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

- یونان کو ترکی کے کافی بڑے علاقے دے دیے گئے، مثال کے طور پر مشرقی تھریس اور سمرنا۔
- اٹلی کو بھی ترکی کے کچھ علاقے دیے گئے۔
- درہ دانیال (جو بحیرہ اسود سے نکلنے کا راستہ فراہم کرتی تھی) کو مستقل طور پر کھول دیا گیا۔
- سلطنت عثمانیہ کے کچھ علاقوں کو منڈیٹ میں تبدیل کر کے برطانیہ اور فرانس کے حوالے کر دیا گیا۔
- شام فرانسیسی منڈیٹ بن گیا، جبکہ برطانوی منڈیٹ میں ٹرانس جارڈن، عراق اور فلسطین شامل تھے۔

4.3 مینڈیٹ نظام (The Mandate System)

1919 کی پیرس امن کانفرنس کے ذریعے قائم کیا گیا مینڈیٹ نظام ایک ایسا طریقہ کار تھا جس کے تحت فاتح اتحادی طاقتوں نے شکست خوردہ مرکزی طاقتوں، خاص طور پر سلطنت عثمانیہ اور جرمنی کی سابقہ ملکیت والی علاقوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ یہ مینڈیٹ ایسے علاقے تھے جنہیں ابھی خود حکومت کرنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا، اور مجلسِ اقوام کو ان کی انتظامیہ کی نگرانی کی ذمہ داری دی گئی جب تک کہ انہیں خود مختاری کے قابل نہ سمجھا جائے۔ مینڈیٹ نظام کا مقصد ان سابقہ نوآبادیوں اور علاقوں کا انتظام اور ترقی کرنا تھا، تاکہ ان لوگوں کے مفادات کے تحت انہیں خود حکومتی نظام کے لیے تیار کیا جا سکے۔ اسے نوآبادیاتی نظام کا ایک اخلاقی متبادل پیش کیا گیا تھا، حالانکہ عملی طور پر یہ اکثر نوآبادیاتی کنٹرول کو جاری رکھتا تھا۔ مجلسِ اقوام کو ان مینڈیٹ کی انتظامیہ کی نگرانی کرنے کی ذمہ داری دی گئی، جنہیں تین زمروں میں تقسیم کیا گیا:

فہرست اول مینڈیٹ: یہ وہ علاقے تھے جنہیں تقریباً آزادی کے لیے تیار سمجھا جاتا تھا لیکن انہیں عارضی نگرانی کی ضرورت تھی۔ یہ زیادہ تر مشرق وسطیٰ میں تھے اور ان میں شامل تھے:

1. عراق (برطانیہ کے زیر انتظام)

2. فلسطین (بشمولِ جدید اردن، برطانیہ کے زیر انتظام)

3. شام اور لبنان (فرانس کے زیر انتظام)

فہرست دوم مینڈیٹ: یہ ایسے علاقے تھے جو افریقہ میں تھے اور جنہیں کم ترقی یافتہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے ان میں زیادہ براہ راست کنٹرول کی ضرورت تھی۔ مینڈیٹ رکھنے والوں کو مقامی آبادیوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کو یقینی بنانا تھا، سخت ضابطوں کے ساتھ وسائل یا لوگوں کے استحصال پر پابندی تھی، ان میں شامل تھے:

1. تنگانیکا (برطانیہ کے زیر انتظام)

2. روانڈا-ارونڈی (بیلجیئم کے زیر انتظام)

3. کیمرون اور ٹوگو (برطانوی اور فرانسیسی کنٹرول میں تقسیم)

فہرست سوم مینڈیٹ: یہ سب سے کم ترقی یافتہ علاقے سمجھے جاتے تھے اور انہیں مینڈیٹ رکھنے والوں کو اپنے علاقوں کے حصے کے طور پر چلانا تھا۔ ان میں شامل تھے:

1. جنوب مغربی افریقہ (جنوبی افریقہ کے زیر انتظام)

2. نیو گنی (آسٹریلیا کے زیر انتظام)

3. مختلف بحر الکاہل کے جزائر، جیسے ساموآ (نیوزی لینڈ کے زیر انتظام) اور دیگر جزائر جاپان کے زیر انتظام۔

مینڈیٹ نظام کا باضابطہ مقصد ان علاقوں کی ترقی کو فروغ دینا تھا اور محافظ کی حیثیت سے کام کرنا تھا، تاکہ انہیں آخر کار آزادی کے لیے تیار کیا جا سکے۔ تاہم، عملی طور پر، مینڈیٹ نظام کو اکثر سامراجیت کی ایک چھپی ہوئی شکل کے طور پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ مثال کے طور پر فلسطین میں، برطانوی مینڈیٹ کو یہودی اور عرب آبادیوں سے کیے گئے متضاد وعدوں کی وجہ سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، جس سے طویل مدتی عدم استحکام پیدا ہوا۔ اسی طرح افریقہ میں زیادہ تر نوآبادیوں کی طرح یہاں بھی نوآبادیاتی طرزِ نظام قائم کیا گیا، جس میں خود مختاری کے حصول کی سمت میں بہت کم پیش رفت ہوئی۔ بہت سے علاقوں نے جو مینڈیٹ کے تحت تھے، دوسری عالمی جنگ کے بعد بالآخر آزادی حاصل کی، لیکن مینڈیٹ دورِ نظام کے دوران بنائی گئی سرحدیں اور نوآبادیاتی طرز کی انتظامیہ نے تنازعات اور عدم استحکام کی میراث چھوڑ دی۔ مثال کے طور پر، مشرق وسطیٰ میں فہرست اول کے مینڈیٹ کے تحت کھینچی گئی سرحدوں نے عراق، شام، اور فلسطین/اسرائیل جیسے مقامات میں جاری تنازعات اور کشیدگی میں اضافہ کیا۔

مینڈیٹ نظام، اگرچہ ایک زیادہ اخلاقی طرز حکمرانی کے طور پر تیار کیا گیا تھا، لیکن اس نے اکثر وہی نوآبادیاتی مسائل کو جاری رکھا، جن میں استحصال اور مقامی خود ارادیت کی کمی شامل تھی۔ خلاصہ میں، 1919 کی پیرس امن کانفرنس کا مینڈیٹ نظام پہلی عالمی جنگ کے بعد ایک اہم پیش رفت تھی، جس کا مشرق وسطیٰ، افریقہ اور بحر الکاہل کے علاقوں کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ اگرچہ اس کا مقصد ان علاقوں کو آزادی

کی طرف لے جاتا تھا، لیکن اسے اکثر بین الاقوامی نگرانی کے بہانے سامراجی کنٹرول کو بڑھانے کے لیے تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔

4.4 پیرس امن کانفرنس کی اہمیت (Significance of the Paris Peace Conference)

کانفرنس کا ایک اہم نتیجہ اقوام متحدہ (League of Nations) کا قیام تھا، جو ایک بین الاقوامی تنظیم تھی جس کا مقصد امن کو برقرار رکھنا اور مستقبل کی جنگوں کو روکنا تھا۔ اس تنظیم کی بنیاد اجتماعی سلامتی پر رکھی گئی تھی، جہاں رکن ریاستیں مل کر امن کو خطرے میں ڈالنے والے عوامل کا مقابلہ کرتیں۔ مجلسِ اقوام پہلی ایسی عالمی تنظیم تھی جس کا مقصد اقوام کے درمیان سفارتکاری اور تعاون کو فروغ دینا تھا۔ تاہم، مجلسِ اقوام میں کئی خامیاں موجود تھیں۔ امریکی صدر ولسن کی بھرپور حمایت کے باوجود، امریکہ نے اس میں شمولیت اختیار نہیں کی کیونکہ امریکی سینیٹ نے معاہدہ ورسائے کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ امریکہ کی عدم موجودگی، مجلسِ اقوام کے نفاذ کے طریقہ کار کی کمی، اور 1930 کی دہائی میں بڑی طاقتوں کی جارحیت کو روکنے میں ناکامی نے اس کی مؤثریت کو محدود کر دیا۔

پیرس امن کانفرنس 1919 ایک تاریخی واقعہ تھا جس نے پہلی عالمی جنگ کے بعد عالمی سیاسی منظر نامے کو نئی شکل دی۔ یہ کانفرنس 18 جنوری 1919 سے 21 جنوری 1920 تک جاری رہی اور اس کا مقصد شکست خوردہ مرکزی طاقتوں کے لیے امن کی شرائط طے کرنا اور ایک نئے بین الاقوامی نظام کی بنیاد رکھنا تھا۔ یہ کانفرنس کئی معاہدوں پر اختتام پذیر ہوئی، جس میں سب سے مشہور معاہدہ ورسائے (The Treaty of Versailles) تھا، لیکن اس کی اہمیت ان دستاویزات سے کہیں زیادہ ہے۔ پیرس امن کانفرنس نے خاص طور پر یورپ اور مشرق وسطیٰ میں سرحدوں کو نمایاں طور پر تبدیل کر دیا۔ آسٹریا-ہنگری، عثمانی، جرمن اور روسی سلطنتوں کے زوال نے ایک طاقت کا خلاء پیدا کر دیا، جسے فاتح اتحادی طاقتوں نے حقِ خودارادیت کے اصول پر مبنی نئی ریاستوں کی تخلیق کے ذریعے پُر کرنے کی کوشش کی۔ معاہدہ سینٹ جرمین (1919) اور ٹریانون (1920) نے آسٹریا-ہنگری کی سلطنت کو تحلیل کر دیا، جس کے نتیجے میں چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، اور ہنگری جیسی نئی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ مشرق وسطیٰ میں، معاہدہ سیوریس (1920) کے تحت عثمانی سلطنت کو تقسیم کر دیا گیا، جس میں عراق، فلسطین اور شام جیسے علاقے برطانوی اور فرانسیسی مینڈیٹ کے تحت رکھے گئے۔ خاص طور پر مشرق وسطیٰ میں سرحدوں کی یہ نئی تقسیم مستقبل کے تنازعات کا باعث بنی، کیونکہ ان ریاستوں کی تخلیق میں اکثر نسلی اور فرقہ وارانہ تقسیم کو نظرانداز کیا گیا۔

حق خودارادیت کا تصور، جسے امریکی صدر ووڈرو ولسن نے آگے بڑھایا، پیرس امن کانفرنس کے اہم فلسفیانہ اصولوں میں سے ایک تھا۔ ولسن کے چودہ نکات میں ایک ایسی دنیا کا تصور پیش کیا گیا تھا جہاں لوگوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ خود اپنی حکومت تشکیل دیں، بجائے اس کے کہ وہ دور دراز کی سلطنتوں کے ماتحت رہیں۔ حق خودارادیت کے اثرات یورپ سے باہر بھی نظر آتا ہے۔ اس کا اثر آئرشوں، ہندوستانیوں، مصریوں جیسے نوآبادیات کے قوم پرستوں پر پڑا۔ برطانوی فورسز کے خلاف آئرش آرمی کی جنگ کے بعد ایک مسلسل مہم کے نتیجے میں 1920 میں آئرلینڈ کو جنوب میں آئرش آزاد ریاست بنا دی گئی۔ انڈین نیشنل کانگریس، جو اصل میں برطانیہ کے ساتھ بات چیت کو فروغ دینے کے لیے قائم کی گئی تھی، نے بھی جنگ کے بعد خودمختاری کے لیے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ موہن داس گاندھی (1869-

1948) کی قیادت میں، رولٹ ایکٹ (1919) اور امرتسر کے قتل عام (1919) سے مایوس ہو کر، اس نے برطانیہ کو ہندوستان چھوڑنے کی ترغیب دینے کے لیے عدم تعاون کی مہم کا پہلا سلسلہ شروع کیا۔ اسی طرح مصر میں مارچ 1919 میں تین سال تک وسیع پیمانے پر برطانوی مخالف تشدد کا آغاز ہوا، اس سے پہلے کہ برطانیہ نے 1922 میں جزوی آزادی نافذ کی۔ تاہم، حق خودارادیت کا اصول کا اطلاق غیر متوازن تھا۔ اگرچہ اس نے یورپ میں پولینڈ، فن لینڈ اور بالٹک ریاستوں جیسی نئ قوموں کے قیام کی راہ ہموار کی، لیکن اسے یورپی طاقتوں کی نوآبادیات میں زیادہ تر نظر انداز کیا گیا۔ اس انتخابی اطلاق نے افریقہ، ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے نوآبادیاتی عوام میں بے چینی پیدا کی، جس نے مستقبل میں نوآبادیت سے آزادی کی تحریکوں میں اہم کردار ادا کیا۔

پیرس امن کانفرنس کے بعد کی دنیا، 1914 کی دنیا سے مختلف تھی ایک نیا عالمی نظام شروع ہوا۔ امریکہ نے جنگ اور امن سازی میں فیصلہ کن مداخلتیں کیں۔ مشرقی اور وسطی یورپ اور مشرق وسطیٰ پر صدیوں سے حکمرانی کرنے والی چار عظیم سلطنتیں منہدم ہو چکی تھیں۔ نومبر 1918 میں، آسٹریا کے شہنشاہ چارلس اول (1887-1922) اپنی سلطنت کے ٹوٹنے کے بعد دستبردار ہو گئے، جبکہ جرمنی جمہوریہ بن گیا کیونکہ جرمن شہنشاہ ولہیم دوم (1859-1941) نے تخت چھوڑ دیا، حالانکہ رومانویوں خاندان کے برعکس، ہابسبورگ اور ہوہنزولرن شاہی خاندان بچ گئے۔ سلطنت عثمانیہ، اپنی مشرق وسطیٰ کی زمینوں سے محروم ہو گئ، یہاں تک کہ قابض یونانی افواج کے خلاف کامیاب مہم کے بعد مصطفیٰ کمال (1881-1938) نے ترکی کے سلطان کا تختہ الٹ دیا اور 1922 میں ترکی کی نئ سیکولر ریاست قائم کی۔

4.5 معاوضے (Reparations)

1919 کی پیرس امن کانفرنس کے بعد جرمنی پر عائد کی جانے والی معاوضے کی رقم، خاص طور پر ورسائی معاہدے کے تحت، معاہدوں کے سب سے متنازعہ پہلوؤں میں سے ایک تھی۔ ان معاوضوں کا مقصد جرمنی کو اتحادی طاقتوں کو پہلی عالمی جنگ کے دوران انسانی نقصان اور معاشی نقصان دونوں کے لحاظ سے ہونے والی بے پناہ تباہی کا معاوضہ دینا تھا۔ مشہور مصنف کینز (Keynes) اور بعد کے کئ مصنفین نے معاوضے کے تصفیے کی مذمت کی۔ جنگ کے دوران کی تقاریر میں ولسن اور لائیڈ جارج نے معاوضے کے حصول کو مسترد کر دیا تھا۔ تاہم جنگ بندی کے بعد اتحادیوں نے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ بیلجیم اور فرانس زیادہ تر ادائیگیاں وصول کریں گے کیونکہ برطانیہ کو نسبتاً کم براہ راست نقصان پہنچا تھا۔ پیرس میں، جب کلیمنسو اور لائیڈ جارج اس بات پر بضد تھے کہ وہ مکمل معاوضہ حاصل کرنے کے حقدار ہیں اور ولسن اس بات پر زور دے رہے تھے کہ وہ نہیں ہیں، تو ایک بحران کا سامنا ہوا۔ اس کا حل اس تدبیر کے ذریعے کیا گیا جو غیر ارادی نتائج سے بھرپور تھا—معاہدے کے آرٹیکل 231 اور 232 جس نے اتحادیوں کو جرمنی (اور اس کے اتحادی) سے ان کے تمام نقصانات کے معاوضے کے اخلاقی حق پر زور دیا کیونکہ جرمنی (اور اس کے اتحادی)) جنگ کے ذمہ دار تھے۔

ابتدائی طور پر معاہدے میں معاوضے کی رقم واضح طور پر درج نہیں کی گئی تھی، جس کی وجہ سے غیر یقینی صورتحال پیدا ہوئی۔ تلافی کمیشن (Reparation Commission) نے یہ تعین کیا کہ جرمنی کو تقریباً 33 ارب امریکی ڈالر ادا کرنے ہوں گے، جو کہ

جرمنی کی جنگ کے بعد کی اقتصادی حالت کے پیش نظر ایک بھاری رقم تھی۔ جرمنی کو صرف پیسوں میں نہیں بلکہ کوئلہ، اسٹیل، لکڑی اور دیگر اشیاء کی شکل میں بھی ادائیگی کرنا تھی۔ اس کا مقصد اتحادی ممالک کی معیشت کو دوبارہ تعمیر کرنے میں مدد کرنا تھا، خاص طور پر فرانس اور بیلجیئم کو، جو جنگ کے دوران شدید جسمانی نقصان کا شکار ہوئے تھے۔ بھاری معاوضے کا یہ بوجھ جرمنی کی پہلے سے مشکل میں مبتلا معیشت کو تباہی کے دہانے پر لے آیا اور 1920 کی دہائی کے اوائل میں شدید مہنگائی کا باعث بنا۔

اتحادی طاقتوں نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ اصل معاوضے کے مطالبات ناقابل عمل ہیں، اس لیے 1924 میں ڈاؤس پلان (Dawes Plan) پیش کیا گیا تاکہ جرمنی کی ادائیگیوں کو دوبارہ منظم کیا جا سکے اور اس کی معیشت کو مستحکم کرنے کے لیے غیر ملکی قرضوں کی سہولت فراہم کی جا سکے۔ بعد ازاں 1929 میں ینگ پلان (Young Plan-1929) نے مجموعی معاوضے کی رقم کو مزید کم کیا اور ادائیگی کی مدت کو بڑھا دیا، تاہم عظیم مالی بحران 1929 کی وجہ سے یہ کوششیں ناکام ہو گئیں۔ جرمنی کی جانب سے معاوضے کی ادائیگی میں ناکامی نے اقتصادی عدم استحکام اور عوام میں غصے کو جنم دیا۔ اس مالی پریشانی نے انتہا پسند تحریکوں، خصوصاً ایڈولف ہٹلر اور نازی پارٹی کے عروج کے لیے راہ ہموار کی، جنہوں نے معاوضے کے خلاف وسیع پیمانے پر پائے جانے والے غصے سے فائدہ اٹھایا۔

جرمنی نے تقریباً 1.1 بلین پاؤنڈ ادا کرنے کے بعد 1932 میں اپنے معاوضے کی ذمہ داریوں پر نادہندگی کی، جس میں قسم کی ترسیل بھی شامل تھی۔ اس دوران، 1924 سے 1930 کے درمیان، غیر ملکی سرمایہ کاروں نے، جن میں زیادہ تر امریکی تھے، نے اسے تقریباً 1.27 بلین پاؤنڈ قرض دیا، جس میں سے زیادہ تر ایڈولف ہٹلر (1889-1945) نے واپس کرنے سے انکار کر دیا، جس سے جرمنی کو امریکی "معاوضہ" کی تجویز پیش کی گئی۔ جرمنی کے برعکس، اتحادیوں نے بھاری تعمیر نو کے اخراجات اور 3.7 ارب ڈالر کے کافی بیرونی قرضوں کا سامنا کرتے ہوئے، جن میں سے 2.96 ارب امریکہ کے مقروض تھے، انہوں نے جرمنی کی ذمہ داریوں کو کم کرنے کے بدلے میں آپس کے قرضوں کی مجموعی منسوخی کی تجویز پیش کی لیکن امریکہ نے اس دلیل کو مسترد کیا۔

باہم منسلک قرضے اور معاوضے 1920 کی دہائی کی مالی اور اقتصادی الجھنوں کا سبب بنے جو اکتوبر 1929 میں 'عظیم مالی بحران' (The Great Depression-1929) کا حصہ بنا۔ جرمن قوم پرستوں نے جنگ کی خصوصی ذمہ داری کی اپنی تشریح کو معاہدے کے خلاف اپنی جدوجہد میں مؤثر طریقے سے استعمال کیا۔ سبھی متفق تھے کہ کچھ معاوضہ دینا چاہیے، لیکن عوامی توقعات کے دباؤ نے کسی باہمی طور پر قابل قبول رقم کا تعین ناممکن بنا دیا اور اتحادیوں نے اپنی معاوضے کی دلیل کو اپنے شاطر رویے سے خراب کر دیا۔ آخر کار، اگرچہ معاوضے کا مقصد جرمنی کو جوابدہ بنانا اور جنگ کے بعد کی بحالی میں مدد دینا تھا، لیکن اتحادی طاقتوں کی سخت نوعیت، اور معاہدے کے دیگر پہلوؤں نے جرمنی کو غیر مستحکم کیا اور ان سیاسی و اقتصادی حالات کو جنم دیا جنہوں نے بالآخر دوسری عالمی جنگ کا سبب بنا۔

4.6 پیرس امن معاہدے پر تنقید (Critique of the Paris Peace Treaty)

پیرس امن کانفرنس کی میراث متنازع ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ ورسائی کے معاہدے کی تعزیراتی شرائط جرمنی کے لیے بہت سخت

تھیں، جس سے ایسی صورتحال پیدا ہوئی جس نے تقریباً ایک اور عالمی جنگ کو ناگزیر بنا دیا۔ برطانوی ماہر اقتصادیات جان مینارڈ کینز، جو اس کانفرنس میں شریک تھے، نے اپنی کتاب *The Economic Consequences of the Peace* میں ورسائی معاہدے کی اقتصادی دفعات پر تنقید کی اور یہ پیشنگوئی کی کہ ان معاوضوں کے یورپی معیشت پر تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔ مزید برآں، کانفرنس میں کیے گئے فیصلوں نے دنیا بھر میں ناراضگی کے بیج بوئے۔ مثال کے طور پر، مشرق وسطیٰ میں سرحدوں کی من مانی لکیر کشی اور یورپی منڈیٹ کے قیام نے مقامی حرکیات کو نظرانداز کر دیا، جس سے مستقبل میں جاری رہنے والے تنازعات کی بنیاد رکھی گئی۔ ایشیا میں، جاپان نے مغربی طاقتوں کی طرف سے نظرانداز کیے جانے کو محسوس کیا، جس سے قوم پرستانہ ناراضگی پیدا ہوئی جو بعد میں اس کی سامراجی امنگوں میں ظاہر ہوئی۔

ورسائی معاہدے پر اکثر جرمنی کے لیے غیر ضروری طور پر سزا دینے والے اقدامات کے لیے تنقید کی جاتی ہے، جس سے مستقبل کے تنازعے کے بیج بوئے گئے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ معاضے کی ادائیگیوں اور علاقائی نقصانات نے 1920 اور 1930 کی دہائیوں میں جرمنی میں اقتصادی اور سیاسی عدم استحکام سے دوچار کیا، جس سے ایڈولف ہٹلر اور نازی پارٹی کے عروج میں مدد ملی۔ خاص طور پر جنگی جرم کی شق کو جرمنوں کے لیے ذلت آمیز سمجھا گیا، جس نے قوم پرستانوں کی ناراضگی کو ہوا دی۔ اگرچہ معاہدے کا مقصد امن پر مبنی ایک نیا عالمی نظام بنانا تھا، لیکن یہ بہت سے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہا، جیسے کہ مشرقی یورپ اور بلقان میں نسلی اور قومی کشیدگیاں۔ بہت سی نئی بنائی گئی ریاستوں، جیسے کہ چیکوسلواکیہ اور یوگوسلاویہ، میں بڑی اقلیتی آبادی تھی، جس سے اندرونی عدم استحکام اور مستقبل کے تنازعات پیدا ہوئے۔ اگرچہ حق خودارادیت کا اصول یورپ پر لاگو کیا گیا تھا، لیکن اسے افریقہ، ایشیا اور مشرق وسطیٰ کی نوآبادیوں تک نہیں بڑھایا گیا۔ مینڈیٹ کے نظام کے ذریعے بہت سے علاقوں کو اتحادیوں کے کنٹرول میں رکھا گیا، جس کے نتیجے میں سامراجی تسلط اور آزادی کے لیے مستقبل کی جدوجہد جاری رہی۔

اتحادیوں، خاص طور پر فرانس اور برطانیہ پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے منصفانہ اور پائیدار امن قائم کرنے کے بجائے اپنے قومی مفادات کا تعاقب کیا۔ فرانس، جارجز کلیمینسو کی قیادت میں، اپنی سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے جرمنی کو کمزور کرنے پر مرکوز تھا۔ برطانویوں کا مقصد اپنی سلطنت کو محفوظ رکھنا اور بالشوزم (1917) کے پھیلاؤ کو محدود کرنا تھا۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ ولسن کے چودہ نکات کی مثالی حیثیت ان متضاد مفادات کی وجہ سے سمجھوتہ کا شکار ہوئی۔ اگرچہ صدر ولسن نے معاہدے پر بات چیت میں مرکزی کردار ادا کیا اور مجلسِ اقوام کی حمایت کی، لیکن امریکی سینیٹ نے آخرکار ورسائی معاہدے کی توثیق سے انکار کر دیا۔ اس سے لیگ اور معاہدے کے وسیع تر اہداف کو نقصان پہنچا۔ امریکی شمولیت کے بغیر، مجلسِ اقوام کے پاس اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے اختیار اور فوجی حمایت کی کمی تھی۔

کچھ مورخین نے اس بات پر بحث کی کہ آیا یہ معاہدہ اتنا ہی غیر منصفانہ تھا جتنا کہ ناقدین نے تجویز کیا تھا۔ اور کچھ مورخین کا یہ بھی ماننا ہے کہ جرمنی کی شکایات کو بڑھا چڑھا کر پیش کی گئیں اور یہ کہ معاوضے کی ادائیگی مشکل ہونے کے باوجود ناممکن نہیں تھی۔ دوسرے یوں ظاہر کرتے ہیں کہ جرمنی نے 1920 کی دہائی کے آخر تک معاہدے کے اقتصادی اثرات سے نسبتاً تیزی سے بازیافت کیا، جس سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس معاہدے کے بجائے اندرونی سیاسی ناکامیاں بنیادی طور پر جرمنی کے بعد کے عدم استحکام کے لیے ذمہ دار تھیں۔

4.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

بلاآخر پہلی عالمی جنگ مرکزی طاقتوں کی شکست، سلطنتوں کے خاتمے، اور نئی سیاسی قوتوں کی مداخلت کے ساتھ ختم ہوئی۔ 1919 کی پیرس امن کانفرنس بیسویں صدی کی عالمی نظام کی تشکیل میں ایک اہم لمحہ تھا۔ اس کا مقصد پہلی عالمی جنگ کی تباہی کے بعد ایک دیرپا امن قائم کرنا تھا، اور ان چیلنجوں سے نمٹنا تھا جن کی وجہ سے اس طرح کی وسیع پیمانے پر تباہی ہوئی تھی، حالانکہ اسے مسابقتی قومی مفادات اور جنگ کے بعد کے پیچیدہ نتائج کی وجہ سے بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ معاہدوں کی تعزیری نوعیت، خودارادیت کا انتخابی اطلاق، اور مجلسِ اقوام جیسے نئے بین الاقوامی ڈھانچے کی تشکیل نے ایک مخلوط میراث چھوڑی۔ اگرچہ اس نے عالمی معاملات کو منظم کرنے کی ایک بے مثال کوشش کی نمائندگی کی، لیکن اس کے فیصلوں کے اکثر غیر ارادی نتائج سامنے آئے۔ کانفرنس نے مستقبل کے تنازعات، خاص طور پر دوسری عالمی جنگ، اور قوم پرست تحریکوں کی بنیاد رکھی جو نوآبادیاتی دنیا کو نئی شکل دے گی۔ 1919 کے پیرس امن معاہدے کی میراث پیچیدہ ہے۔ اگرچہ اس نے یورپ کی تشکیل نو کی اور جدید بین الاقوامی سفارتکاری کی بنیاد رکھی، لیکن اس کی ناکامیاں، خاص طور پر جرمنی کے ساتھ تعزیراتی سلوک اور قومی سوالات کا حل نہ ہونا، آمرانہ حکومتوں کے عروج اور دوسری عالمی جنگ کے اسباب میں شامل تھیں۔ پیرس امن کانفرنس اس بات کی ایک طاقتور مثال بنی کہ جب امن معاہدوں کو غیر منصفانہ سمجھا جائے تو وہ نادانستہ طور پر مستقبل کے تنازعات کی بنیاد کیسے رکھ سکتے ہیں۔

4.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

سفارتکاری	: ایک عمل ہے جس میں نمائندوں کے ذریعے مختلف ممالک کے درمیان مذاکرات اور تعلقات کو منظم کیا جاتا ہے۔
جنگ بندی	: جنگ میں مخالف فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ جس کے تحت ایک مخصوص مدت کے لیے لڑائی روک دی جاتی ہے۔
خودارادیت	: وہ عمل جس کے ذریعے ایک ملک اپنی ریاستی حیثیت کا تعین کرتا ہے اور اپنی حکومت تشکیل دیتا ہے۔
معاوضہ/ازالہ/تلافی	: کسی نقصان یا غلطی کے ازالے کے طور پر دیا جانے والا معاوضہ، خصوصاً جنگی نقصانات کے لیے۔
غیر عسکری	: کسی علاقے یا ملک سے فوجی موجودگی، ہتھیاروں یا عسکری صلاحیتوں کو ختم یا کم کرنا۔
عوامی رائے شماری	: عوام سے کسی اہم مسئلے، خاص طور پر خودمختاری یا سیاسی حدود کے حوالے سے، براہِ راست رائے لینے کا عمل۔
مجلسِ اقوام	: یہ 1920 میں پہلی عالمی جنگ کے بعد قائم شدہ پہلی بین الاقوامی تنظیم تھی جس کا مقصد امن و سلامتی کو فروغ دینا تھا۔
اتحادی طاقتیں	: یہ وہ ممالک تھے جو پہلی عالمی جنگ میں فاتح تھے جیسے برطانیہ، فرانس، امریکہ اور اٹلی۔
مرکزی طاقتیں	: یہ وہ ممالک تھے جو پہلی عالمی جنگ میں شکست خوردہ تھے جیسے جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ترکی۔

4.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 1919 میں طے پانے والے پیرس امن معاہدوں کا بنیادی مقصد کیا تھا؟
2. ان چار ممالک کے نام بتائیں جنہوں نے 1919 میں پیرس امن معاہدے میں اہم کردار ادا کیا؟
3. 1919 میں پیرس امن کانفرنس میں شامل "بڑے چار" رہنماؤں کا نام بتایئے؟
4. معاہدہ ورسائی کا آرٹیکل 231 کیا تھا؟
5. معاہدہ ورسائی کے نتیجے میں کون سا علاقہ فرانس کو واپس کر دیا گیا؟
6. امن کو فروغ دینے اور مستقبل میں ہونے والی جنگوں کو روکنے کے لیے معاہدہ ورسائی کے ذریعے کون سی بین الاقوامی تنظیم قائم کی گئی؟
7. ورسائی کے معاہدے کے تحت، کس ملک کو بھاری جنگی معاوضہ ادا کرنا تھا؟
8. پیرس امن کانفرنس اور ورسائل کے معاہدے کے نتیجے میں آسٹریا ہنگری کے ساتھ کیا ہوا؟
9. ریاستہائے متحدہ کی سینیٹ نے ورسائی کے معاہدے کی توثیق سے انکار کیوں کیا؟
10. چودہ نکات اصولوں کا ایک مجموعہ کس نے پیش کیا تھا؟

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پیرس امن کانفرنس سے قبل ہونے والے واقعات کی وضاحت کریں۔
2. پیرس امن کانفرنس کے اہم شرکاء اور ان کے اہداف کا تعارف کروائیں۔
3. حق خودارادیت کے خیال کی وضاحت کریں۔
4. ووڈرو ولسن کے "چودہ نکات" پر مختصراً بحث کریں۔
5. بلقان ریاستوں کے مسئلے کو مختصراً اجاگر کریں۔

4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ورسائی کے معاہدے کی بنیادی دفعات پر تفصیلی گفتگو کریں۔
2. ووڈرو ولسن کے حق خودارادیت کے اصول کے اطلاق کا تجزیہ کریں، کہ اس نے نئ قومی ریاستوں کی تشکیل کو کیسے متاثر کیا، اور اس کے نتیجے میں آنے والے چیلنجز اور کامیابیاں بیان کریں۔
3. پیرس امن کانفرنس کے بیان کردہ اہداف کے حصول میں کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لیں۔

(Suggested Learning Resources) تجویز کردہ اکتسابی مواد 4.10

1. Ferguson, Niall, *The War of the World*: *Twentieth-Century Conflict and the Descent of the West*, Penguin Press, New York, 2006.
2. Hall, Gardner, *The Failure to Prevent World War I*: *The Unexpected Armageddon*, Routledge, 2015.
3. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
4. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
5. Lowe, Norman, *Mastering Modern World History,* Macmillan publishers New York, 2000.
6. Jain & Mathur, *History of Modern World*, Jain Prakashan Mandir, Jaipur, 2018.
7. Jayapalan, N., *History of World Civilization*, Atlantic Publishers & Distributors Pvt. Ltd., India, 2023.
8. Mathur, L.P., *Twentieth Century World,* Pointer Publishers Jaipur, India, 2004.
9. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World,* Mc Graw Hill, New York, 2002.
10. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
11. Rao, B.V., *World History,* Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
12. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
13. Stevenson, David, *The First World War and International Politics*, Oxford University Press, 1988.
14. Winter, Jay ed., *The Cambridge History of the First World War,* Cambridge University Press, 2014 (2016 edn.).

اکائی 5۔ 1917 کا روسی انقلاب اور اس کے نتائج

(Russian Revolution of 1917 and Its Consequences)

اکائی کے اجزاء

5.0 تمہید
5.1 مقاصد
5.2 روس کا مختصر تعارف
5.3 روسی انقلاب
5.4 روس کا پہلا انقلاب
5.5 1917 کے روسی انقلابات کے اسباب
5.5.1 سیاسی اسباب
5.5.2 معاشی اسباب
5.5.3 سماجی اسباب
5.5.4 پہلی عالمی جنگ اور اس کے اثرات
5.5.5 روسی دانشور طبقے کا عروج اور ان کا کردار
5.5.6 انقلابی نظریہ کا ظہور
5.6 1917 کا فروری انقلاب
5.7 عارضی حکومت کی تشکیل اور اس کی چنوتیاں
5.8 اکتوبر/نومبر یا بولشویک انقلاب
5.9 روسی انقلاب کے نتائج
5.10 لینن اور بولشویک انقلاب میں اس کی خدمات

5.11 اکتسابی نتائج
5.12 کلیدی الفاظ
5.13 نمونہ امتحانی سوالات
5.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید (Introduction)

دنیا کے تمام انقلابات میں روس کا انقلاب ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ 19ویں صدی میں اشتراکیت ایک نظریہ اور ایک مقبول تحریک کے طور پر موجود تھا، لیکن اس نے 1917 کے روسی انقلاب کے بعد ہی نظام حکومت کی شکل اختیار کی۔ اسے روس میں لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں بالشویک پارٹی نے برپا کیا جس نتیجے میں یونائیٹڈ اشتراکی سوویت یونین (The USSR) کی بنیاد رکھی گئی۔ روسی انقلاب کا آغاز سماجی تبدیلی کے مقصد سے شروع ہوا اور اس نے عالمی تاریخ میں ایک نیا موڑ بھی دیا۔ اسی لیے بعض مورخین اسے قومی انقلاب کہنے کے بجائے عالمی انقلاب کہنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ 1917ء میں روس میں دو انقلاب برپا ہوئے، ایک مارچ/فروری میں اور دوسرا نومبر کے مہینے میں، ان انقلاب کو بالشویک انقلاب، اکتوبر انقلاب یا سویت انقلاب بھی کہا جاتا ہے۔ ان دو انقلابات کے نتیجے میں روس کی تین سو سال پرانی رومنوف (زار شاہی) خاندان کی جابرانہ بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔ روسی انقلاب کا مطالعہ کئی لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اول تو اس نے دنیا کی سب سے بڑی زار پرست سلطنت کا خاتمہ کیا اور دوسرا یہ کہ اس نے مارکسی نظریات پر مبنی سماجی نظام قائم کرکے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس اکائی میں روس کے انقلاب، انقلاب سے پہلے روس کے حالات، روسی انقلاب کی وجوہات اور اس کے نتائج پر بحث کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- انقلاب روس کے تاریخی پس منظر، اس کے اسباب اور اس کے اہم نتائج کے بارے میں جان سکیں گے۔
- 13ویں صدی سے زار کے دور تک کے واقعات کے مختصر تعارف کو سمجھ سکیں گے۔
- 1905 اور 1917 کے انقلابات کے اسباب، انقلاب کی پیچیدگی اور اس کی ابتداء کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- لینن کے کردار پر تفصیلی بحث سے انقلاب میں اس کی قیادت اور نظریے کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔

5.2 روس کا مختصر تعارف (A Brief Introduction to Russia)

روس کا شمار یورپ کے پسماندہ ترین ممالک میں ہوتا تھا۔ جاگیردارانہ نظام اور یونانی آرتھوڈوکس کلیسا (چرچ) کے چنگل میں پھنسا روسی معاشرہ ترقی سے بہت دور تھا لیکن اس کی عسکری تنظیم میں کچھ ترقی دیکھی جا سکتی تھی۔ قدیم دور سے انیسویں صدی تک روس پر کئی

حکمرانوں نے حکومتیں کیں۔ تیرہویں صدی میں چنگیز خان کی نسل کے زریں خیل منگولوں نے اس پر قبضہ کیا جو بعد میں مسلمان ہو گئے اور اور روس میں عظیم تر سرائے کی سلطنت قائم کی۔ پندرہویں صدی کے اوائل میں تیمور کے حملوں نے زرین خیل منگولوں اور سرائے کی سلطنت کی طاقت کو کچل دیا۔ نتیجتاً اس کے ماتحت جاگیر دار آزاد ہونے لگے۔ ان میں سے ایک مسکووی یا ماسکو ریاست کا شہزادہ ایوان سوم تھا جس نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور آزاد ہونے کا فیصلہ کیا۔ 1493ء میں اس نے روس کے متعدد علاقے فتح کر کے اس کی تنظیم نو کی۔ روس میں اس کی خدمات کی وجہ سے اسے ایوان عظیم بھی کہا جاتا ہے۔ ایوان سوم نے اپنے پوتے ایوان چہارم کو جانشین بنایا اور ایوان چہارم نے خود کو پورے روس کا 'زار' (یونانی قیصر کا روسی مترادف) قرار دے کر روس کو باقاعدہ طور پر ایک سلطنت بنا دیا۔ ایوان چہارم کے بعد، روس عدم استحکام کے دور میں داخل ہوا، جسے 'مشکلات کا وقت' (Time of Troubles) کہا جاتا ہے۔ لیکن 1613 عیسوی میں رومانوف خاندان کے عروج کے ساتھ ہی روس ایک بار پھر مستحکم ہوا اور ایک سلطنت کے طور پر ابھرنے لگا۔ اس طرح چودھویں سے سولہویں صدی تک کا دور ماسکو کے عروج، منگولوں سے آزادی اور روس کی ایک طاقتور ریاست کے طور پر ترقی کا دور تھا، جس نے مزید روسی سلطنت کے قیام کی بنیاد ڈالی۔ سترھویں صدی کے آخر میں روسی حکمران پیٹر نے روسی سلطنت کو طاقتور بنایا۔ ترکی اور سویڈن کو شکست دے کر، اس نے روس کی سرحدوں کو جنوب میں بحیرہ اسود اور مشرق میں بحیرہ بالٹک تک پھیلا دیا۔ اسی دوران پیٹر نے بھیس بدل کر مغربی یورپ کا سفر کر کے جدیدیت اور ترقی کی راہ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ واپس آنے کے بعد، اس نے چرچ کے سرپرست کو معزول کر دیا اور پوری طاقت اپنے ہاتھ میں مرکوز کر لی۔ اس نے روس کو مغربی طرز پر تعمیر کرنا شروع کیا۔ بالٹک ساحل پر سینٹ پیٹرزبرگ (بعد میں پیٹروگراڈ کے نام سے جانا گیا) کے نام سے ایک نیا دارالحکومت بنایا اور لوگوں کو مغربی طرز کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ جب اس کے ایک بیٹے نے اس معاملے میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی تو اسے موت کی سزا دی گئی۔ انہی وجوہات سے پیٹر، عظیم پیٹر کے نام سے مشہور ہوا۔ پیٹر کی موت کے بعد، اس کی بیوی کیتھرین نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کی اور اخلاقیات کی پرواہ کیے بغیر روس کی توسیع کو جاری رکھا۔ اس نے پولینڈ کو تین بار تقسیم کیا اور بالآخر پولینڈ یورپ کے نقشے سے مٹ گیا۔ اس نے کالا ساگر کے ساحل پر زیادہ تر زمین ترکی سے چھین لی۔

فرانس کے انقلاب کا اثر پورے یورپ پر پڑا لیکن روس اس سے اچھوتا رہا۔ نپولین بوناپارٹ نے روس کے خلاف مہم چلائی لیکن اسے پہلے شدید سردی اور پھر روسی حکمران الیگزینڈر کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ الیگزینڈر دوم نے ایک مطلق العنان حکمران ہونے کے باوجود انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں کچھ معمولی اصلاحات کیں مثلاً روس میں بھی پہلی بار نیم غلاموں (جو کاشت کے کاموں میں لگے ہوئے تھے/Serfs) کو 1861 میں آزاد کیا گیا اور 1864 میں مقامی انتظامیہ نظام قائم کیا لیکن معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ بدستور قائم رہا۔ صنعتی انقلاب کے اثرات پورے یورپ میں بڑھ رہے تھے لیکن روس میں صنعتیں ترقی نہیں کر رہی تھیں، لیکن کب تک، شمال مغربی روس میں صنعتوں نے پنپنا شروع کر دیا تھا اور وہاں محنت کش طبقہ منظم ہوتا جا رہا تھا۔ سیاسی شعور بڑھ رہا تھا اور بہت سی خفیہ تنظیمیں بن رہی تھیں اور ان کا مقصد دہشت گردی کے ذریعے آمرانہ حکومت کا خاتمہ تھا۔ صنعت کے فروغ نے روسی معاشرے کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا، ایک طبقہ سرمایہ داروں کا اور دوسرا مزدوروں کا۔ مزدوروں نے اپنے استحصال کے خلاف اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنا شروع کر دیا۔ مزدور طبقہ

نے اشتراکی نظریات کے زیر اثر اپنے لیے انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کا مطالبہ کیا اور 1883 میں کارل مارکس کے ایک پیروجارج پلکنا ف (Georgi Plekhanov) نے روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ 1898 میں ایک دوسری بڑی جماعت روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبرل پارٹی (Russian Social Democratic Labour Party) قائم ہوئی جس میں کئی اور جماعتوں کے علاوہ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی بھی شامل ہو گئی۔ یہ جماعت بعد ازاں دو حصّوں منشویک (Mensheviks) یعنی اقلیت اور بولشویک (Bolsheviks) یعنی اکثریت میں تقسیم ہو گئی۔ بولشیوک کی قیادت لینن نے کی اور منشیوک کی قیادت یوری میترونے کی۔ انہیں دونوں جماعتوں کا روسی انقلاب میں اہم کردار تھا۔ ان جماعتوں کے کچھ دہشت گردی کے واقعات نے زار کو اور بھی غصہ دلایا اور زار نے ان انقلابیوں کو سخت ترین سزائیں دے کر دہشت زدہ بھی کیا لیکن سیاسی شعور ابھرنا شروع ہو چکا تھا۔ روسی عظمت کا کھوکھلا پن 1905 میں ایک چھوٹے سے ملک جاپان کے ہاتھوں روسی افواج کو شکست دینے کے بعد ظاہر ہو چکا تھا۔ 1905 میں پہلی بار زار کو روس میں نمائندہ اسمبلی (ڈوما) بلانی پڑی۔ یہ مستقل ثابت نہ ہو سکی۔ پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو روس جرمنی کے زیر اثر آ گیا۔ غریب روس میں ایک خوفناک معاشی بحران پیدا ہوا۔ اشتراکی پارٹی کے رہنما لینن جلاوطنی میں تھے اور منظم طریقے سے مزدوروں اور انکے قائدین پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ مزدوروں نے 1917ء میں بغاوت کا اعلان کر دیا۔ فوجیوں نے بھی جبر کا ساتھ نہیں دیا اور کارکنوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لینن بیرون ملک سے واپس آیا اور انقلاب کی ذمہ داری سنبھالی اور اکتوبر انقلاب نے روس کو حقیقی عظمت کی راہ پر گامزن کیا۔

5.3 روسی انقلاب (The Russian Revolution)

روسی انقلاب تین اہم مراحل سے گزرا اور اسے مکمل ہونے میں تقریباً 12 برس لگ گئے۔ پہلے مرحلے 1905 میں Duma قائم کی گئی، دوسرے مرحلے 1917 میں جو فروری انقلاب کے نام سے جانا جاتا ہے، ایک عارضی مرکزی حکومت قائم ہوئی اور بالآخر تیسرے مرحلے 1917 میں، جس کو اکتوبر/نومبر انقلاب کے نام سے جانا جاتا ہے، میں عارضی حکومت کی جگہ اشتراکی نظام کی بنیاد ڈالی گئی۔ 1917 کے انقلاب پر گفتگو کرنے سے قبل یہ مناسب ہو گا مختصراً 1905 کے روسی انقلاب کو سمجھ لیا جائے۔

5.4 روس کا پہلا انقلاب (The First Revolution of Russian: 1905)

1905 کا انقلاب زار نکولس دوم کے دور حکومت میں رونما ہوا۔ 1905 کا روسی انقلاب ایک اہم سماجی اور سیاسی تحریک تھی جو روسی سلطنت میں غربت، عدم مساوات اور آمرانہ حکمرانی کے خلاف احتجاج میں اٹھی۔ انقلاب اس وقت شروع ہوا جب فوجیوں نے 22 جنوری 1905 کو سینٹ پیٹرز برگ میں پرامن مظاہرین پر گولیاں چلائیں، جسے "خونی اتوار" کہا جاتا ہے۔ اس واقعے کے بعد ملک بھر میں ہڑتالیں، احتجاج، کسانوں کی بغاوتیں اور فوجی بغاوتیں ہونے لگیں۔ محنت کش طبقے، کسانوں اور متوسط طبقے نے اصلاحات کا مطالبہ کیا اور یہ دباؤ بالآخر زار نکولس دوم کو 'اکتوبر کا منشور' جاری کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس منشور کے تحت روس میں ایک آئین اور ایک قانون ساز ادارہ "ڈوما" (پارلیمنٹ) قائم کیا گیا۔ تاہم، ان اصلاحات نے عوام کے تمام مطالبات کو پورا نہیں کیا، اور نہ ہی زار مکمل طور پر اقتدار سے دستبردار ہوا۔ اس

کے نتیجے میں مسلسل عدم اطمینان اور عدم استحکام پیدا ہوا، جو بالآخر 1917 کے بالشویک انقلاب کا باعث بنا۔

5.5 1917 کے روسی انقلاب کے اسباب (Causes of the Russian Revolution of 1917)

روسی انقلاب کی بنیادی وجوہات میں زار کی حکمرانی کی خود مختاری، سماجی و اقتصادی عدم مساوات، پہلی عالمی جنگ کے دوران بڑھتی ہوئی مشکلات، زرعی اصلاحات کی ناکامی، محنت کشوں کے خراب حالات اور حکومت سے عوامی عدم اطمینان شامل تھے۔ ان وجوہات نے روس میں بڑے پیمانے پر عدم اطمینان اور انقلاب کو جنم دیا۔ جسے ہم تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

5.5.1 سیاسی اسباب (Political Causes)

1917 کے روسی انقلاب کی سیاسی وجوہات بنیادی طور پر زار کی حکمرانی، ناکام سیاسی اصلاحات، اور جنگ میں ناکامی سے وابستہ تھیں۔ زار نکولس دوم کی حکمرانی مکمل طور پر مطلق العنان تھی، جہاں اقتدار مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں مرکوز تھا اور لوگوں کو کوئی بنیادی حقوق حاصل نہیں تھے۔ وہ عوام کے مسائل اور مطالبات سننے سے قاصر تھا، جس کی وجہ سے عوام میں عدم اطمینان بڑھتا جا رہا تھا۔ 1905 کے روسی انقلاب کے بعد، زار نے اختلاف کو کم کرنے کے لیے کچھ اصلاحات کیں، جیسے کہ ڈوما (پارلیمنٹ) کا قیام، لیکن ان اصلاحات میں محدود جمہوریت شامل تھی۔ زار نے ڈوما کو کئی بار تحلیل کیا اور اس کے اختیارات کو محدود کرنے کی کوشش کی، جس سے زار نیکولس پر سے عوام کا اعتماد ختم ہوتا چلا گیا۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ زار جمہوری عمل میں کوئی حقیقی اصلاحات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ عارضی حکومت کی ناکامی بھی ایک اہم وجہ تھی۔ 1917 کے فروری انقلاب کے بعد زار کو معزول کر کے ایک عارضی حکومت قائم کی گئی۔ اس عارضی حکومت کی قیادت الیگزینڈر کیرنسکی کر رہے تھے۔ کیرنسکی ایک اشتراکی اور وکیل تھے اور اس سے قبل ڈوما کے رکن رہ چکے تھے۔ عارضی حکومت کو ابتدا میں بہت سی جماعتوں اور رہنماؤں کی حمایت حاصل تھی، لیکن یہ حکومت روس کے مسائل کو حل نہیں کر سکی، خاص طور پر اس نے روس کو پہلی عالمی جنگ سے نکالنے کی عوامی توقعات کو پورا نہ کر سکی اور ضروری اصلاحات نافذ کرنے میں ناکام رہی۔ حکومت میں انتشار اور فیصلہ سازی کے فقدان نے عوام میں مایوسی اور عدم اطمینان کو مزید بڑھا دیا۔ اس سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے لینن اور اس کی بالشویک پارٹی کو عوامی حمایت حاصل ہوئی۔ بالشویکوں نے عوام کو "روٹی، زمین اور امن" کے نعرے کے ساتھ منظم کیا اور بالآخر عارضی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح آمرانہ حکمرانی، نامکمل سیاسی اصلاحات اور عارضی حکومت کی ناکامی انقلاب روس کی بڑی سیاسی وجوہات بنیں۔

5.5.2 معاشی اسباب (Economic Causes)

1917 کے روسی انقلاب کے معاشی اسباب کا تعلق روس کی پیچیدہ اور غیر مستحکم معاشی صورتحال سے تھا، جو برسوں کی عدم مساوات، غربت اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا نتیجہ تھی۔ روس کی معیشت کا انحصار بنیادی طور پر زراعت پر تھا لیکن زرعی نظام انتہائی غیر منظم اور استحصالی تھا۔ کسانوں کے پاس کافی زمین نہیں تھی، اور زیادہ تر زرخیز زمین اشرافیہ اور جاگیرداروں کی ملکیت تھی۔ اس عدم مساوات نے کسانوں میں گہرا عدم اطمینان پیدا کیا، کیونکہ انہیں سخت محنت کے باوجود غربت اور بھوک کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کسانوں کو جاگیرداروں

اور اشرافیہ کے مظالم کا سامنا بھی کرنا پڑا اور ان پر ٹیکسوں کا بوجھ بھی بہت زیادہ تھا، جس کی وجہ سے ان کی معاشی حالت ابتر ہوتی گئی۔

صنعتی شعبے میں بھی صورتحال بہتر نہیں تھی۔ روس نے 19ویں صدی کے آخر میں صنعت کاری کا عمل شروع کیا، لیکن یہ مغربی یورپ کے مقابلے میں بہت سست رہا۔ ان سب کے باوجود صنعتی ترقی کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی سرمایہ کاری پر مبنی تھا، جس سے معیشت پر بیرونی طاقتوں کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہوا۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مزدوروں کو کئی کئی گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا، لیکن اجرت کم تھی، اور کام کی جگہ پر حالات بہت خراب تھے۔ ان حالات نے محنت کش طبقے کو ناراض کر دیا اور انہوں نے اپنے حقوق اور بہتر زندگی کے لیے منظم تنظیمیں قائم کیں اور تحریک چلانے کے لیے آمادہ ہوئے۔ مزید برآں، صنعتی ترقی کے ثمرات عام لوگوں تک نہیں پہنچے، بلکہ اشرافیہ طبقے اور سرمایہ داروں نے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ نتیجتاً امیر اور غریب کے درمیان خلیج بڑھتی گئی۔ متوسط طبقہ جو آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، نے بھی اصلاحات کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا، کیونکہ سماجی اور معاشی عدم مساوات ان کے لیے ناقابل قبول تھی۔

پہلی عالمی جنگ نے روس کے معاشی مسائل کو مزید سنگین بنا دیا۔ جنگ کے دوران روس کو کئی محاذوں پر شکست کا سامنا کرنا پڑا جس سے اس کے وسائل پر بہت دباؤ پڑا۔ فوجیوں کو خوراک، ہتھیار اور لباس کی فراہمی مشکل ہو گئی، جس سے ملکی معیشت متاثر ہوئی۔ عام لوگوں کو اشیائے ضروریہ کی قلت کا سامنا کرنا پڑا اور جنگی اخراجات کی وجہ سے حکومت کو ٹیکسوں میں اضافہ کرنا پڑا۔ مہنگائی آسمان کو چھونے لگی اور بے روزگاری بڑھ گئی۔ بازاروں میں اناج کی شدید قلت تھی جس سے عام لوگوں کا جینا محال ہو گیا تھا۔ جنگ کی ناکامیوں اور معاشی بحران نے نہ صرف عام لوگوں کے بلکہ فوج کے حوصلے پست کر دیے۔ جنگ میں شامل فوجیوں نے انتہائی تھکاوٹ اور خراب حالات کی وجہ سے حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ ان کے خاندان بھی بھوک اور غربت سے نبرد آزما تھے، جس کی وجہ سے فوجیوں نے جنگ سے دستبرداری اور حکومت کی تبدیلی کا مطالبہ کیا۔

بالشویک پارٹی نے اس معاشی عدم استحکام کا فائدہ اٹھایا۔ ولادیمیر لینن کی قیادت میں بالشویکوں نے عوام کو "روٹی، زمین اور امن" کا نعرہ دیا جو اس وقت کے روس کے لوگوں کے بنیادی مطالبات کی عکاسی کرتا تھا۔ انہوں نے کسانوں کو زمین کے حقوق، مزدوروں کو بہتر حالات دینے اور جنگ سے باہر نکلنے کا وعدہ کیا۔ اس نعرے نے کسانوں، مزدوروں اور سپاہیوں کو بالشویکوں کے ساتھ جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح، زمینی عدم مساوات، صنعتی عدم اطمینان، غربت، مہنگائی، بے روزگاری، اور جنگ کی وجہ سے پیدا ہونے والے معاشی بحران نے روسی عوام میں عدم اطمینان کے شعلوں کو بھڑکا دیا۔ ان تمام معاشی عوامل نے مل کر روسی انقلاب کی ایک مضبوط بنیاد بنائی اور جس نے زار کی حکومت کا زوال اور ایک نئی اشتراکی حکومت کا قیام ممکن بنایا۔

5.5.3 سماجی اسباب (Social Causes)

1917 کے روسی انقلاب کے سماجی اسباب بھی انتہائی اہم تھے۔ روسی معاشرہ عدم مساوات، استحصال اور غربت سے دوچار تھا، اور ان سماجی امتیازات نے عوامی عدم اطمینان کو ہوا دی۔ روسی معاشرے میں بنیادی طور پر تین بڑے طبقے تھے - کسان، مزدور اور اشرافیہ۔ ان

طبقات کے درمیان گہرا عدم توازن تھا اور اس نے سب کو متاثر کیا۔ روس کی آبادی کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی لیکن وہ انتہائی غربت اور استحصال کا شکار تھے۔ روس میں زیادہ تر زرخیز زمین اشرافیہ، زمینداروں اور کلیسا کی ملکیت تھی، جبکہ کسان چھوٹے چھوٹے رقبے پر کاشت کرتے تھے۔ کسانوں پر بھاری ٹیکسوں کا بوجھ ڈالا گیا جس کی وجہ سے ان کی معاشی حالت بہت خراب تھی۔ کسانوں کے اپنی زمینوں پر حقوق محدود تھے، اور وہ زمینداروں کے مظالم سہنے پر مجبور تھے۔ زمینی اصلاحات کی ضرورت کے باوجود حکومت اس پر توجہ نہیں دے رہی تھی۔ اس کی وجہ سے کسانوں نے زمین پر اپنے حقوق اور بہتر زندگی کے لیے تحریک شروع کی۔ روس میں ایک نیا متوسط طبقہ ابھر رہا تھا جو تاجروں، دانشوروں، پیشہ ور افراد اور اساتذہ پر مشتمل تھا۔ یہ طبقہ تعلیم یافتہ اور باشعور تھا اور اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کرتا تھا۔ زار کی مطلق العنانیت اور عوام کے مسائل کے تئیں حکومت کی بے حسی نے بھی اس طبقے کو غیر مطمئن کر دیا۔ متوسط طبقے نے جمہوری حقوق اور آزادیوں کا مطالبہ کیا اور زار کی خود مختاری کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے انقلابی نظریات کی بھی حمایت کی۔ روس میں مارکسی اور اشتراکی نظریات پھیل رہے تھے۔ لینن اور بالشویک پارٹی نے ان نظریات کو اپنایا اور مزدوروں اور کسانوں کو استحصال کے خلاف منظم کیا۔ مارکسی نظریہ نے محنت کش طبقے اور کسانوں کو متحد ہونے اور سرمایہ داروں اور زار کی حکمرانی کی مخالفت کرنے کی ترغیب دی۔ ان نظریات نے معاشرے میں انقلاب کی لہر کو مزید تیز کر دیا۔ روس میں اشرافیہ طبقہ معاشرے پر حاوی تھا۔ یہ اشرافیہ طبقے انتہائی دولت مند تھے اور معاشرے کے بیشتر وسائل پر قابض تھے۔ عوام کا ایک بڑا طبقہ بنیادی سہولتوں سے محروم تھا جبکہ اشرافیہ طبقہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس سماجی عدم مساوات نے نچلے طبقوں میں ناراضگی پیدا کی۔ اس طرح روسی معاشرے میں رائج عدم مساوات، استحصال اور حقوق کی کمی نے عوام کو بغاوت پر اکسایا۔ کسان، محنت کش اور پڑھے لکھے متوسط طبقے نے زار کی حکمرانی کے خلاف متحد ہو کر انقلاب کی راہ ہموار کی۔

5.5.4 پہلی عالمی جنگ اور اس کے اثرات (The First World War and Its Impact)

پہلی عالمی جنگ کے اثرات نے 1917 کے روسی انقلاب میں اہم کردار ادا کیا۔ اس جنگ کی وجہ سے روس کو بہت سے سنگین معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل کا سامنا کرنا پڑا، جو بالآخر زار حکومت کے زوال میں معاون ثابت ہوئے۔ جب جنگ شروع ہوئی تو لینن پہلا شخص تھا جس نے اعلان کیا کہ یہ ایک 'سامراجی جنگ' ہے جس سے دنیا کے محنت کشوں (مزدوروں) کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن روس کی سامراجی پالیسی نے روس کو پہلی عالمی جنگ میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ وہ قسطنطنیہ اور ڈارڈنیلس (Strait of Dardanelles) تک رسائی حاصل کرنے کے لالچ میں اس جنگ میں شامل ہوا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو روسی عوام نے حب الوطنی کے جذبات سے لبریز ہو کر جنگ میں جوش و خروش سے حصہ لیا۔ جرمن مخالف جذبات کی ایک شدید لہر تھی۔ اس کی علامت 'سینٹ پیٹرزبرگ' (Saint Petersburg) کا نام بدل کر 'پیٹروگراڈ' (Petrograd) کر دیا گیا کیونکہ سینٹ پیٹرزبرگ ایک جرمن نام تھا۔ حکومت نے 1 کروڑ 50 لاکھ افراد کو فوج میں بھرتی کیا اور اپنے تمام وسائل کو جنگ سے متعلقہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے استعمال میں لگا دیا۔ شروع میں روس کو کچھ جنگوں میں کامیابی ملی لیکن 1915 میں یہ بات واضح ہو گئی کہ روس عسکری، صنعتی اور سیاسی نقطہ نظر سے جنگ کے لیے تیار نہیں ہے۔ جنگ نے روس کی اقتصادی صورتحال کو شدید متاثر کیا۔ روس ایک زرعی ملک تھا لیکن اس کی جنگ میں شمولیت سے زرعی پیداوار میں

زبردست کمی واقع ہوئی۔ زیادہ تر مردوں کو جنگ پر بھیج دیا گیا جس سے کھیتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو گئی اور جس کے نتیجہ خوراک کی پیداوار کم ہو گئی۔

جنگ کے لیے بھاری رقوم کی ضرورت تھی، جس کی وجہ سے حکومت نے بڑے پیمانے پر قرضے لیے اور مہنگائی میں اضافہ ہوا۔ جس سے اشیائے ضروریہ کی قیمتیں آسمان چھونے لگیں اور عوام کا جینا محال ہو گیا۔ زیادہ تر مطلوبہ وسائل فوج کو مختص کیے گئے، جس سے مقامی مارکیٹ میں سپلائی کم ہو گئی۔ عام لوگوں کو کپڑوں، ایندھن اور خوراک جیسی اشیائے ضروریہ کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑا، جس سے ان کی زندگی کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ جنگ کی وجہ سے ملک میں مہنگائی بڑھی۔ روزمرہ کی اشیاء کی قیمتیں اتنی بڑھ گئیں کہ لوگ انہیں خریدنے سے قاصر رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صنعتی پیداوار میں کمی آئی جس سے مزدوروں کے لیے روزگار کے مواقع بھی کم ہو گئے۔ بے روزگاری بڑھنے سے عوام میں عدم اطمینان کا احساس بڑھ گیا اور انہوں نے حکومت کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ مہنگائی کے ساتھ ساتھ اجرتوں میں بھی کوئی بہتری نہیں آئی جس کی وجہ سے مزدوروں کی حالت مزید دگرگوں ہو گئی۔ اس عدم اطمینان نے رفتہ رفتہ محنت کشوں اور کسانوں میں انقلابی جذبات کو جنم دیا اور وہ زار کی حکمرانی سے آزادی کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس جنگ میں روس کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ فوجیوں کو خاطر خواہ اسلحہ، خوراک اور لباس نہیں مل رہا تھا، جس کی وجہ سے فوج کی ہمت پست ہو گئی۔ انتہائی سردی، ناقص لباس، اور خوراک کی کمی نے فوجیوں کے لیے حالات کو بدتر بنا دیا۔

روس کے پاس فوجی ساز و سامان کی شدید کمی تھی جس کی وجہ سے جرمنی اور آسٹریا ہنگری جیسی طاقتوں کے خلاف بار بار شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سپاہی جنگ سے تھکے ہوئے اور بیزار تھے۔ ان میں سے بہت سے فوجی زار اور اس کے وزیروں سے ناراض تھے اور حکومت کے خلاف بغاوت کرنے لگے۔ غیر مطمئن سپاہیوں نے آہستہ آہستہ حکومت کے خلاف اپنی ناخوشی کا اظہار کیا اور بہت سے سپاہیوں نے آخر کار انقلابی تحریک میں حصہ لیا، جس سے انقلاب کے جذبے کو مزید تقویت ملی۔ زار نکولس دوم نے جنگ کے دوران خود فوج کی کمان سنبھالی لیکن وہ ایک کمزور فوجی رہنما ثابت ہوا۔ مسلسل شکستوں نے ان کی مقبولیت اور قائدانہ صلاحیتوں پر سوالات اٹھائے۔ زار کی جنگ میں شمولیت کی وجہ سے حکومت کا کام مزید کمزور ہو گیا۔ زار کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی، مہارانی الیگزینڈرا، اور اس کے مشیر راسپوتین نے حکومت چلانے کی کوشش کی، لیکن ان کی سیاسی پالیسیاں ناکام ثابت ہوئیں۔ راسپوتین کے اثر و رسوخ اور بدعنوانی کی وجہ سے لوگوں کا شاہی خاندان سے اعتماد اٹھ گیا۔ عوام نے محسوس کیا کہ زار اور اس کی حکومت ان کے مسائل حل کرنے سے قاصر ہیں اور جنگ سے ہونے والے نقصانات نے ان کی حکمرانی سے عدم اطمینان بڑھا دیا۔

5.5.5 روسی دانشور طبقے کا عروج اور ان کا کردار (The Rise of Russian Intellectuals and Their Role)

روس میں دانشوروں کا عدم اطمینان روسی انقلاب کی ایک بڑی وجہ تھی۔ یہ طبقہ بنیادی طور پر پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھا، جو ادب و فلسفہ، سائنسی اور سیاسی نظریات کے لیے حساس تھے، جو زار نکولس دوم کی حکمرانی اور روس کی سماجی اور معاشی حالت سے مطمئن نہیں

تھے۔ ان کے عدم اطمینان اور انقلابی نظریات انقلاب میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ روس میں زار کی حکمرانی مکمل طور پر آمرانہ اور مطلق العنان تھی جس میں عوام کو کوئی حقوق اور آزادی حاصل نہیں تھی۔ روس میں زار نکولس دوم کی قیادت میں سیاسی حقوق کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا۔ دانشور طبقے کا خیال تھا کہ سیاسی آزادی کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ جمہوریت، عدلیہ کی آزادی اور اظہار رائے کی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن زار کی حکومت نے ان کے مطالبات پر کان نہیں دھرا۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینجیلز کے اشتراکی اور مارکسی نظریات کا روس میں وسیع اثر تھا۔ دانشور طبقے نے کمیونسٹ معاشرے کے نظریات کو قبول کیا، جہاں معاشی اور سماجی برابری ہوگی۔ اس طبقے کا خیال تھا کہ معاشرے میں غریبوں اور مزدوروں کا استحصال کیا جاتا ہے اس لیے معاشرے کو طبقاتی ڈھانچے میں منظم ہونا چاہیے۔ ان خیالات نے اسے زار شاہی حکومت کے خلاف کھڑے ہونے کی ترغیب دی۔

دانشور طبقے نے یورپ اور امریکہ جیسے مغربی ممالک میں جمہوری نظام اور سائنسی ترقی کو دیکھا اور اس نے محسوس کیا کہ روس میں بھی ایسی ترقی ہو سکتی ہے لیکن آمرانہ حکمرانی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ٹالسٹائی (Tolstoy)، ترگیمو (Turgenev) اور ڈوسٹوسکی (Dostoevsky) جیسے مفکروں کی تحریر نے نوجوان پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر روس میں جمہوریت، سائنسی سوچ اور آزادی کا ماحول ہو تو معاشرے کی زیادہ ترقی ممکن ہے۔ اس وجہ سے اس نے زار کے آمرانہ نظام کی مخالفت کی۔ روس میں دانشور طبقے نے پریس، ادب اور آرٹ کے ذریعے عام لوگوں کو تعلیم دینا شروع کی۔ ادیبوں، صحافیوں اور فنکاروں نے حکومت کی پالیسیوں اور معاشرے میں پائی جانے والی عدم مساوات پر کڑی تنقید کی۔ انھوں نے انقلابی ادب کے ذریعے لوگوں کو آگاہ کیا اور انھیں تبدیلی کے لیے تحریک دی۔ اس طرح انہوں نے معاشرے میں انقلابی نظریہ پھیلایا۔ دانشور طبقے کے عدم اطمینان اور انقلابی نظریے نے روس میں انقلاب کی نظریاتی اور ذہنی بنیاد تیار کی۔ اس طبقے نے حکومت کے خلاف نظریات اور حکمت عملی تیار کی اور عام لوگوں کو انقلاب کے لیے تیار کیا۔ اس طرح دانشور طبقے کا عدم اطمینان روس کے انقلاب کی ایک مضبوط وجہ بن گیا اور معاشرے میں وسیع پیمانے پر تبدیلیوں کی بنیاد رکھی۔

5.5.6 انقلابی نظریہ کا ظہور (The Emergence of Revolutionary Ideology)

روس میں انقلابی نظریہ کا ظہور ایک پیچیدہ اور کثیر جہتی عمل تھا، 19ویں صدی کے وسط سے 20ویں صدی کے اوائل تک پروان چڑھتا رہا۔ اس کا ظہور سیاسی، سماجی، معاشی اور نظریاتی وجوہات کا نتیجہ تھا۔ اس نظریے نے روسی معاشرے میں گہری تبدیلیوں کی بنیاد رکھی اور بالآخر 1917 کے روسی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ اس کی بنیادی وجوہات درج ذیل ہیں۔ روس میں 19ویں صدی کے آخر میں 'نارودنیکی' (Narodnik) نامی تحریک شروع ہوئی۔ نرودنیکی سماجی اصلاح کاروں اور انقلابیوں کا ایک گروپ تھا جو کسانوں اور دیہی برادریوں کو اصلاح کا بنیادی ذریعہ سمجھتے تھے۔

اس تحریک کا مقصد روسی معاشرے کی اصلاح کرنا تھا، لیکن اسے زارسٹ حکومت نے کچل دیا۔ نرودنیکی تحریک کے ناکام ہونے کے بعد، بہت سی انقلابی تنظیموں نے نئے خیالات اور حکمت عملی تیار کیں، جیسے کہ کارکنوں کو حساس بنانا اور اشتراکی انقلاب کی ضرورت پر زور

دینا۔ 19ویں صدی کے دوسرے نصف میں کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز کے اشتراکی نظریات روس میں پھیلنے لگے۔ مارکسی نظریے کے مطابق معاشرہ طبقاتی جدوجہد پر مبنی ہے اور معاشرے میں حقیقی تبدیلی لانے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ ولادیمیر لینن اور بالشویک پارٹی نے روسی معاشرے میں مارکسی نظریہ کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اشتراکیت کو روس کے سماجی اور معاشی تناظر میں پیش کیا اور عوام کو طبقاتی معاشرے کے خواب کی طرف راغب کیا۔ اس حالت نے ایک نئے نظریہ نہی لزم (Nihilism) کو پیدا کیا جس کے ذریعہ ہر مروجہ نظام کی مخالفت کی گئی۔ میکل باکون اس نظریہ کا بانی تھا۔ اس نظریہ کے ماننے والوں نے مروجہ زاریت، کلیسا (چرچ)، سماجی و معاشی نظام کو مکمل ختم کرنا اور عقل اور سائنس کی بنیاد پر ایک جدید اور متبادل نظام کا مطالبہ کیا۔ نہی لزم کے ماننے والوں نے دہشت گردی کو تمام روس میں پھیلا دیا۔ حکومت نے اُن کے خلاف سخت اقدامات اٹھائے۔

5.6 1917 کا فروری انقلاب (The February Revolution of 1917)

فروری انقلاب کے وقت روس کے حالات بہت خراب تھے۔ پہلی عالمی جنگ کی وجہ سے ملکی معیشت کمزور ہو چکی تھی۔ جنگ کے نتیجے میں لاکھوں روسی فوجی ہلاک یا زخمی ہوئے، اور دیہی علاقوں میں کاشتکاری اور صنعت دونوں متاثر ہوئے۔ غذائی اجناس کی قلت، مہنگائی اور سرد موسم میں مشکلات نے عام لوگوں کی حالت انتہائی مشکل بنا دی۔ بہت سے سپاہی بھوکے، پیاسے، افسردہ اور رسد اور گولہ بارود کی کمی سے بے کار جنگ چھوڑ گئے۔ انقلاب کا آغاز روٹی کی طلب سے ہوا۔ دارالحکومت، سینٹ پیٹرز برگ، جس کا نام حال ہی میں پیٹرو گراڈ رکھا گیا تھا، میں لوگ روٹی کے لیے چیختے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ 1917 میں خواتین کے عالمی دن کے موقع پر سینٹ پیٹرز برگ میں ہزاروں خواتین سڑکوں پر نکلیں، بنیادی طور پر خوراک کے بحران اور بنیادی ضروریات کی کمی کے خلاف احتجاج کیا۔ خواتین کا مظاہرہ تیزی سے ایک بڑے احتجاج میں بدل گیا، جس میں معاشرے کے مختلف طبقات کے لوگ شامل تھے۔ موقع دیکھ کر اسی دن اسی نوے ہزار مزدوروں نے ہڑتال کی اور عوام کے ساتھ ہو لیے۔ جلوس میں بہت سے سرخ جھنڈے تھے۔ جب فوج کو مشتعل ہجوم پر گولی چلانے کو کہا گیا تو وہ بھی بغاوت کر کے عوام میں شامل ہو گئے۔ زار کی سب سے قابل اعتماد فوج نے بھی بغاوت کر دی۔ باغیوں نے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ ایوان نمائندگان (ڈوما) نے زار کی دارالحکومت سے غیر موجودگی کی وجہ سے باغیوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بالآخر ایک عارضی حکومت قائم ہوئی جس کا لیڈر مونشیویک پارٹی کا Kerensky بنا۔ 8 مارچ، 1917 کو، الیگزینڈر دوم نے اپنے تخت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ اُس وقت کیا جب اس کی ٹرین کو ایک ریلوے پلیٹ فارم پر احتجاج کرنے والے ریلوے کارکنوں کے ایک گروپ نے روک دیا، اس واقعہ سے روس میں رومانوف خاندان کی ایک ہزار سال سے زیادہ کی حکمرانی ختم ہو گئی۔ یہ 1917ء کا فروری انقلاب تھا۔ دراصل یہ مارچ کا مہینہ تھا لیکن اسے فروری انقلاب کا نام دیا گیا کیونکہ روسی کیلنڈر گریگورین کیلنڈر سے مختلف تھا اور روسی کیلنڈر کے مطابق یہ فروری کا مہینہ تھا۔ فروری انقلاب کے نتیجے میں روس میں بادشاہت کا خاتمہ ہوا اور ایک عارضی حکومت قائم ہوئی۔ یہ عارضی حکومت کئی پارٹیوں پر مشتمل تھی اور اس کی قیادت پرنس جارج لووف اور بعد میں الیگزینڈر کیرنسکی نے کیا۔

5.7 عارضی حکومت کی تشکیل اور اس کی چنوتیاں
(Formation of Provisional Government and Its Challenges)

عارضی حکومت کا بنیادی مقصد روس میں استحکام لانا، آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کا انعقاد اور روس کو جمہوری نظام کی طرف لے جانا تھا۔ لیکن اس حکومت کو بہت سے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا، جیسے:

1۔ پہلی عالمی جنگ کے اثرات: عارضی حکومت نے روس کو جنگ میں رکھنے کا فیصلہ کیا جو عوام میں انتہائی غیر مقبول تھا۔ جنگ کی وجہ سے لوگوں کی روزی روٹی ختم ہوگئی تھی اور سپاہیوں میں بھی عدم اطمینان تھا۔

2۔ اقتصادی بحران: روس کی معیشت جنگ کی وجہ سے پہلے ہی کمزور تھی۔ غذائی بحران، مہنگائی اور اشیائے ضروریہ کی قلت نے عوام کی مشکلات میں اضافہ کر دیا۔

3۔ سیاسی عدم استحکام: حکومت مختلف نظریات اور جماعتوں کے رہنماؤں پر مشتمل تھی، جن میں سے بہت سے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ یہ حکومت مزدوروں، کسانوں اور سماج کے مختلف طبقات کو مطمئن نہیں کر سکی۔

4۔ کسانوں کا مسئلہ بھی ایک بڑا چیلنج تھا۔ عارضی حکومت زمینی اصلاحات کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے میں ناکام رہی، حالانکہ کسان طویل عرصے سے زمین کی دوبارہ تقسیم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ محنت کش طبقے کی حالت بھی قابل رحم تھی۔ وہ بہتر اجرت اور کام کے بہتر حالات چاہتے تھے لیکن حکومت ان مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہی۔

مزید برآں، سوویت دباؤ اور بالشویک پارٹی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے عارضی حکومت کو کمزور کر دیا۔ بالشویکوں نے عارضی حکومت سے اقتدار چھوڑنے اور تمام اختیارات سوویت کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ بالشویکوں کو فوج اور کارکنوں کی حمایت حاصل ہوئی، حکومت کے خلاف عدم اطمینان میں مزید اضافہ ہوا۔ بالآخر اکتوبر 1917 میں بالشویکوں نے عارضی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت شروع کی جس کو "اکتوبر انقلاب" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 25 اکتوبر 1917 کو بالشویکوں نے پیٹروگراڈ میں عارضی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور لینن کی قیادت میں بالشویک حکومت کا آغاز ہوا۔ اس طرح، عارضی حکومت صرف چند ماہ کے لیے اقتدار میں رہی اور بالشویک انقلاب کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ عارضی حکومت کا زوال اس کی نااہلی، کمزور فیصلہ سازی کی صلاحیت اور عوامی حمایت کی کمی کی وجہ سے ہوا۔ یہ حکومت جنگ کو روکنے، زمینی اصلاحات نافذ کرنے اور مزدوروں کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہی۔ ان وجوہات کی وجہ سے عوام کا اعتماد کمزور ہوا اور بالشویکوں نے اقتدار حاصل کر کے روس میں اشتراکی حکومت قائم کی۔

5.8 اکتوبر/نومبر یا بولشویک انقلاب (October/November or, the Bolshevik Revolution)

ولادیمیر لینن نے اپریل 1917 میں اپنے اپریل تھیسس کے ذریعے روس میں عارضی حکومت کے خاتمے اور "تمام طاقت سوویت کو منتقل کرنے" کا مطالبہ کیا۔ اس مقالے میں لینن نے عارضی حکومت پر تنقید کی اور براہ راست انقلابی اقدامات کی وکالت کی۔ اس نے 'امن،

روٹی اور زمین' کا نعرہ لگایا، جو جنگ زدہ روسی عوام، خاص طور پر کسانوں، مزدوروں اور فوجیوں کے لیے انتہائی ضروری تھا۔ اپریل تھیسس بالشویکوں کی انقلابی حکمت عملی کی بنیاد بنی اور بالشویکوں نے عوام کی حمایت سے انقلاب کی سمت کا تعین کیا۔ لینن سمجھ گیا کہ عارضی حکومت کو ہٹانے کا وقت آ گیا ہے۔ انہوں نے انقلابی کارروائی کو منظم اور حکمت عملی بنانے کے لیے "فوجی انقلابی کمیٹی" تشکیل دی۔ اس کمیٹی کی قیادت لیون ٹراٹسکی کر رہے تھے اور اس کا مقصد عارضی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کو منظم کرنا تھا۔ ٹراٹسکی نے سپاہیوں اور کارکنوں کی بٹالین کی حمایت حاصل کی اور انقلاب کے لیے فوجی حکمت عملی بنائی۔ اسی درمیان ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ اگست 1917 میں فوجی جنرل کورینلوف نے بغاوت کرا اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کی۔ دراصل کرینسکی نے کورینلوف کو بالشیوک کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے دار لحکومت میں بلایا تھا لیکن اگست 1917 میں، جنرل لاور کورنیلوف نے بالشیوک کے ساتھ عارضی حکومت کو بھی ہٹانے اور فوجی آمریت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے پیٹرو گراڈ کی طرف مارچ کیا لیکن وزیر اعظم الیگزینڈر کیرنسکی نے بالشویکوں کی مدد سے بغاوت کو دبا دیا گیا۔ اس واقعے نے بالشویکوں کے اثر ورسوخ میں اضافہ کیا۔

اکتوبر 1917 کے آخر میں (جولین کیلنڈر کے مطابق) بالشویکوں نے عارضی حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ٹراٹسکی اور بالشویک رہنماؤں نے منصوبہ بنایا کہ پیٹرو گراڈ کی اہم سرکاری عمارتوں اور مراکز پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو اسٹریٹجک مقامات پر تعینات کیا اور آہستہ آہستہ پیٹرو گراڈ کے ریلوے اسٹیشن، ٹیلی گراف سینٹر، بینکوں اور دیگر اہم مقامات پر کنٹرول حاصل کرنا شروع کر دیا۔ 24 اکتوبر کی رات بالشویکوں نے ایک انقلابی مہم شروع کی۔ انہوں نے عارضی حکومت کے خلاف منظم انداز میں پیٹرو گراڈ میں سرکاری عمارتوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ بالشویکوں نے پہلے ہی اپنے فوجیوں کو اہم مقامات پر تعینات کر دیا تھا، جس سے وہ تیزی سے آگے بڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے شہر کے مواصلاتی نظام اور نقل و حمل کا کنٹرول بھی سنبھال لیا تاکہ حکومت تک کوئی امداد نہ پہنچ سکے۔ 25 اکتوبر کو بالشویکوں نے عارضی حکومت کے ہیڈ کوارٹر ونٹر محل پر حملہ کیا۔ اس حملے کے نتیجے میں زیادہ تنازعہ نہیں ہوا، کیونکہ زیادہ تر فوجی پہلے ہی بالشویکوں کا ساتھ دے چکے تھے۔ اس وجہ سے ونٹر محل پر حملہ علامتی تھا۔ بالآخر عارضی حکومت کے سربراہ الیگزینڈر کیرنسکی فرار ہو گئے اور دیگر وزراء کو گرفتار کر لیا گیا۔ ونٹر محل پر قبضہ بالشویکوں کے لیے فیصلہ کن فتح ثابت ہوا۔ ونٹر محل پر قبضے کے بعد بالشویکوں نے پیٹرو گراڈ میں سوویت یونین کی دوسری آل روسی کانگریس کا انعقاد کیا۔ 10 بجے صبح "روس کے عوام" سے لینن نے ریڈیو سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ، عارضی حکومت کو ختم کر دیا گیا ہے اور سوویت یونین (مزدوروں، کسانوں اور فوجیوں کی نمائندگی کرنے والے ادارے) اب روس کے حقیقی حکمران ہیں۔ لینن نے نئی حکومت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اب روس میں اشتراکی نظام قائم ہو گا۔ اس واقعہ کی تاریخ دراصل 7 نومبر تھی لیکن پرانے روسی کیلنڈر کے مطابق یہ 25 اکتوبر کا دن تھا اسی لیے اس کو اکتوبر انقلاب بھی کہا گیا۔

5.9 روسی انقلاب کے نتائج (Consequences of the Russian Revolution)

روسی انقلاب کے نتائج نہ صرف روس کے اندر بلکہ عالمی سطح پر بھی وسیع اور گہرے اثرات مرتب کرنے والے تھے۔ 1917 کے

اس انقلاب نے زار شاہی کا خاتمہ کیا اور اشتراکی اصولوں پر مبنی پہلے کامیاب انقلاب کے طور پر عالمی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ اس کے اثرات کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ اس انقلاب کے پرستار اسے انسانی ترقی میں ایک سنگ میل سمجھتے ہیں جبکہ اس کے ناقدین اسے ایک بڑی تباہی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ تاہم، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انقلاب نے 20 ویں صدی کی ترقی پر بہت وسیع اور فیصلہ کن اثر ڈالا۔ ان واقعات کا براہ راست مشاہدہ کرنے والے امریکی صحافی جان ریڈ نے اپنی تصنیف میں انقلاب کے بارے میں لکھا کہ، ''کوئی بالشویزم کے بارے میں کچھ بھی سوچے، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انقلابِ روس انسانیت کی تاریخ کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک ہے اور بالشویکوں کا اقتدار عالمگیر اہمیت کا حامل ہے۔

فروری انقلاب کے دوران، روس کے زار نکولس دوم کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا، جس سے رومانوف خاندان کی سینکڑوں سالہ بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد قائم ہونے والی عارضی حکومت کو بھی اکتوبر انقلاب میں بالشویکوں نے ختم کر دیا تھا۔ اس سے روس میں زار شاہی اور عارضی حکومت کا دور ختم ہوا اور ایک اشتراکی حکومت کا آغاز ہوا۔ انقلاب کے بعد، 1922 میں، روس کی مختلف جمہوریہ ایک نئے وفاقی ڈھانچے میں ضم ہو گئیں، "یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس "(The USSR) یا سوویت یونین۔ یہ ریاست بالشویک قیادت میں اشتراک کی بنیاد پر چلتی تھی اور بین الاقوامی سطح پر کمیونسٹ نظریے کی علامت بن گئی۔ اس یونین کے قیام کے ساتھ ہی سوویت یونین کمیونزم کا عالمی مرکز بن گیا۔ بالشویک حکومت نے اقتدار میں آتے ہی امن کا مطالبہ کیا۔ جنگ عظیم سے باہر نکلنے کے لیے، اس نے بریسٹ۔لیٹوسک معاہدہ (1918) پر دستخط کیے، جس کے تحت روس نے کئی علاقے جرمنی کو دینے پر اتفاق کیا۔ اس فیصلے نے روس کو پہلی عالمی جنگ سے تو دور رکھا لیکن یہ بہت سے علاقائی اور اقتصادی نقصانات کا باعث بنا۔ اس کے باوجود جنگ سے نکلنا روسی عوام کے لیے امن اور استحکام کی طرف پہلا قدم تھا۔

لینن اور ٹراٹسکی کے نزدیک کمیونسٹ انقلاب کا آخری مقصد عالمی انقلاب تھا۔ عالمی انقلاب کو فروغ دینے کے لیے بالشویکوں نے 1919ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل یا Comintern کو ایک عالمی تنظیم کے طور پر قائم کیا جس کا صدر دفتر ماسکو میں تھا۔ دنیا کی تمام مزدور جماعتوں کو بطور ممبر مدعو کیا گیا تھا۔ فرانس، اٹلی، آسٹریا اور ناروے میں اشتراکی پارٹیوں نے اس کے رکن بننے کا فیصلہ کیا۔ اس کے قیام کا بنیادی مقصد پر عزم اشتراکیوں کا ایک خاص گروپ بنانا تھا جو عالمی انقلاب کے لیے ایک انتہائی موثر قوت فراہم کر سکے۔ لیکن اکثر معاملات میں نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ بالشویکوں کے حامی اپنے ہی ملکوں میں اہم کردار ادا نہیں کر سکے۔

بالشویک حکومت نے بڑے پیمانے پر معاشی اور سماجی اصلاحات کیں۔ زمین کی دوبارہ تقسیم کی گئی اور زمینداری کا نظام ختم کر دیا گیا۔ کسانوں کو زمین کی براہ راست ملکیت دے دی گئی اور صنعتوں کو قومیا لیا گیا۔ مزدوروں کو طویل اوقات کار اور مزدوری کے حقوق دیے گئے، اور ریاست نے معیشت کو کنٹرول کرنا شروع کیا۔ چند سالوں میں کئی ملین ایکڑ اراضی کاشتکاروں میں منتقل اور تقسیم کر دی گئی۔ دیہی علاقوں میں پرانا نظام مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔ لینن نے 1921ء میں نئی اقتصادی پالیسی ('New Economic Policy') کا اعلان کیا۔

کسانوں سے لیے گئے اناج پر ایک مقررہ ٹیکس لگا دیا گیا۔ بقیہ غلہ کسان کا تھا اور وہ جس طرح چاہے استعمال کر سکتا تھا۔ اگرچہ یہ اصول برقرار تھا کہ زمین ریاست کی تھی، لیکن عملی طور پر زمین کسان کی تھی۔ صنعتوں کو غیر مرکزی بنایا گیا۔ 20 سے کم ملازمین والی صنعتوں کو انفرادی طور پر چلانے کا حق مل گیا۔ بیرونی تجارت ریاست کے کنٹرول میں رہی لیکن ملک میں انفرادی کاروبار کو آزادی دی گئی۔ مختلف سطحوں پر بینک کھولے گئے۔ ٹریڈ یونینوں کی لازمی رکنیت ختم کر دی گئی۔ اس نے معاشرے میں کئی سطحوں پر مساوات لانے کی کوشش کی اور اشتراکی اصولوں کو عملی شکل میں نافذ کیا۔ لیکن اس کی پالیسی، خالص اشتراکی کے بجائے، ایک مخلوط معیشت کو فی الحال نافذ کیا گیا اور منافع کا مقصد، جو سرمایہ دارانہ نظام کی اہم بنیاد ہے، مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ ذاتی جائیداد بھی قائم رہیں۔ ریاست زیادہ تر پیداوار اور تقسیم کو کنٹرول کرتی تھی، پھر بھی افراد کو زراعت، صنعت اور کاروبار میں ایک حد تک آزادی دی گئی۔ جیسا کہ مؤرخ لینگسم کہتے ہیں، "ہر آدمی کو اس کی ضروریات کے مطابق" کا کمیونسٹ بنیادی اصول "ہر آدمی کو اس کی محنت کے مطابق" میں بدل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ روس کے پچاس سالہ اشتراکی نظام کے باوجود یہ نئی معاشی پالیسی بھی کسی حد تک سرمایہ دارانہ رجحانات اور اداروں کی نشوونما کی ذمہ دار تھی۔

بالشویکوں نے انقلاب کے بعد اپنے مخالفین کے ساتھ سخت رویہ اپنایا۔ بالشویک پارٹی نے روس میں ایک پارٹی کی حکمرانی قائم کی، اور لینن اور پھر جوزف اسٹالن کی قیادت میں بہت سے سیاسی مخالفین کو ختم کر دیا گیا۔ چیکا (خفیہ پولیس) جیسے ادارے بنائے گئے اور جابرانہ پالیسیاں اپنائی گئیں، لاکھوں لوگوں کو جیلوں میں ڈالا گیا یا جلاوطن کیا گیا۔ بالآخر کئی دہائیوں کے مکمل کنٹرول کے باوجود، بیوروکریٹک کنٹرول، نااہلی، بدعنوانی، اور مراعات کی کمی کے نتیجے میں بنیادی اشیائے خورد ونوش جیسے صابن، دودھ اور گوشت کی کم دستیابی رہی۔ اس یک جماعتی نظام نے بعد میں مطلق العنان ریاست کی شکل اختیار کر لی۔

روسی انقلاب نے سامراج کے خلاف احتجاج کی آواز کا کام کیا۔ انقلاب کے بعد، سوویت یونین نے واضح طور پر سامراج اور نوآبادیت ی طاقتوں کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا اور استحصال کے خلاف بین الاقوامی حمایت کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ انقلاب ایشیا اور افریقہ جیسے دنیا کے نوآبادیاتی ممالک کے لیے ایک تحریک بن گیا اور سامراجی استحصال کے خلاف تحریکیں تیز ہو گئیں۔ اس انقلاب نے ایک منصفانہ اور جدید ریاست کے قیام کے لیے ایک نمونہ فراہم کیا۔ مارکس اور لینن اس کے آئیڈیل بن گئے۔ 1920 کی دہائی کے اوائل میں چین، ہندوستان، انڈونیشیا، ترکی اور دیگر ممالک میں کمیونسٹ پارٹیاں قائم ہوئیں۔ ماسکو میں ایشیائی طلباء کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اکتوبر انقلاب کے دو سال کے اندر اندر انقلاب کی لہر پوری دنیا میں پھیلنے لگی۔ تمباکو کے کارکنوں نے کیوبا میں سوویت قائم کی۔ ہندوستانی قوم پرست ایم این رائے اس انقلاب سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے نوآبادیات کی آزادی کے لیے ایک نئی کمیونسٹ بین الاقوامی پالیسی (New Communist International Policy) بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

روسی انقلاب کے بعد اشتراکی اور سرمایہ داری کے درمیان نظریاتی کشمکش سرد جنگ کا باعث بنی۔ روسی انقلاب نے پہلی بار اشتراکی نظریے کو عملی شکل میں قائم کیا، جس نے مغربی سرمایہ دار ممالک بالخصوص امریکہ میں اس کے پھیلاؤ کے بارے میں خوف اور عدم تحفظ پیدا

کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد، سوویت یونین نے مشرقی یورپ کے ممالک پر کنٹرول قائم کیااور کمیونسٹ حکومتوں کی حمایت کی، جسے مغرب نے کمیونسٹ توسیع کی کوشش سمجھا۔ برلن کی تقسیم، کوریا اور ویتنام کی جنگ جیسے واقعات نے کمیونزم اور سرمایہ داری کے درمیان کشمکش کو مزید تیز کر دیا۔ اس تنازعہ نے جوہری ہتھیاروں کی دوڑ، عالمی تنازعات اور ناوابستہ تحریک کو جنم دیا۔ روسی انقلاب کا یہ نتیجہ کئی دہائیوں تک عالمی سیاست پر اثر انداز ہوتا رہااور دنیا کو دو نظریات میں تقسیم کرتا رہا جس سے سرد جنگ شروع ہو گئی۔ اس طرح روسی انقلاب کا اثر وسیع اور گہرا تھا۔ اس نے نہ صرف روس کی سیاست اور معاشرت کو بدل دیا بلکہ پوری دنیا میں اشتراکی نظریے کو فروغ دیا۔ اس کی وجہ سے اشتراکی اور کمیونسٹ اصول پھیلے اور عالمی سیاست میں دیرپا تبدیلیاں آئیں۔ یہ انقلاب ایک الہام کا ذریعہ بن گیا جس نے آنے والی دہائیوں میں اشتراکی، سرمایہ داری اور جمہوریت کے درمیان جدوجہد کا رخ متعین کیا۔

5.10 لینن اور بولشویک انقلاب میں اس کی خدمات

(Lenin and His Contribution to the Bolshevik Revolution)

لینن نے پہلی عالمی جنگ (1914–1918) کی مخالفت کی اور اسے ایک "سامراجی جنگ" قرار دیا، جس میں اشرافیہ طبقے اور حکمرانوں نے عوام کو اپنے مفادات کے لیے جنگ پر مجبور کیا۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ صرف اشتراکی انقلاب سے ہی ختم ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس نے جنگ کے زمانے میں عوام میں زار حکومت کے خلاف تحریک اور انقلاب کا پرچار کیا۔ روس کے انقلابیوں میں سب سے نمایاں عہد ساز لینن تھا۔ لینن نے زار کے دور کو ختم کرنے کا عزم کیا تھا جب وہ ایک بچہ تھا، جس کی وجہ، اس کے بڑے بھائی کو زار پر بم پھینکنے کے جرم میں موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ ولادیمیر ایلیچ اولیانوف، جو ولادیمیر لینن (1870–1924) کے نام سے مشہور ہیں، 20ویں صدی کے سب سے زیادہ بااثر انقلابی رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ لینن نے روس میں کمیونسٹ انقلاب کی قیادت کی اور 1917 کے اکتوبر انقلاب کے بعد سوویت یونین (یو ایس ایس آر) کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کی قیادت میں روس میں زار کا خاتمہ ہوا اور بالشویک پارٹی نے اقتدار سنبھال لیا۔ انہوں نے اشتراکی نظریے کو روس کے تناظر میں لاگو کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے مارکسی نظریے میں تبدیلیاں کیں۔ لینن کے انقلاب کے وژن اور ان کے نظریات کا اثر نہ صرف روس بلکہ پوری دنیا پر پڑا۔ لینن 22 اپریل 1870 کو سمبرسک (اب الیانوسک) میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ ان کے والد ماہر تعلیم تھے، لیکن خاندان بھی سیاسی عدم استحکام سے متاثر تھا۔ اس کے بڑے بھائی، الیگزینڈر اولیانوف، جو ایک انقلابی بھی تھے، کو زار الیگزینڈر III کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے پر پھانسی دی گئی۔ اس واقعے نے لینن پر گہرا اثر چھوڑا اور ان کی زندگی کو انقلاب کی طرف راغب کیا۔ اپنی تعلیم کے دوران، لینن کارل مارکس کی تعلیمات اور اشتراکی نظریات سے متاثر تھے۔ اس نے "داس کیپیٹل" کا مطالعہ کیا اور مارکسزم کو روسی معاشرے کے تناظر میں عملی طور پر لاگو کرنے کی کوشش کی۔ لینن کا خیال تھا کہ روس میں انقلاب ضروری ہے تاکہ وہاں اشتراکی معاشرہ قائم کیا جا سکے۔ اس نے محسوس کیا کہ روسی معاشرے کے مسائل کا واحد حل زار کی حکومت کا تختہ الٹ کر مزدوروں اور کسانوں کو اقتدار سونپنا ہے۔

لینن کو زمانہ طالب علمی سے ہی زار کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس کی پہچان الیگزینڈر کے بھائی اور بغاوتی کے طور پر ہو چکی تھی۔ انہیں یونیورسٹی سے نکال دیا گیا اور 1895 میں جیل بھی جانا پڑا۔ تین سال تک سائبیریا میں جلاوطنی کی زندگی گزارتے ہوئے وہ یورپ کے مختلف ممالک میں رہ کر روس میں اشتراکی تحریک کی حمایت کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے اہم کتابیں اور مضامین بھی لکھے۔ اس نے "اسکرا" (Iskra) کے نام سے ایک تاریخی مقالے کی تدوین بھی کی جس کی کاپیاں ہزاروں میل دور روس میں تقسیم کی جاتی تھی اور روسی انقلابیوں نے اس سے نیا جوش حاصل کرتے اور اپنی سٹریٹیجی کو نئی راہ دینے میں استعمال کیا کرتے تھے۔ کسی طرح اس نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور سوشل ڈیموکریٹس پارٹی کا سرگرم رکن بن گیا۔ 1903ء میں پارٹی کے اعتدال پسند دھڑے سے بڑھتی ہوئی مخالفت کی وجہ سے بالشویک پارٹی کی بنیاد 1903ء میں رکھی گئی۔ بالشویک معاشرے میں بنیادی تبدیلی کے حق میں تھے اور اس تبدیلی کو انقلابی انداز میں لانا چاہتے تھے۔

لینن نے پہلی عالمی جنگ (1914–1918) کی مخالفت کی اور اسے ایک "سامراجی جنگ" قرار دیا، جس میں اشرافیہ طبقے اور حکمرانوں نے عوام کو اپنے مفادات کے لیے جنگ پر مجبور کیا۔ ان کا خیال تھا کہ جنگ صرف اشتراکی انقلاب سے ہی ختم ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس نے جنگ کے زمانے میں عوام میں زار حکومت کے خلاف تحریک اور انقلاب کا پرچار کیا۔ 1917 کے فروری انقلاب نے زار نکولس دوم کے دور کا خاتمہ کیا اور ایک عارضی حکومت قائم کی گئی۔ لیکن یہ حکومت عوام کے مطالبات کو پورا کرنے میں ناکام رہی۔ اکتوبر 1917 میں لینن نے بالشویک پارٹی کے ساتھ مل کر اس عارضی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس واقعہ کو "اکتوبر انقلاب" کہا جاتا ہے۔ اس انقلاب کے بعد لینن نے روس میں پہلی اشتراکی ریاست قائم کی اور اقتدار بالشویک پارٹی کے ہاتھ میں آگیا۔

اقتدار میں آنے کے بعد لینن نے کئی پالیسیاں شروع کیں۔ اس نے زمین کو قومیا کر کسانوں کو زمین کی ملکیت عطا کی۔ اس نے صنعتوں کو ریاستی کنٹرول میں قومیایا اور مزدوروں کو حقوق فراہم کیے۔ 1922 میں سوویت یونین (یو ایس ایس آر) کا قیام عمل میں آیا جس کی بنیاد اشتراکی اور کمیونسٹ اصولوں پر مبنی تھی۔ یہ دنیا کی پہلی اشتراکی ریاست تھی، اور اس کے قیام کا سہرا بنیادی طور پر لینن کو جاتا ہے۔ لینن کا خیال تھا کہ معاشرے میں مساوات اور انصاف صرف محنت کش طبقے کی قیادت میں ہی قائم ہو سکتا ہے۔ ان کے خیالات نے 'لیننزم' کے نظریے کو جنم دیا، جو مارکسزم کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ لینن نے کہا کہ سامراجی سرمایہ داری کے خاتمے اور اشتراکی معاشرے کے قیام کے لیے انقلاب ضروری ہے۔ ان کے خیالات بہت سے دوسرے ممالک کے انقلابیوں کے لیے بھی تحریک بن گئے۔ لینن کی صحت 1920 کے بعد خراب ہونے لگی اور 21 جنوری 1924 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت کے بعد سوویت یونین کی قیادت جوزف اسٹالن نے سنبھال لی۔

لینن نے اقتدار کو مضبوط مرکز میں رکھنے کی پالیسی پر عمل کیا، اس طرح بالشویک پارٹی سے باہر کی سیاسی آوازوں کو دبایا گیا۔ بالشویک حکومت کے دوران جمہوری عمل محدود تھا، اور دیگر سیاسی جماعتوں اور گروہوں کو ختم کر دیا گیا تھا۔ اقتدار کو مرکزی بنا کر اس نے پارٹی کے اندر اختلاف رائے کو بھی دبایا اور ان کے فیصلوں کی مخالفت کرنے والوں کو اقتدار سے علیحدہ کر دیا۔ یہ آمرانہ رجحانات کی علامت تھی، اور ناقدین کا خیال ہے کہ یہ روس میں جمہوریت کی ترقی میں رکاوٹ بنی۔ لینن نے "سرخ دہشت گردی" کی پالیسی پر عمل کیا، جس کے تحت بالشویکوں نے اپنے سیاسی مخالفین، دولت مند زمینداروں، اور دیگر منتشر افراد کے خلاف پر تشدد کارروائیاں کیں۔ اس پالیسی میں ہزاروں لوگ مارے

گئے اور لاکھوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے قید یا جلاوطن کر دیا گیا۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ لینن نے سیاسی استحکام اور طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے حد سے زیادہ تشدد کا سہارا لیا، جس سے معاشرے میں عدم اطمینان اور تقسیم میں اضافہ ہوا۔ لینن نے سیاسی اور شخصی آزادی پر سخت پابندیاں عائد کیں۔ پریس کی آزادی کو ختم کر دیا گیا، اور احتجاج اور اختلاف رائے پر سخت کاروائی کی گئی۔ تمام قسم کے میڈیا کو بالشویک پارٹی کے کنٹرول میں لایا گیا۔

روس نے ایک جماعتی نظام حکومت تیار کیا، جس میں بالشویک پارٹی کے علاوہ کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی۔ اس سے جمہوریت کی جڑیں کمزور ہوئیں اور مستقبل میں ایک سخت آمرانہ ریاست کی راہ ہموار ہوئی۔ لینن نے اجتماعی کاشتکاری اور قومیانے جیسے اقدامات کیے، لیکن یہ پالیسیاں بہت سخت اور ناقابل عمل ثابت ہوئیں۔ "جنگی کمیونزم" کی پالیسی میں کسانوں کی فصلیں ضبط کر لی گئیں، جس سے دیہی علاقوں میں فاقہ کشی شروع ہو گئی۔ لینن نے اپنی سخت معاشی پالیسیوں میں تبدیلیاں کرتے ہوئے NEP (New Economic Policy) متعارف کرایا، جس میں کچھ سرمایہ دار عناصر شامل تھے، لیکن یہ بھی متنازعہ تھا۔ اسے ان کے اصولوں کے ساتھ سمجھوتہ سمجھا جاتا تھا، اور اسے اشتراکیت کی ناکامی کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ لینن کی میراث نے سوویت یونین اور بین الاقوامی اشتراکی تحریک پر گہرا اثر ڈالا۔ دنیا بھر میں بہت سی کمیونسٹ تحریکوں نے انہیں اپنا سرچشمہ سمجھا۔ ولادیمیر لینن نے 20ویں صدی کے سب سے اہم انقلاب کی قیادت کی اور مساوات اور اشتراکیت کے اصولوں پر مبنی معاشرہ تشکیل دیا۔ ان کی پالیسیوں، ان کے نظریات اور ان کی قیادت کے انداز نے روس اور پوری دنیا میں اشتراکی تحریکوں پر گہرا اثر ڈالا۔ لینن کو آج بھی ایک عظیم انقلابی اور مفکر کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

5.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

روس کا انقلاب خاص طور پر 1917 کا انقلاب جدید تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے جس نے نہ صرف روس بلکہ پوری دنیا کو بہت متاثر کیا۔ 13ویں صدی سے لے کر زار کے دور تک کا مطالعہ کرنے سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ روس میں سیاسی، معاشی اور سماجی ناہمواریاں ایک طویل عرصے تک موجود تھیں، جو بالآخر انقلاب کا باعث بنیں۔ 1905 کے انقلاب نے تبدیلی کے مطالبے اور احتجاج کے احساس کو جنم دیا، لیکن یہ ناکام رہا۔ اس کے باوجود، اس نے مستقبل کی تحریک کے بیج بوئے، اور 1917 کے انقلاب کی راہ ہموار کی۔ انقلاب کے نتیجے میں ایک اشتراکی حکومت کا قیام عمل میں آیا، جس نے روس میں معاشرے، سیاست اور معیشت میں زبردست تبدیلیاں لائی تھیں۔ اس انقلاب میں لینن کا کردار فیصلہ کن ثابت رہا۔ اس نے اپنی قیادت اور نظریات سے روس کو ایک نئی سمت دی۔ مزید برآں، روسی انقلاب نے عالمی تاریخ میں اشتراکی نظریے کے پھیلاؤ کی راہ ہموار کی، جس نے بعد میں بہت سے ممالک میں کمیونسٹ تحریکوں کو ایک نئی راہ دی۔ اس سے سرد جنگ کا پس منظر پیدا ہوا اور سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان کشمکش کو جنم دیا۔ مجموعی طور پر، روسی انقلاب نے عالمی سیاسی منظر نامے کو مستقل طور پر متاثر کیا، اسے جدید تاریخ میں ایک خاص مقام دیا۔

5.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

بالشویک(Bolsheviks): روس کی ایک انقلابی جماعت جو 1903 میں Russian Social Democratic Labour Party سے الگ ہو کر قایم ہوئی، لینن کی پارٹی

مانشویک(Menshevik): روس کی ایک انقلابی جماعت جو Russian Social Democratic Labour Party سے الگ ہو کر قایم ہوئی لیکن منشویک سے لبرل تھی، کرنسکی اس کے اہم لیڈر تھے

اسکارا (Iskra) : روس کا ایک انقلابی اخبار، لینن جلاوطنی کے دوران اس کے ایڈیٹر تھے، روسی انقلاب میں اس نے اہم کردار ادا کیا تھا

نیم غلام(serf) : روس میں کسانوں کا ایک طبقہ جس کے پاس خود کی زمین نہ ہوتی تھی

ڈیوما (Duma) : 1905 کے روسی انقلاب کے دوران قائم ہونے والی نمائندہ اسمبلی

نہی لزم(Nihilism) : انیسویں صدی کے آخر میں اشتراکی نظریہ سے متاثر روس کا ایک اشتراکی نظریہ، جس کے ذریعہ ہر مروجہ نظام کی مخالفت کی گئی۔ میکل باکون اس نظریہ کا بانی تھا

نارودنیکی(Narodnik) : روس میں 19ویں صدی کے آخر میں روس کی ایک تحریک۔ نرودنیکی سماجی اصلاح کاروں اور انقلابیوں کا ایک گروپ تھا جو کسانوں اور دیہی برادریوں کو اصلاح کا بنیادی ذریعہ سمجھتے تھے

5.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.13 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. روس سے جلاوطنی کے دوران لینن کس اخبار کے ایڈیٹر تھے؟
2. فروری انقلاب کے بعد کس کی قیادت میں حکومت قایم ہوئی؟
3. لینن کا تعلق کس روسی انقلابی پارٹی سے تھا؟
4. نیم غلامی (serfdom) سے کیا مراد ہے؟
5. نہی لزم(Nihilism) کیا تھا؟
6. روسی انقلاب کے دوران پیٹرز برگ'(Saint Petersburg) کا نام بدل کر کیا رکھا گیا؟
7. پیٹر اعظم کی وفات کے بعد روس کا حکمراں کون بنا؟
8. روس میں NEP(New Economic Policy) کی شروعات کس نے کی؟
9. روس میں کس روز کو 'خونی اتوار' کے نام سے جانا جاتا ہے؟

10. روسی انقلاب کے دوران روس کا حکمراں کون تھا؟

5.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. روسی انقلاب کے معاشی اسباب پر ایک نوٹ لکھیں۔
2. 1905 کے روسی انقلاب کا جائزہ لیں۔
3. روسی انقلاب میں پہلی عالمی جنگ کا کیا رول تھا۔ روشنی دالیں۔
4. فروری انقلاب کے بعد قائم عارضی حکومت کا تنقیدی تجزیہ پیش کریں۔
5. 1917 کے روسی انقلاب کے آغاز پر ایک نوٹ تحریر کریں۔

5.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. روسی انقلاب میں لینن کے کردار پر بحث کریں۔
2. روسی انقلاب کے اثرات پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کریں۔
3. روسی انقلاب کے سیاسی، معاشی اور سماجی اسباب کو بیان کریں۔

5.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Deshpande, Anirudh, *Vishwa Itihas ke Pramukh Mudde: Badalte Aayaam* (Hindi), Hindi Madhyam Karyanvaya Nirdeshalay, Delhi University, 2011.
2. Gupta, Parthasarthi, *Europe ka Itihas* (Hindi), Hindi Madhyam Karyanvaya Nirdeshalay, Delhi University, 1983.
3. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
4. Kaushik, Karuna, *History of Communist Russia, 1917–1991*, Macmillan, New Delhi, 2006.
5. Lowe, Norman, *Mastering Modern World*, Macmillan, London, 1988.
6. Mathur, L.P., *Twentieth Century World*, Pointer Publishers Jaipur, India, 2004.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Stephen Lee, J., *Lenin and Revolutionary Russia*, Routledge, London, 1987.
11. Trotsky, Leon, *The History of the Russian Revolution*, Victor Gollancz Ltd., London, 1984.
12. Verma, Lal Bahadur, *Adhunik Vishwa Ka Itihas* (Hindi), Hindi Madhyam Karyanvaya Nirdeshalay, Delhi University, 2013.
13. Wade R.A. ed., *Revolutionary Russia*: *New Approaches,* Routledge, London, 2004.

اکائی 6۔ مجلسِ اقوام اور تحفظ اجتماعی

(The League of Nations and Collective Security)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 مجلسِ اقوام کا قیام

6.3 مجلسِ اقوام کے اہم مقاصد

6.4 مجلسِ اقوام کی رکنیت

6.5 مجلسِ اقوام کی تنظیم سازی

6.5.1 جنرل اسمبلی

6.5.2 کونسل

6.5.3 بین الاقوامی عدالتِ انصاف

6.5.4 سیکرٹریٹ

6.6 کمیشن اور کمیٹیاں

6.7 مجلسِ اقوام کی کارکردگی کی تشخیص

6.8 سیاسی تنازعات کے حل میں مجلسِ اقوام کا کردار

6.9 مجلسِ اقوام سے باہر بین الاقوامی معاہدے

6.10 مجلسِ اقوام اور ہسپانوی خانہ جنگی

6.11 مجلسِ اقوام کی غیر سیاسی کامیابیاں

6.12 مجلسِ اقوام کے کمیشن

6.13 مجلسِ اقوام کی ناکامی کے اسباب

6.14 مجلسِ اقوام کے عہد کی خامیاں
6.15 اکتسابی نتائج
6.16 کلیدی الفاظ
6.17 نمونہ امتحانی سوالات
6.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید (Introduction)

پہلی عالمگیر جنگ(1914–18) کے دوران، ووڈرو ولسن نے مستقبل میں جنگ روکنے کے لیے ایک ادارے کے طور پر مجلسِ اقوام کے قیام پر زور دیا تھا۔ اس لئے، پیرس امن معاہدے کی جنرل کونسل میں مجلسِ اقوام سے متعلق قرارداد پر بحث ہوئی، اور اس میں شریک تمام اقوام کی رضامندی سے مجلسِ اقوام قائم کی گئی۔ اس طرح، 10 جنوری 1920 کو باضابطہ طور پر ورسائی معاہدہ عمل میں آنے کے بعد مجلسِ اقوام وجود میں آگئی۔ مجلسِ اقوام کا بنیادی مقصد بین الاقوامی تنازعات کو حل کرنا، اور جنگ روکنا تھا۔ کچھ ابتدائی پریشانیوں کے علاوہ، مجلسِ اقوام نے 1920 کی دہائی میں کامیابی سے کام کیا۔ اس تنظیم نے متعدد چھوٹے بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور سماجی کامیابیاں بھی حاصل کی۔ اس نے ہزاروں مہاجروں، پناہ گزینوں اور سابق جنگی قیدیوں کو دوبارہ گھر کا راستہ تلاش کرنے میں مدد کی۔ 1930 میں مجلسِ اقوام کے حامی اس کے مستقبل کے بارے میں کافی پُرامید نظر آرہے تھے۔ جنوبی افریقہ کے سیاست دان جان سمٹز نے مجلسِ اقوام کے بارے میں یہ تبصرہ پیش کیا کہ 'ہم تاریخ کے ایک عظیم معجزے کا مشاہدہ کر رہے ہیں'۔ تاہم، 1930 کی دہائی کے دوران مجلسِ اقوام کی بالادستی کو کئی بار چیلنج کیا گیا؛ مثال کے طور پر، 1931 میں، جاپان نے منچوریا پر حملہ کیا؛ اور بعدازاں، 1935 میں، اٹلی نے ابیسنیا (Abyssinia) پر حملہ کیا۔ دونوں جارحیت پسند ملکوں نے مجلسِ اقوام کے احکامات کو نظرانداز کیا، اور مختلف وجوہات کی بنا پر مقبوضہ اراضی سے فوج نکالنے سے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ 1935 کے بعد مجلسِ اقوام کی حیثیت اور شہرت میں کمی واقع ہوئی؛ اور اس کی کمزوریاں واضح ہونے لگی۔ چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کے ساتھ تنازعات کے دوران، جرمنی نے مجلسِ اقوام کے ساتھ کسی طرح کا مشورہ نہیں کیا۔ اس طرح، مجلسِ اقوام دوسری عالمگیر جنگ کو روکنے کے لیے معمولی اثر ورسوخ استعمال کرنے سے قاصر رہی۔ دسمبر 1939 کے بعد مجلسِ اقوام کا کوئی اجلاس منعقد نہیں ہوا۔ 1946 میں، اسے ایک مکمل ناکامی کے طور پر منسوخ کردیا گیا۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ مجلسِ اقوام کے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈال سکیں گے۔

- مجلسِ اقوام کا قیام۔

- مجلسِ اقوام کے اغراض و مقاصد۔
- مجلسِ اقوام کی تنظیم سازی۔
- سیاسی تنازعات کے حل میں مجلسِ اقوام کا کردار۔
- مجلسِ اقوام کی غیر سیاسی کامیابیاں۔
- مجلسِ اقوام کی ناکامی کے اسباب۔

6.2 مجلسِ اقوام کا قیام (Establishment of the League of Nations)

عام طور پر، مجلسِ اقوام کو امریکی صدر ووڈرو ولسن کی ذہنی تخلیق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ولسن یقینی طور پر امن اور بین الاقوامی تنظیم کے قیام کے بہت بڑے حامی تھے، لیکن یہ مجلس پہلی عالمی جنگ کے دوران متعدد عالمی سیاست دانوں کی دی گئی اسی طرح کی تجاویز کا بھی نتیجہ تھی۔ برطانیہ کے لارڈ رابرٹ سیسل، جنوبی افریقہ کے جان سمٹز اور فرانس کے لیون بورژوا نے تفصیلی منصوبے اور تدابیر پیش کیں، جن میں بتایا گیا تھا کہ ایسی تنظیم کیسے قائم کی جاسکتی ہے۔ لائیڈ جارج نے اسے برطانیہ کے جنگی مقاصد میں سے ایک قرار دیا تھا، اور ولسن نے اسے اپنے چودہ نکاتی پروگرام میں آخری نکتے کے طور پر پیش کیا تھا۔ ولسن نے اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ مختلف بین الاقوامی کمیٹیوں (جن میں سیسل، سمٹز، بورژوا اور بیلجیم کے پال ہیمنز نے شرکت کی) میں تیار کردہ مجلسِ اقوام سے متعلق عہد کو متعدد امن معاہدوں میں شامل کیا جائے۔ مجلسِ اقوام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بین الاقوامی تعاون، امن اور سلامتی کو فروغ دیا جائے۔ مجلسِ اقوام سے متعلق عہد نامے میں تین بنیادی مقاصد بہت اہم تھے۔ عہد نامے کے آرٹیکل VIII میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ "امن کی بحالی کے لیے جنگی ہتھیاروں میں کمی کی ضرورت ہے"۔ آرٹیکل X میں بتایا گیا ہے کہ " مجلسِ اقوام کے ممبران بیرونی جارحیت کے خلاف علاقائی سالمیت کی طرف توجہ دیں گے، اور موجودہ سیاسی آزادی کا احترام اور تحفظ کرنے کا عہد کریں گے۔ ایسی کسی جارحیت یا خطرے کی صورت میں، مجلسِ اقوام ایسی تدابیر پیش کرے گا جس کے ذریعے اس ذمہ داری کو پورا کیا جائے گا۔ آرٹیکل XVI میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ "اگر مجلس کا کوئی رکن دوسرے رکن کے خلاف جنگ کا اعلان کرے، تو اس کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ وہ دیگر تمام اراکین کے خلاف بھی جنگ کا ارتکاب کرچکا ہے۔" اس آرٹیکل میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ دیگر ارکان کو جارح ملک کے ساتھ تمام تجارتی یا مالی تعلقات منقطع کرنے چاہئے، اور مجلسِ اقوام کے کونسل کی سفارش پر اس کے خلاف مسلح طاقت کا اجتماعی استعمال کرنا چاہیے۔

6.3 مجلسِ اقوام کے اہم مقاصد (Chief Objectives of the League of Nations)

مجلسِ اقوام کے اہم مقاصد میں درج ذیل شامل ہیں:

- اقتصادی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے بین الاقوامی تعاون، امن اور سلامتی کو فروغ دینا۔
- جنگ کو روکنا اور اس مقصد کے لیے مختلف اقوام کے درمیان تنازعات کو پُرامن طریقوں سے ہل کرنا۔

- امن معاہدوں کے شرائط کی نگرانی کرنا۔
- مہلک ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی مقدار کو قابو میں رکھنا۔

6.4 مجلسِ اقوام کی رکنیت (Membership of the League of Nations)

مجلسِ اقوام کی رکنیت دنیا کے تمام ممالک کے لیے کھلی تھی۔ مجلسِ اقوام کے ارکان کی دو قسمیں تھیں۔ پہلی قسم 31 ممالک اور نوآبادیوں پر مشتمل تھی جنھوں نے امن معاہدوں پر دستخط کیے تھے اور جنھیں مجلسِ اقوام کے رکن بننے کی دعوت دی گئی تھی۔ دوسری قسم میں وہ ممالک شامل ہیں جنھوں نے بین الاقوامی امن کے اصولوں پر عمل کرنے کا وعدہ کیا، اور اس کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے درخواست کی۔ تاہم، شروع میں روس اور جرمنی کو اس کے رکن بننے کی اجازت نہیں دی گئی۔ امریکہ مجلسِ اقوام کا رکن نہیں بنا۔ اس کے علاوہ، کوئی بھی ملک دو سال کا نوٹس دے کر اپنی رکنیت ختم کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں، مجلسِ اقوام کی کونسل متفقہ قرارداد منظور کر کے کسی بھی ملک کی رکنیت ختم کر سکتا تھا۔ مجلس کے چار مستقل ارکان تھے جن میں اٹلی، فرانس، برطانیہ اور جاپان شامل تھے۔ پہلی عالمی جنگ میں ہارنے والے ممالک جیسے جرمنی، ہنگری اور آسٹریا کو مجلسِ اقوام میں شامل نہیں ہونے دیا گیا۔ کمیونزم کو بے اثر کرنے کے لئے برطانیہ اور فرانس نے روس کو مجلسِ اقوام میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دے دی۔ امریکہ بھی اس مجلس میں شامل نہیں ہوا کیونکہ سینیٹ (Senate) نے 'تنہائی پسند پالیسی' کے حق میں ووٹ دیا، جس کے تحت امریکہ یورپی اور عالمی معاملات سے باہر رہا۔ الغرض، شروعات میں مجلسِ اقوام کے 42 ارکان تھے؛ اور 1926 میں ان کی تعداد 55 ہو گئی تھی، جب جرمنی کو بھی مجلس کے رکن کرے طور پر تسلیم کیا گیا۔

6.5 مجلسِ اقوام کی تنظیم سازی (Organisation of the League of Nations)

مجلسِ اقوام کے پانچ اہم اعضاء تھے جن پر مندرجہ ذیل صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی:

6.5.1 جنرل اسمبلی (The General Assembly)

مجلسِ اقوام کا ہر رکن اسمبلی میں تین نمائندے بھیج سکتا تھا لیکن صرف ان کا لیڈر ہی کسی بھی مسئلے پر ووٹ دے سکتا تھا۔ کسی بھی قرارداد کی منظوری کے لیے تمام اراکین کی رضامندی ضروری تھی۔ ہر سال ستمبر میں اس کا اجلاس جنیوا میں منعقد ہوتا تھا لیکن ضرورت پڑنے پر خصوصی اجلاس بھی بلایا جا سکتا تھا۔ مجلسِ اقوام کے ممبران کے ذریعے منتخب ہونے والا سیکرٹری جنرل مجلس کے تمام کاموں کو انجام دیتا تھا۔ اس تنظیم کے ممبران میں سے ایک ممبر کو اسمبلی کا صدر منتخب کیا جاتا تھا۔ اس کا سالانہ بجٹ اس کے تمام اراکین کی موجودگی میں پاس کیا جاتا تھا۔ بجٹ کو تین فہرستوں یعنی سیکرٹریٹ، خصوصی تنظیموں اور بین الاقوامی عدالت میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ جنرل اسمبلی مجلسِ اقوام کے کام کی نگرانی کرتی تھی۔ یہ اسمبلی ایک مشاورتی ادارہ تھا۔ اس کے اجلاس کھلے عام منعقد ہوا کرتے تھے۔ اسے چارٹر میں ترامیم تجویز کرنے کا پورا حق حاصل تھا۔ لیکن اس طرح کی ترامیم کونسل کی منظوری کے بعد ہی عمل میں لائی جاتی تھی۔

6.5.2 کونسل (The Council)

کونسل مجلسِ اقوام کا انتظامی یا عملی ادارہ تھا۔ شروعات میں یہ ادارہ نو ارکان پر مشتمل تھا۔ نو ممبران میں سے امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی اور جاپان مستقل ممبر تھے اور باقی چار ممبر عارضی تھے۔ چونکہ امریکہ مجلسِ اقوام کا رکن نہیں بنا، اس لئے مستقل ارکان کی تعداد کم ہو کر چار رہ گئی۔ 1939 میں برطانیہ، فرانس اور روس کونسل کے تین مستقل ممبر تھے، اور عارضی ممبران کی تعداد 11 ہو چکی تھی۔ کونسل کو سال بھر میں چار بار اجلاس منعقد کرنے پڑھتے تھے، لیکن ضرورت پڑنے پر کونسل خصوصی اجلاس بھی بلا سکتا تھا۔ کونسل مندرجہ ذیل امور پر غور کر سکتی تھی:

- سیکرٹری جنرل اور دفتری عملے کی تقرری کی تصدیق۔
- اسلحوں کی تخفیف کے منصوبے تیار کرنا۔
- مجلسِ اقوام کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے ممبران کے خلاف کارروائی کرنا۔
- لیکن اس کا بنیادی کام بین الاقوامی تنازعات کو حل کرنا تھا۔

کونسل کے تمام فیصلے اکثریتی رائے سے لیے جاتے تھے۔ یہ جنرل اسمبلی کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ دار تھی۔ اسے جنرل اسمبلی کو ہدایات دینے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ کونسل نے وقتاً فوقتاً متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں کو منعقد کیا۔ اس کے علاوہ، کونسل کو ایک نظام کے تحت مختلف علاقوں کی انتظامیہ کی نگرانی کا اختیار دیا گیا۔ مزید برآں، اس کے مستقل ارکان کے پاس ویٹو کا اختیار تھا، جبکہ عارضی ارکان کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا۔

6.5.3 بین الاقوامی عدالتِ انصاف (The International Court of Justice)

مجلسِ اقوام کے چارٹر کے مطابق 1922 میں ہیگ میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف قائم کی گئی۔ شروع میں اس کے گیارہ جج اور چار ذیلی جج تھے۔ ان افسروں کو اسمبلی نو سال کی مدت کے لیے منتخب کرتی تھی۔ 1931 میں مختلف ملکوں کے ججوں کی تعداد بڑھا کر پندرہ کر دی گئی اور ذیلی ججوں کے عہدے ختم کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ، تمام جج ممبران ایک کو صدر اور دوسرے کو نائب صدر کے طور پر منتخب کرتے تھے۔ یہ عدالت بین الاقوامی تنازعات سننے کی ذمہ دار تھی اور اس کا فیصلہ حتمی ہوتا تھا۔ جنرل اسمبلی اور کونسل بین الاقوامی معاملات میں اس سے مشورہ لے سکتے تھے۔ اس کا بنیادی کام چارٹر کے دفعات کی وضاحت کرنا، بین الاقوامی معاہدوں پر غور و فکر کرنا اور رکن کی جانب سے بین الاقوامی فرائض کی خلاف ورزی کرنے پر عائد کیے جانے والے معاوضے کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے 1922 سے لے کر 1939 تک بہت جوش اور ولولے سے کام کیا۔ اس مختصر مدت کے دوران، مجلسِ اقوام نے 66 مقدمات کامیابی سے حل کر کے اس خیال کا احترام کیا کہ بین الاقوامی سیاست میں ایک قبول شدہ ضابطہ اخلاق کے لیے جگہ موجود ہے۔

6.5.4 سیکرٹریٹ (The Secretariat)

مجلسِ اقوام کے تمام مہمات سیکرٹریٹ کے ذریعے انجام دئے جاتے تھے۔ سیکرٹری جنرل کا انتخاب اس بین الاقوامی ادارے کے تمام ممبران کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ اسے اپنے ماتحت نائبین مقرر کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ سیکرٹریٹ میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے تقریباً چھ سو ملازمین کام کرتے تھے۔ اس کا بنیادی کام جنرل اسمبلی اور کونسل میں بحث کے لیے ایجنڈا تیار کرنا، اور ان کے اجلاسوں کی کارروائی کو برقرار رکھنا تھا۔ مجلسِ اقوام کے تمام انتظامی کام سیکرٹریٹ کے سپرد ہوتے تھے۔ یہ بین الاقوامی معاہدوں کی فہرست بناتا تھا، اور انہیں دفتری دستاویزات میں درج کرتا تھا۔ اس نے ایک طرح کی بین الاقوامی سول سروس کے طور پر کام کیا جس میں 30 سے زیادہ مختلف ممالک کے اراکین شامل تھے۔

6.6 کمیشن اور کمیٹیاں (Commissions and the Committees)

یہ کمیٹیاں کچھ خصوصی گروہ تھے جو کسی خاص مسئلے کو حل کے لیے قائم کی گئی تھیں۔ یہ کمیٹیاں اکثر ترقی پذیر ممالک، انسانی جانوں سے متعلق نقصانات اور اقتصادی مسائل پر توجہ مرکوز کرتی تھیں۔ ان میں سے بہت سی کمیٹیاں مخصوص مسائل سے نمٹنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ متعدد کمیٹیاں ایسی تھیں جو پہلی عالمی جنگ کے اختتام کے فوراً بعد قائم کی گئیں۔ بعض کمیشن ایسے بھی تھے جنہوں نے نوآبادیاتی اراضی، فوجی امور، اقلیتی گروہوں اور اسلحوں کی تخفیف پر دھیان دیا؛ اور بعض کمیشن دنیا بھر کے مزدور، عوامی صحت، اقتصادیات، مالیاتی نظام، بچوں کی بہبودی، منشیات کے مسائل اور نسوانی حقوق پر توجہ مرکوز کرتے تھے۔ مجلسِ اقوام کا بنیادی کام امن قائم کرنا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مجلس مندرجہ ذیل طریقوں کے مطابق کام کرے:

- مجلسِ اقوام نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ جنگ کی دھمکی دینے والے تمام تنازعات مجلس کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔
- مجلس نے یہ بات بھی واضح کی تھی کہ کوئی بھی رکن اپنے مقاصد کی حصولیابی کے لئے جنگ کا سہارا نہیں لے گا، اور مجلسِ اقوام سے متعلق عہد نامے کو نہیں توڑے گا۔
- اگر کسی بھی رکن نے جنگ کا راستہ اختیار کیا، تو اسے باقی ارکان کی طرف سے اجتماعی کارروائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

6.7 مجلسِ اقوام کی کارکردگی کا معائنہ (Evaluation of the Work of the League of Nations)

مجلسِ اقوام تقریباً بیس سال تک قائم رہی۔ اس عرصے میں اس کا بنیادی کام بین الاقوامی تنازعات کو پُرامن طریقے سے حل کرنا تھا۔ اس کے علاوہ، اسے کئی غیر سیاسی افعال جیسے سماجی، اقتصادی اور انسانی بہبود کے کام بھی انجام دینے پڑتے تھے۔ اگرچہ مجلسِ اقوام کئی معاملات میں کامیاب ہوئی، لیکن سیاسی میدان میں مجلس کو کئی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بین الاقوامی تنازعات کو پُرامن طریقے سے حل کرنے کے لیے، مجلسِ اقوام کے عہد نامے میں درج ذیل دفعات شامل کیے گئے:

- مجلسِ اقوام کے عہد کو قبول کرتے ہوئے ارکان ممالک نے اجتماعی سلامتی کے اصول کو تسلیم کیا۔ معاہدے کی شق نمبر 10 کے مطابق

مجلسِ اقوام کے ارکان نے اعتراف کیا کہ بیرونی خطرات کی صورت میں وہ ایک ساتھ مل کر کسی بھی رکن کی سیاسی آزادی اور علاقائی سالمیت کا دفاع کریں گے۔

- شق نمبر 11 سے 15 کے مطابق جنگ یا جنگ شروع کرنے کا خطرہ مجلسِ اقوام کے لیے تشویش کا باعث ہوگا۔ لہٰذا، اسمبلی کا کوئی بھی رکن کونسل کا اجلاس بلانے کی درخواست کر سکتا ہے تا کہ ان حالات پر غور کیا جا سکے جس کے نتیجے میں دو یا دو سے زائد ممالک کے درمیان جنگ شروع ہونے کے امکانات واضح ہو۔
- تنازعے کو حل کرنے کے طریقے اور ذرائع کی وضاحت شق نمبر 13 میں کی گئی تھی۔ اس شق کے مطابق، تمام ممالک کسی بھی قسم کے تنازعے کی ثالثی کے لئے مجلسِ اقوام کے کونسل سے رجوع کرنے پر متفق تھے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ کونسل کی جانب سے ثالثی کے فیصلے کے تین ماہ تک متعلقہ ارکان جنگ کا سہارا نہیں لیں گے۔
- مجلسِ اقوام سے متعلق عہد نامے کی پندرہویں شق میں کونسل میں پیش کیے جانے والے تنازعات کی نوعیت تفصیل سے بیان کی گئی تھی۔
- اگر کوئی ملک جنگ میں شامل ہو جائے تو کونسل کے پاس اس کے خلاف معاشی بائیکاٹ یا فوجی کاروائی کی سفارش کرنے کا پورا اختیار تھا۔

6.8 سیاسی تنازعات کے حل میں مجلسِ اقوام کا کردار

(Role of the League of Nations in Solving Political Disputes)

اپنی بیس سال کی زندگی کے دوران مجلسِ اقوام کے سامنے سیاسی نوعیت کے 75 تنازعات پیش کیے گئے تھے جن میں سے مجلس نے 35 مقدمات کا فیصلہ سنایا۔ اس کے علاوہ، بیس تنازعات ایسے تھے جنہیں متاثرہ ممالک نے خود حل کیا۔ بقیہ بیس تنازعات میں مجلسِ اقوام کسی قسم کی کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ مجلس نے جن تنازعات کو کامیابی سے حل کیا ان میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

آلینڈ تنازعہ (Auland Dispute)

1920 میں فن لینڈ اور سویڈن کے درمیان آلینڈ جزائر کی ملکیت کے تنازعہ کو برطانیہ نے مجلسِ اقوام کے سپرد کیا۔ مجلس کے کونسل نے اس معاملے کے بارے میں حقائق جمع کرنے کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر کونسل نے ان جزائر سے سویڈن کی فوج نکالنے کا فیصلہ سنایا۔ اس طرح، مجلس نے ان جزائر کے لوگوں کو فن لینڈ کے تحت خود مختاری حاصل کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ اس فیصلے کو دونوں ممالک نے قبول کیا۔

ولنا تنازعہ (Vilna Dispute)

ولنا پہلے لتھوانیا کا دارالخلافہ تھا۔ 1920 میں، روس نے ولنا کو لتھوانیا کے حوالے کرنے پر اتفاق کیا۔ لیکن پولینڈ، جو ولنا پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، نے مجلسِ اقوام سے اپیل کی۔ مجلسِ اقوام کے فیصلہ صادر ہونے سے ایک دن پہلے ہی پولینڈ نے ولنا پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ مجلسِ اقوام نے دونوں ممالک کو مشورہ دیا کہ وہ اس تنازعہ کو مذاکرات سے حل کریں۔ بالآخر، 1923 میں ولنا کو پولینڈ میں ضم کر دیا گیا۔

میمل تنازعہ(Memel Dispute)

ورسائی معاہدے کے مطابق میمل علاقے کو پولینڈ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جنوری 1923 میں لیتھوانیا کی فوجوں نے میمل پر قبضہ کر لیااور اس علاقے میں ایک عارضی حکومت قائم کی۔اس کے بعد یہ مسئلہ مجلسِ اقوام کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجلس کے کونسل نے اس معاملے پر مشاورت کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی کی سفارشات کے مطابق میمل پر لتھوانیا کی بالادستی ان شرائط کے ساتھ قائم کی گئی کہ میمل کو اندرونی خود مختاری حاصل ہونی چاہئے،اور میمل بندرگاہ کی نگرانی بین الاقوامی ادارے کے ذریعے ہونی چاہئے۔

البانیہ تنازعہ(Albania Dispute)

یونان (Greece)اور یوگوسلاویہ البانیہ کو اپنے درمیان تقسیم کرنا چاہتے تھے لیکن مجلسِ اقوام نے البانیہ کو ایک آزاد ملک کے طور پر قبول کیا تھا۔ 1921 میں یوگوسلاویہ کے مسلح دستے نے البانیہ پر حملہ کیا۔البانیہ، جو مجلسِ اقوام کا رکن تھا، نے تنازعہ کے حل کے لیے کونسل سے اپیل کی۔ کونسل نے البانیہ کی سرحدیں طے کیں جسے یوگوسلاویہ نے قبول کر لیا۔

سائلیسیا تنازعہ(Silesia Dispute)

سائلیسیا پر قبضہ کرنے کے لئے جرمنی اور پولینڈ کے درمیان تنازعہ تھا۔مارچ 1921 میں،اس خطے میں جرمنی یا پولینڈ کے ساتھ اس کے انضمام کے معاملے پر ریفرنڈم ہوا۔اس علاقے کے لوگوں کی اکثریت نے جرمنی کے ساتھ اس کے انضمام کے حق میں ووٹ دیا۔اس کے بعد، پولینڈ نے بالائی سائلیسیا کے ان علاقوں پر قبضے کا دعویٰ کیا ہے جہاں پولسکی یا پولستانی زبان بولنے والوں کی اکثریت تھی۔ پولینڈ نے فوج بھیج کر اس علاقے پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ کونسل نے بلجیم، برازیل، چین اور اسپین کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی منتخب کی۔اس کمیٹی کی سفارشات پر سائلیسیا کو جرمنی اور پولینڈ کے درمیان تقسیم کر دیا گیا؛اور دونوں ممالک نے کونسل کے فیصلے کو تسلیم کر لیا۔

کورفو تنازعہ (Corfu Dispute)

اگست 1923 میں، اٹلی کے چند شہریوں کو یونان (Greece) میں قتل کر دیا گیا۔اطالوی حکومت نے یونان کو خبردار کیا،اور اس سے غیر مشروط معافی اور پانچ کروڑ ڈالر کے معاوضے کا مطالبہ کیا۔ یونان سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر ان مطالبات کو تسلیم کرے۔ اگرچہ یونان نے اٹلی کے زیادہ تر مطالبات تسلیم کر لیے، لیکن اس نے اُن مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیا جس سے ایک آزاد ملک کی حیثیت اور وقار کو ٹھیس پہنچ سکتا ہے۔اس بنا پر اٹلی نے جزیرہ کورفو پر زبردستی قبضہ کر لیا جو یونان کے ماتحت تھا۔ یونان نے مجلسِ اقوام سے اپیل کی۔ مجلسِ اقوام کے کونسل نے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ تحقیق کے بعد کمیٹی نے سفارش کی کہ یونان اٹلی کی طرف بدنظمی کا معاوضہ ادا کرے، اور یونان اطالوی شہریوں کو قتل کرنے والے افراد کو سزا دے۔ ان سفارشات کو دونوں ممالک نے قبول کیا، اور اٹلی نے کورفو سے اپنی فوجیں واپس بلالیں۔

موصل تنازعہ (Mosul Dispute)

لوسین معاہدے (1923) کے مطابق اتفاق رائے سے نو ماہ کی مدت میں ترکی اور عراق کی سرحدیں طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عرصے میں دونوں ممالک اس معاملے پر کسی سمجھوتے پر پہنچنے میں ناکام رہے۔ برسلز میں منعقد ہوئے اجلاس میں کونسل نے دونوں ممالک کی سرحدوں کے حوالے سے اپنا فیصلہ سنایا۔ 1925 میں برسلز کے فیصلے کو دونوں ممالک نے قبول کر لیا۔

یونان اور بلغاریہ کے درمیان سرحد پر تنازعہ (Border Dispute between Greece and Bulgaria)

اکتوبر 1925 میں، یونان (Greece) اور بلغاریہ کے درمیان سرحد پر تنازعہ کے حوالے سے مسلح تصادم شروع ہوا۔ بلغاریہ نے مجلسِ اقوام سے اپیل کی۔ مجلسِ اقوام کے کونسل نے دونوں ممالک کو اپنی فوجیں واپس بلانے کا حکم دیا۔ کچھ دیر بعد کونسل نے معاملے کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا۔ کمیشن کی سفارشات کے ذریعے یونان سے کہا گیا کہ وہ بلغاریہ کو جنگی معاوضہ ادا کرے، اور یہی رقم مارچ 1926 میں یونان نے بلغاریہ کی طرف ادا کر دیا۔

پیرویا اور کولمبیا تنازعہ (Piruvia-Columbia Dispute)

1932 میں پیرویا کی فوج نے کولمبیا کی بندرگاہ لتاسیا پر قبضہ کر لیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مدد سے، مجلسِ اقوام نے پیرویا پر دباؤ ڈالا کہ وہ لتاسیا بندرگاہ سے نکل جائے۔ اس طرح مجلسِ اقوام چھوٹے ملکوں کے درمیان تنازعات کو پُرامن طریقے سے حل کرنے میں کامیاب رہی لیکن وہ ایسے تنازعات کو حل کرنے میں ناکام رہی جن کا تعلق بڑے اور طاقتور ملکوں سے تھا۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس کی کچھ مثالیں بیان کی گئی ہیں:

منچوریا پر جاپان کا حملہ (Attack on Manchuria by Japan)

1931 میں جاپان نے چین میں منچوریا پر حملہ کیا۔ چین نے مجلسِ اقوام سے اپیل کی۔ مجلسِ اقوام نے اس معاملے کی تحقیقات کے لیے لیٹن کمیشن مقرر کی۔ لیٹن کمیشن نے جاپان کو ایک جارح ملک قرار دیا، لیکن جنرل اسمبلی نے ایک ایسا منصوبہ تیار کرنے کوشش کی جو چین اور جاپان کے لیے قابل قبول ہو۔ اگرچہ کمیٹی نے جاپان کے اس دعوے کو قبول نہیں کیا کہ منچوریا پر حملہ کوئی فوجی مہم نہیں بلکہ پولیس کاروائی تھی، لیکن اس میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ جاپان نے مجلسِ اقوام کے عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔ 24 جنوری 1933 کو کمیٹی کی رپورٹ کو جنرل اسمبلی نے اپنے اجلاس میں اکثریتی رائے سے قبول کر کیا۔ جاپان نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مجلسِ اقوام کی رکنیت واپس لے لی۔ جاپان کے خلاف کوئی موثر کارروائی کرنے کی ناکامی مجلسِ اقوام کے وجود کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس طرح، ایک طاقتور ملک کی طرف سے اجتماعی سلامتی کے اصول کی کھلم کھلا خلاف ورزی نے مجلسِ اقوام کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا۔

ابیسنیا پر اٹلی کا حملہ (Attack of Italy on Abyssinia)

1935ء میں، مسولینی نے شمالی افریقہ کے ایک ملک ابیسنیا پر حملہ کیا۔ 13 دسمبر 1935 کو ابیسینیا نے مجلسِ اقوام سے اپیل کی۔

مجلسِ اقوام کے کونسل کے اجلاس میں اٹلی کے نمائندے نے ثالثی کے ذریعے معاملات طے کرنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن اس کی فوج نے اریٹیریا اور صومالی لینڈ میں پیش قدمی جاری رکھی۔ ابیسینیا نے دوبارہ مجلسِ اقوام سے اپیل کی۔ اٹلی کی مخالفت کے باوجود مجلسِ اقوام کے کونسل نے اس معاملے پر بحث شروع کی۔ 7 اکتوبر 1936 کو کونسل کی طرف سے مقرر کردہ ایک کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ اٹلی نے مجلسِ اقوام کے عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر اٹلی کے اقتصادی بائیکاٹ کے لیے سفارشات پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی، لیکن فرانس اور برطانیہ اٹلی کے ساتھ معاشی بائیکاٹ کے حق میں نہیں تھے۔ سر سیموئل ہوئر (Sir Samuel Hoare) اور لاول (Laval)، برطانیہ اور فرانس کے وزرائے خارجہ (بالترتیب) نے مسئلہ کے پرامن حل کے بارے میں ایک خفیہ معاہدہ کیا۔ معاہدے میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ابیسینیا کا وسیع علاقہ اٹلی کو دیا جائے۔ فرانس کی طرف سے جیسے ہی اس معاہدے کو عام کیا گیا تو برطانیہ کے عوام نے اس کی شدید مخالفت کی جس کی وجہ سے معاہدے کے شرائط پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس دوران اٹلی کی فوجیں ابیسینیا میں آگے بڑھتی رہیں۔ مئی 1936 کے پہلے ہفتے میں اطالوی فوجیں ابیسینیا کے دارالخلافہ ادیس ابابا میں داخل ہوئیں اور پورا ابیسینیا اٹلی کے قبضے میں آ گیا۔ اس تنازعہ کے بحث میں ابیسینیا کے مفرور شہنشاہ نے مجلسِ اقوام کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی۔ سوویت روس کے علاوہ کسی بھی ادارے نے ابیسینیا کے مسئلے کی حمایت نہیں کی۔ نتیجتاً اٹلی کے خلاف اقتصادی پابندیاں واپس لے لی گئیں۔ اٹلی نے مجلسِ اقوام کی اپنی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا کیونکہ بین الاقوامی تنظیم نے ابیسینیا کو اپنی رکنیت برقرار رکھنے کی اجازت دی۔ اس کے فوراً بعد برطانیہ اور فرانس نے ابیسینیا پر اٹلی کے تسلط کو تسلیم کر لیا۔ اس طرح، اٹلی کی فتح مجلسِ اقوام کی حیثیت پر ایک بھاری دھچکا تھا جس کے نتیجے میں مجلسِ اقوام کی شہرت یکسر ختم ہو گئی۔

6.9 مجلسِ اقوام سے باہر بین الاقوامی معاہدے (International Agreements Outside the League)

لوکارنو معاہدہ (Locarno Treaty, 1925)

1920 کی دہائی کے اوائل میں فرانس اور جرمنی کے درمیان تعلقات مخالف رہے جس کے نتیجے میں فرانسیسیوں نے روہر کے صنعتی علاقے پر حملہ کر کے جرمنی کا کوئلہ حاصل کیا۔ لیکن خارجہ سیکرٹری کے عہدے پر گستاو سٹریسمین (Gustav Stresemann) کی تقرری کے بعد تعلقات میں بہتری آنا شروع ہو گئی۔ انہوں نے فرانسیسی وزیر خارجہ ارسٹائیڈ برائنڈ (Aristide Briand) کو دونوں ممالک کے درمیان ایک نئے معاہدے پر دستخط کرنے کی دعوت دی۔ چونکہ لوکارنو (سوئٹزرلینڈ) ایک غیر جانبدار علاقہ تھا، اسی لئے سٹریسمین نے لوکارنو میں جرمنی کی جانب سے سات معاہدوں پر دستخط کیے جنہوں نے زمینی سرحدوں سے متعلق صلح ناموں کے علاوہ ورسائی معاہدے کی شرائط کو باضابطہ طور پر قبول کیا۔ جرمنی نے بھی الساس لورین پر اپنا دعویٰ ترک کر دیا۔ یہ معاہدہ اس لیے اہم تھا کیونکہ جرمنی کو پیرس میں ہونے والی امن کانفرنس میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ چونکہ جرمنی ابھی تک مجلسِ اقوام کا رکن نہیں تھا، اس لیے یہ اہم امن معاہدہ مجلس کے مینڈیٹ سے باہر ہوا۔ اس سے فرانس کی ساکھ مجروح ہوئی کیونکہ مجلسِ اقوام نے ظاہر کیا کہ فرانس جیسا طاقتور ملک مجلس کی کاروائی کے بغیر بھی کام کر سکتا ہے۔

کیلوگ اور برائنڈ معاہدہ (Kellog-Briand Pact)

پینسٹھ ممالک نے پیرس میں ملاقات کی جہاں انہوں نے ایک بہت بڑے امن معاہدے پر دستخط کیے جس میں کہا گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں لڑیں گے۔ چونکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ معاہدے کا حصہ تھا، اس لیے یہ معاہدہ مجلسِ اقوام سے باہر ہوا۔ اس نے ایک بار پھر ظاہر کیا کہ طاقتور ممالک مجلسِ اقوام سے آزادانہ طور پر کام کر سکتے تھے۔

6.10 مجلسِ اقوام اور ہسپانوی خانہ جنگی (The League of Nations and the Spanish Civil War)

1937 میں، جنرل فرانکو کی رجعتی قوتوں اور سپین کی لبرل جمہوری حکومت کے درمیان خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اٹلی اور جرمنی نے جنرل فرانکو کی بھرپور حمایت کی۔ اسپین کی حکومت نے مجلسِ اقوام سے مداخلت کی اپیل کی۔ جارح ملک کے خلاف کارروائی کرنے میں مجلسِ اقوام کی مدد کرنے کے بجائے، برطانیہ اور فرانس نے دوسرے ممالک کو ہسپانوی حکومت کو قرضوں اور ہتھیاروں سے مدد کرنے سے روکنے کے لیے ایک علیحدہ عدم مداخلت کمیٹی تشکیل دی۔ مئی 1938 میں، ہسپانوی حکومت نے مجلسِ اقوام سے درخواست کی کہ وہ اسے کچھ ممالک سے اسلحہ خریدنے کی اجازت دے۔ لیکن برطانیہ اور فرانس کے معاندانہ یا مخالفانہ رویے کی وجہ سے مجلسِ اقوام نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ نتیجتاً، جنرل فرانکو نے خانہ جنگی میں فتح حاصل کی، اور اس کی حکومت کو مجلسِ اقوام کے کئی بااثر ارکان نے تسلیم کیا۔ 1937 میں جاپان نے چین کے خلاف غیر اعلانیہ جنگ شروع کی۔ چین نے مجلسِ اقوام سے جاپان کے خلاف اقتصادی بائیکاٹ کی منظوری دینے کی درخواست کی۔ لیکن مجلسِ اقوام کے ارکان اس تجویز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس قصے نے مجلسِ اقوام کے خاتمے کی نشاندہی کی۔ ستمبر 1938 میں، جرمنی نے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کر لیا۔ مجلسِ اقوام، جو اس وقت تک ایک بے حیثیت تنظیم بن چکی تھی، جرمنی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے میں ناکام رہی۔ اس طرح دوسری عالمگیر جنگ کے شروع ہونے کے وقت مجلسِ اقوام ایک بے کار ادارہ بن چکا تھا۔ اپریل 1946 میں، باضابطہ طور پر اس کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

6.11 مجلسِ اقوام کی غیر سیاسی کامیابیاں (Non-Political Achievements of the League)

جنگی قیدیوں کی گھر واپسی مجلسِ اقوام کی پہلی غیر سیاسی کامیابی تھی۔ یورپ کے مختلف ممالک میں ایسے قیدیوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ جنگ کے دوران لاکھوں روسی، یونانی، ترک، آرمینی اور دیگر اپنے گھروں سے بے گھر ہو گئے۔ مجلسِ اقوام نے یہ بھاری ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی سے نبھائی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد روس میں ٹائیفائیڈ کی وبا کافی حد تک پھیل چکی تھی۔ خدشہ تھا کہ یہ بیماری یورپ کے دیگر حصوں میں بھی پھیل جائے گی۔ مجلسِ اقوام نے اس وبا پر قابو پانے کے لیے ڈاکٹروں کی متعدد ٹیمیں تعینات کیں۔ مجلسِ اقوام کے زیرِ اہتمام ہیضہ، چیچک، تپ دق اور دیگر مہلک بیماریوں کے پھیلاؤ کے اسباب پر طبّی تحقیق کی گئی اور ان کے علاج کے طریقے بیان کیے۔ مجلسِ اقوام نے بین الاقوامی تعاون کے ذریعے لوگوں کی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے عالمی ادارہ صحت (World Health Organisation) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔

جنگ کے نتیجے میں کئی ممالک کی معیشت بری طرح تباہ ہوگئی تھی۔ آسٹریا کی حالت انتہائی خراب تھی اور اس کی حکومت ملک کی معاشی بحالی کا بندوبست کرنے کی صورت میں نہیں تھی۔ مجلسِ اقوام نے آسٹریا کو اشیاء خوردنی بھیجے۔ اس نے آسٹریا کے لئے امریکہ، برطانیہ اور فرانس سے قرضوں کا بندوبست کیا۔ آسٹریا کو مجلسِ اقوام کے بین الاقوامی فنڈ سے دس کروڑ ڈالر کا قرضہ دلوایا۔ اس طرح، مجلسِ اقوام آسٹریا کی معاشی حالت میں بہتری لانے میں کامیاب رہی۔ ہنگری کی معاشی حالت بھی آسٹریا جیسی ہی تھی۔ دسمبر 1923 میں، مجلسِ اقوام نے ہنگری کی معیشت پر اپنا کنٹرول قائم کیا۔ مئی 1924 میں اس کی معاشی ترقی کے لیے ایک منصوبہ بنایا گیا۔ جون 1926 تک ہنگری کی معیشت مستحکم ہوچکی تھی۔ اسی طرح، مجلسِ اقوام نے یونان، بلغاریہ اور ایسٹونیا کی بھی مدد کی۔ اس نے سونے کے معیار کو ٹھیک کرنے میں ابیسینیا کی بھی مدد کی۔ مزید برآں، مجلسِ اقوام نے ڈانزنگ بندرگاہ کی ترقی کے لیے کئی ممالک سے قرضوں کا بندوبست کیا۔ مجلسِ اقوام نے نشہ آور ادویات اور غلامی کو ختم کرنے کے لیے بھی کئی اقدامات اٹھائے تھے۔ یہ مجلس بچوں کی صحت کے تحفظ کو بہتر بنانے میں بھی سرگرم رہی۔ اس نے خواتین کو استحصال سے بچانے کے لیے ایک مشاورتی ادارہ مقرر کیا۔ 1921 میں اس ادارے نے غیر اخلاقی مقاصد سے خواتین کی آمدورفت کو روکنے کے لیے قواعد وضع کیے۔ یہ قوانین 1933 میں مزید سخت کیے گئے۔ اس کے علاوہ، بچوں کی بہبودی کے لیے مشاورتی ادارے نے مختلف ممالک میں بچوں کی شادی کے لیے مقررہ کم از کم عمر کا مطالبہ کیا۔ اس میں غیر قانونی بچوں کے مسئلے پر بھی غور کیا گیا۔ مجلسِ اقوام نے فکری میدان میں تعاون کے لیے بین الاقوامی انجمنیں قائم کی۔ دنیا کے مختلف حصوں میں کئی انجمنوں کی مدد سے اس نے کئی سیمینار اور مباحثے منعقد کیے۔ مجلسِ اقوام نے کارپوریٹ ایجوکیشن پر لٹریچر کی دستیابی کا بھی اہتمام کیا۔ اس کے زیر سایہ کئی نامور مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس نے فحش ادبیات کی اشاعت کو روکنے کی بھی کوشش کی۔ مزید برآں مجلسِ اقوام نے بین الاقوامی قانون کی ضابطہ بندی کے لیے قابل ستائش کام کیا۔

یورپ کے متعدد ممالک میں صنعتی انقلاب کی پیشرفت سے صنعتی شہروں میں مزدوروں کے حالات کافی حد تک خراب ہوچکی تھی۔ اس نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان طبقاتی جنگ کی بھی نشاندہی کی۔ مجلسِ اقوام کی انٹرنیشنل لیبر تنظیم (International Labour Organisation) نے صنعتوں کے مالکان اور مزدوروں کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے کی پوری کوشش کی۔ اس نے مزدوروں کے درمیان اتحاد کو فروغ دیا جس کے نتیجے میں کئی ممالک نے مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے قوانین مرتب کیے۔ مینڈیٹ سسٹم کے تحت افریقہ میں جرمنی کی نوآبادیوں کے انتظامیہ کی ذمہ داری اور عرب خطوں میں لوگوں کی حالت بہتر بنانے کا کام مجلسِ اقوام کو سونپا گیا۔ مجلسِ اقوام نے یہ ذمہ داریاں برطانیہ اور فرانس کے سپرد کردی۔ ان دونوں ممالک نے یہ کام خلوص اور نیک نیتی سے انجام نہیں دیا۔ درحقیقت، مینڈیٹ نظام نوآبادیت کا ایک نیا رخ تھا۔ اگرچہ مجلسِ اقوام ایسے سیاسی تنازعات کو حل کرنے میں ناکام رہی جن میں بڑے ملکوں کے مفادات شامل تھے لیکن وہ انسان دوستی اور فلاح و بہبودی کی سرگرمیوں میں کافی حد تک کامیاب رہی۔

6.12 مجلسِ اقوام کے کمیشن (Commissions of the League)

مجلسِ اقوام نے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے، معاشی حالت استوار کرنے کے لئے، اور لوگوں کو وباہی بیماریوں سے نجات

دلانے کے لئے کئی کمیشن قائم کیے۔ان میں کچھ اہم کمیشنوں کے بارے میں ذیل میں تبادلہ خیال کیا گیا ہے:

انٹر نیشنل لیبر تنظیم (The International Labour Organisation)

اس تنظیم کا صدر دفتر جنیوا میں ہے۔اس کا مقصد آجروں اور حکومتوں کو ایسے قوانین پاس کرنے کی ترغیب دینا تھا جس سے کام کرنے والوں اور مزدوروں کی حالت بہتر ہو۔1922 میں ،اس نے رنگنے والے مصنوعات میں زہریلے سفید سیسے کے استعمال پر پابندی لگا دی۔ براعظم افریقہ کے تنگانیکا میں مشکل اور خوفناک کام کرنے کی وجہ سے بہت سے غلام اپنی جان کھو بیٹھے۔ مجلسِ اقوام نے اس عمل کی تنقید کی،اور غلاموں کی شرح اموات کو قابو میں لایا۔1919 میں ،اس نے چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کو مزدوری کرنے سے روکنے کی کوشش کی،لیکن زیادہ تر ممبران نے اس کی تنقید کی،کیونکہ بچوں کی آزادی ان کے لئے مہنگی ثابت ہو سکتی تھی۔1935 میں اس نے ایک دن میں کام کی میعاد کو آٹھ گھنٹے تک محدود کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب اراکین نے اس مسئلے پر اپنی رائے پیش کی،تو صرف چار ممالک نے اس کے حق میں ووٹ دیا،کیونکہ اس سے صنعتی ترقی بہت متاثر ہو سکتی تھی۔اس نے چھٹی والے دن کی تنخواہوں کو متعارف کرانے کی تجویز بھی پیش کی۔ لیکن،اس کا مذاق اڑایا گیا اور اسے صنعتوں کی ترقی کے لئے خودکشی قرار دیا گیا۔

کمیشن برائے مہاجرین (The Commission for Refugees)

اس کا مقصد جنگی قیدیوں کو ان کے آبائی ممالک میں واپس پہنچانا،اور عارضی پناہ گاہوں(Relief Camps) کی حالت کو بہتر بنا کر جنگی پناہ گزینوں کی مدد کرنا تھا۔1921 میں ،اس نے لاکھوں جنگی قیدیوں کو ان کے آبائی ممالک تک پہنچایا۔1922 میں ترکی اور یونان کے درمیان جنگ ہوئی جس کی وجہ سے لوگوں کو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا،اور مجلسِ اقوام نے لاکھوں یونانیوں کے لیے گھر بنوائے۔

ہیلتھ کمیٹی (The Health Committee)

اس کا مقصد بین الاقوامی صحت کے مسائل کو حل کرنا تھا۔اس نے مچھروں کو مارنے کے لیے ایک بین الاقوامی مہم چلائی،جو ملیریا اور زرد بخار پھیلانے کا سبب بن چکے تھے۔اس نے ٹائفس (ایک قسم کا میعادی بخار) کے پھیلنے سے نمٹنے کے لیے روس میں ایک تعلیمی پروگرام ترتیب دیا۔اس نے ترکی میں پناہ گزینوں کے علاج ومعالجہ کے لئے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم بھیجی۔ بعد میں اسی کمیٹی کو عالمی ادارہ صحت (World Health Organisation) کا نام دیا گیا جو آج بھی جوش و خروش سے کام کر رہا ہے۔

6.13 مجلسِ اقوام کی ناکامی کے اسباب (Causes for the Failure of the League of Nations)

اگرچہ صدر ولسن کی کوششوں سے مجلس اقوام کا قیام عمل میں آیا،لیکن امریکہ اس بین الاقوامی تنظیم کا رکن نہیں بن سکا۔ نتیجتاً مجلس اقوام دنیا کی ایک طاقتور ملک کے تعاون سے محروم ہو گئی۔ گیتھورن ہارڈی کے مطابق،"یورپ کے دروازے پر ایک شیر خوار بچہ چھوڑ دیا گیا تھا جس کی ہر خصوصیت امریکی پدریت کا اعلان کرتی تھی"۔امریکہ کی اس غیر وابستگی پر کئی ملکوں نے عمل کی،اور انہوں نے مجلس اقوام

کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی قدم نہیں اٹھایا۔ اگر مجلس اقوام نے بین الاقوامی معاملات میں مجلس کے اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والے کسی بھی ملک پر معاشی پابندیاں عائد کرتا تھا، تو متاثرہ ملک امریکہ سے ضروری سامان خرید لیتا تھا۔ امریکہ کے مجلسِ اقوام کا رکن نہ بننے کی وجہ سے درج ذیل چار نتائج اس بین الاقوامی ادارے کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے:

مجلسِ اقوام کی طاقت اور اختیار کو کافی حد تک مجروح کیا گیا۔ مجلسِ اقوام یہ دعویٰ کرنے کے قابل نہیں تھی کہ یہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے۔ اس نے کئی ممالک کو جارحانہ رویہ اپنانے کی ترغیب دی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ امریکہ کے مجلس اقوام کا رکن نہ بننے کی وجہ سے اس ادارے کی جارحیت کو روکنے کی طاقت کافی حد تک کم ہوگئی ہے۔ اگر امریکہ اس ادارے کا رکن ہوتا تو منچوریا میں جاپان اور ابیسینیا میں اٹلی کی جارحیت کو مؤثر طریقے سے روکا جاسکتا تھا۔ اس عمل کے نتیجے میں برطانیہ اور امریکہ نے فرانس کو اپنی حفاظت کی جو ضمانت دی تھی وہ عملی طور پر بے اثر ہوگئی۔ اس لیے فرانس اپنی سلامتی کے لیے پریشان ہو گیا۔ اپنی سلامتی کی تلاش میں فرانس نے کئی ممالک کے ساتھ اتحاد کیا۔ اس طرح یورپی سیاست میں فرانس نے متعدد اتحادوں یا معاہدوں کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کی۔

پیرس امن کانفرنس کے دوران اس بین الاقوامی ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور اسے ورسائی معاہدے کا حصہ بنایا گیا۔ شکست خوردہ ممالک اس ادارے کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، اور اسے طاقتور ممالک کے مفادات کی تکمیل کا آلہ سمجھتے تھے۔ اسے دنیا کی سیاسی صورتحال کو برقرار رکھنے کے لیے مغربی ممالک کی سازش قرار دیا گیا۔ اگرچہ ولسن نے ورسائی معاہدے کی دفعات میں ترامیم کی پیش کش کی تھی، لیکن فرانس اور اس کے اتحادیوں نے اس طرح کے اقدام کی مخالفت کی۔ چونکہ کونسل میں فرانس کے حامیوں کی اکثریت تھی، اس لیے مجلس اقوام اس سمت میں کچھ نہیں کر سکی۔ اس طرح، کئی ممالک کی رائے میں مجلس اقوام ورسائی معاہدے میں کیے گئے انتظامات کو برقرار رکھنے کے لیے ایک ادارہ تھا۔ اس وجہ سے بعد میں جرمنی، جاپان اور اٹلی نے مجلس کی رکنیت واپس لے لی۔

اجتماعی سلامتی کا اصول دنیا کے مختلف حصوں میں امن برقرار رکھنے میں کافی حد تک مددگار ثابت ہوا۔ اس اصول کا کامیاب نفاذ بڑی طاقتوں کے تعاون پر منحصر تھا۔ اگرچہ ایسی طاقتوں نے بین الاقوامی امن کے لیے کام کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن جب بھی انہیں اپنے وعدوں کو پورا کرنے کا موقع آیا، تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اگرچہ کئی بڑی طاقتوں نے کھلے عام اپنے آپ کو اجتماعی سلامتی کے محافظ ہونے کا اعلان کیا لیکن بالآخر انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ ان کے لیے ان کے ذاتی مفادات ان کی اولین فکر تھیں۔ منچوریا پر جاپانی حملہ، ابیسینیا میں اٹلی کی جارحیت اور اسپین میں خانہ جنگی کے واقعات ان کے خود غرضانہ رویے کی روشن مثالیں ہیں۔ اس طرح، عظیم جمہوری ملکوں کی حکومتیں، جن پر مجلس کا مستقبل منحصر تھا، ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جو اس وفاداری، حکمت اور ہمت سے بالکل عاری تھے جس کے ذریعے مجلس اپنے خوابوں کو پورا کرکے زندہ رہ سکتی تھی۔ بالآخر، جنیوا کے لیمن جھیل کے ساحل پر واقع ایرین پارک میں مجلس کا سفید محل، اس کا مقبرہ بن کر رہ گیا۔

مجلسِ اقوام کی کامیابی اس کے اراکین کے تعاون پر انحصار کرتی تھی جنہیں بین الاقوامی امن کی خاطر اپنے تمام اختلافات کو کالعدم کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ لیکن مختلف ممالک کے اپنے الگ الگ رویے تھے اور وہ اپنے مفادات کے مطابق مجلسِ اقوام کو استعمال کرنے کی

کوشش کرتے تھے۔ فرانس اپنی سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے مجلس کو استعمال کرنا چاہتا تھا، کیونکہ فرانس اسے اجتماعی تحفظ کا ادارہ نہیں سمجھتا تھا۔ فرانس نے اسے ہمیشہ جرمنی کو کچلنے کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی تاکہ فرانس کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ برطانیہ، جس کی سلطنت دنیا کے کئی حصوں پر پھیلی ہوئی تھی، نہیں چاہتا تھا کہ مجلسِ اقوام ایسے اقدامات اٹھائے جس سے اس کی وسیع نوآبادیاتی سلطنت پر منفی اثر پڑے۔ مزید برآں، دو عالمگیر جنگوں کے درمیان برطانیہ روس کی کمیونسٹ حکومت کو بین الاقوامی امن کے لیے ایک بڑے خطرے کے طور پر پیش کرتا تھا۔ علاوہ ازیں، جرمنی مجلسِ اقوام کو فاتح اور طاقتور ممالک کا ادارہ سمجھتا تھا۔ 1926 میں مجلسِ اقوام کا رکن بننے کے بعد جرمنی کا بنیادی مقصد مجلس کو معاہدے کی غیر منصفانہ دفعات کو تبدیل کرنے پر آمادہ کرنا تھا۔ ہٹلر نے ورسائی معاہدے کی شقوں کی کھلم کھلا تنقید اور خلاف ورزی کی۔ 1919 میں سوویت روس نے مجلسِ اقوام کو سرمایہ داروں کی ناپاک مجلس قرار دیا۔ اگرچہ کچھ عرصے بعد مجلسِ اقوام نے سویت روس کی رکنیت قبول کر لی لیکن اس کو بھی مجلس پر پورا بھروسہ نہیں تھا۔ دراصل طاقتور ممالک مجلسِ اقوام کو اپنے مفادات کی تکمیل کا آلہ کار سمجھتے تھے۔

سرکردہ سفیروں کی جماعت (Conference of Ambassadors) کا مقصد اس وقت تک کام کرنا تھا جب تک کہ مجلسِ اقوام کی مشینری کام کرے، لیکن یہ جماعت قائم رہی اور کئی مواقع پر اس نے مجلس پر سبقت حاصل کی۔ مثال کے طور پر، 1920 میں، مجلسِ اقوام نے ولنا پر اپنے دعوے میں لتھوانیا کی حمایت کی، جو پولسکی زبان بولنے والوں نے اس سے چھین لیا تھا۔ لیکن جب سرکردہ سفیروں کی کانفرنس نے ولنا کا خطہ پولینڈ کو دینے پر اصرار کیا تو مجلس نے بھی پولینڈ کی ہی حمایت کی۔ دوسری مثال کورفو واقعہ (1923) ہے۔ دراصل، یہ واقعہ یونان اور البانیہ کے درمیان سرحدی تنازعے کی وجہ سے پیدا ہوا، جس میں سرحدی کمیشن پر کام کرنے والے تین اطالوی اہلکاروں کو قتل کر دیا گیا۔ مسولینی نے یونانیوں کو موردِ الزام ٹھہرایا، بھاری معاوضے کا مطالبہ کیا اور یونان کے کورفو جزیرے پر بمباری کی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یونان نے مجلسِ اقوام سے اپیل کی، لیکن مسولینی نے اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے مجلس کی اہلیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مسولینی نے مجلسِ اقوام سے نکلنے کی بھی دھمکی دی، جس کے بعد سفیروں نے یونان سے کہا کہ وہ مطلوبہ پوری رقم ادا کرے۔

شروع میں 32 ممالک کو مجلسِ اقوام کی رکنیت حاصل تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ تعداد بڑھ کر 55 ہو گئی۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کے بہت سارے ممالک نے مجلس کی رکنیت قبول نہیں کی تھی۔ نتیجتاً، اس کا اختیار کم و بیش یورپی ممالک تک ہی محدود رہا۔ ولسن نے اپنے چودہ نکاتی پروگرام میں اسلحوں کی تخفیف پر زور دیا تھا لیکن پیرس امن کانفرنس کی بنیاد پر طے پانے والے معاہدوں میں صرف شکست خوردہ ملکوں کو کافی حد تک غیر مسلح کیا گیا۔ اس طرح، اسلحوں کی تخفیف کی ناکامی کی بنیادی وجہ برطانیہ، فرانس اور جاپان کی ہچکچاہٹ تھی۔ جرمنی اور اٹلی کے آمریت پسند حکمران ہرگز اسلحوں کی تخفیف کے حق میں نہیں تھے۔ جرمنی نے فرانس کے ساتھ ہتھیاروں کی برابری کا بھی مطالبہ کیا۔ اس کے علاوہ، جب فرانسیسیوں نے مطالبہ کیا کہ اسلحوں کی تخفیف کو کم از کم آٹھ سال کے لیے ملتوی کیا جائے، تو ہٹلر نے مجلسِ اقوام سے باہر نکلنے کے لیے فرانسیسی رویے کو بہانے کے طور پر استعمال کیا۔ پیرس امن کانفرنس میں یہ توقع کی گئی تھی کہ تمام ممالک دیگر ملکوں کی علاقائی سالمیت اور آزادی کا احترام کریں، اور اپنے تنازعات کو پُرامن طریقوں سے حل کریں۔ لیکن جرمنی اور اٹلی کے

آمریت پسندوں نے مذکورہ بالا اصول پر عمل نہیں کی۔ان کے مطابق جنگ ان کی ضرورت تھی۔ان کا موقف یہ تھا کہ مجلسِ اقوام ان کی مدد کرے یا نہ کرے، وہ اپنی مسلح افواج کی مدد سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ایسے حالات میں دنیا بھر میں امن قائم کرنا مجلسِ اقوام کے لئے ایک ناممکن منصوبہ تھا۔

مجلسِ اقوام سے متعلق عہد نامے کی کمزوریوں نے اس بات کو یقینی بنانا مشکل بنا دیا کہ کسی بھی جارح ملک کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کی جائے۔ان کمزوریوں کی وجہ کسی مسئلے پر کوئی متفقہ رائے قائم کرنا بھی مشکل ہو چکا تھا۔اگرچہ مجلسِ اقوام کے پاس اپنی کوئی فوجی طاقت نہیں تھی، لیکن عہد کے دفعہ 16 کے تحت ضرورت پڑنے پر ارکان ممالک سے فوج کی فراہمی کی توقع کی گئی تھی۔اس دفعہ نے واضح طور پر اجتماعی سلامتی کے نظریے کی اہمیت کو زائل کر دیا۔ مجلس اقوام سے متعلق عہد کو مضبوط کرنے کے لیے کئی کوششیں کی گئیں، لیکن تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں، کیونکہ اس میں کوئی بھی تبدیلی لانے کے لیے متفقہ ووٹ کی ضرورت تھی، جو کبھی حاصل نہیں ہو سکی۔سب سے زیادہ قابل ذکر کوشش 1924 میں برطانوی لیبر وزیر اعظم رامسے میکڈونلڈ نے کی تھی جو مجلسِ اقوام کے بہت بڑے حامی تھے۔انہوں نے جنیوا پروٹوکول کے نام سے ایک قرارداد پیش کی۔اس پروٹوکول نے اراکین کی ثالثی کو قبول کرنے اور بلا اشتعال جارحیت کے شکار ارکان ممالک کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔انتہائی ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ لیبر حکومت کے بعد کنزرویٹو حکومت نے مجلسِ اقوام کو مطلع کیا کہ وہ اس پروٹوکول سے اتفاق نہیں کر سکتی ہے۔اس طرح ایک برطانوی حکومت کی طرف سے تجویز کردہ ایک قرارداد کو اگلی برطانوی حکومت نے مسترد کر دیا۔

1931 میں، جاپانی فوجیوں نے چینی علاقے منچوریا پر حملہ کیا۔چین نے مجلسِ اقوام سے اپیل کی، اور مجلس نے جاپان کی مذمت کی اور اسے منچوریا سے اپنی فوج نکالنے کا حکم دیا۔جب جاپان نے انکار کر دیا تو مجلسِ اقوام نے لارڈ لیٹن کے تحت ایک کمیشن (1932) مقرر کیا، جس نے یہ پتہ لگایا کہ غلطیاں دونوں طرف سے ہو چکی ہیں۔اس کے بعد کمیشن نے یہ تجویز پیش کی کہ منچوریا پر مجلسِ اقوام کی حکومت قائم ہونی چاہیے۔تاہم، جاپان نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، اور مارچ 1933 میں مجلسِ اقوام سے علیحدگی اختیار کر لی۔لیکن اس معاملے میں جاپان پر کوئی اقتصادی پابندی عائد نہیں کی گئی، کیونکہ برطانیہ اور فرانس شدید اقتصادی مسائل کا سامنا کر رہے تھے۔وہ جاپان کے خلاف جنگ کا اعلان بھی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ اس کے لئے ان کو امریکی مدد کی ضرورت تھی۔اس طرح، جاپان نے کامیابی سے مجلسِ اقوام کی خلاف ورزی کی، اور اس کے وقار کو نقصان پہنچایا۔بین الاقوامی تعاون اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب تمام ممالک میں رائے عامہ مطمئن ہو۔اس صورتحال کو قائم رکھنے کے لیے تسلی بخش معاشی حالت بھی ضروری تھی۔لیکن 1929 کے عظیم معاشی بحران نے مجلسِ اقوام کی قسمت کا فیصلہ کیا۔اس دور میں دنیا کے کئی ممالک میں قوم پرستی کے جذبات پروان چڑھے۔عظیم معاشی بحران سے نکلنے کے لیے انہوں نے دوسرے ممالک کے تیار شدہ اشیاء پر پابندیاں لگائیں اور اپنی صنعتوں کی تحفظ کی پالیسی پر عمل کیا۔اس نے بین الاقوامی تعاون کے جذبے کو بری طرح متاثر کیا۔

مجلسِ اقوام میں ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوویت روس کی مسلسل غیر موجودگی اور اٹلی کی دستبرداری نے مجلس کو فرانسیسی اور برطانوی معاملہ بنا دیا۔جیسا کہ ان کے جنیوا پروٹوکول کو مسترد کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی کنزرویٹو کبھی بھی مجلسِ اقوام کے بارے میں پرجوش نہیں تھے۔انہوں نے مجلس میں مذاکرات کرنے کے بجائے لوکارنو معاہدوں (1925) پر دستخط کرنے کو ترجیح دی۔لوکارنو معاہدے

بین الاقوامی معاہدوں کاایک سلسلہ تھاجس کا مقصد پہلی عالمی جنگ کے بعد یورپ میں تناؤ کو کم کرنا تھا۔اس نے رائن لینڈ کو اتحادی طاقتوں کے فوجی قبضے سے آزاد کر دیا،اور جرمنی کو مجلس اقوام میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

برطانیہ اور فرانس مجلسِ اقوام کے دو نمایاں ارکان تھے۔ یہ دونوں ممالک شروع سے آخر تک اس بین الاقوامی ادارے کے ارکان رہے ہیں۔ لیکن دو عالمی جنگوں کے درمیان انہوں نے محوری طاقتوں یعنی جرمنی، جاپان اور اٹلی کی طرف خوشامد کی پالیسی اختیار کی۔ کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے انہوں نے ہٹلر کی مخالفت نہیں کی۔ایسے حالات میں مجلسِ اقوام کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ مجلسِ اقوام اپنے بانیوں کے خواب کو پورا نہ کر سکی کیونکہ تمام ممالک اپنے قومی مفادات کو پورا کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔ابیسینیا پر اطالوی حملے نے مجلسِ اقوام کے وقار اور شہرت کو سنگین نقصان پہنچایا۔ مجلسِ اقوام نے اٹلی کی مذمت کی اور اس پر اقتصادی پابندیاں عائد کی۔ لیکن یہ پابندیاں تیل، کوئلے اور سٹیل کی درآمدات پر نہیں لگائی گئی تھیں۔ یہ پابندیاں اتنی بے اثر تھیں کہ اٹلی نے مئی 1936 میں بغیر کسی مشکل کے ابیسینیا کو فتح کیا۔ چند ہفتوں بعد اٹلی پر یہ پابندیاں بھی ختم کر دی گئیں،اور اس طرح مسولینی نے مجلسِ اقوام کو ناکام ثابت کر دیا۔ یہاں پر ایک بار پھر برطانیہ اور فرانس کو مجلس کی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسولینی سے دشمنی مول لی جائے،اور جرمنی کے حقیقی خطرے کے خلاف اتحادی کے طور پر کھڑے ہو جائے۔ لیکن اس کے نتائج تباہ کن تھے، جیسے مسولینی متعدد سیاسی پابندیوں کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا،اس لئے وہ ہٹلر کے قریب آنے لگا۔ چھوٹے اور کمزور ممالک نے مجلسِ اقوام پر بھروسا کھو دیا۔ورسائی معاہدے کو توڑنے، فوج کی بھرتی (مارچ 1935)اور رائن لینڈ میں جرمنی کی فوج داخل کرنے کے لئے ہٹلر کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ مجلس کے کونسل میں بھی ان معاملات کو زیرِ بحث نہیں لایا گیا، کیونکہ فرانس اور برطانیہ کو ڈر تھا کہ ہٹلر جرمنی کے خلاف کسی بھی فیصلے کو قبول نہیں کرے گا۔اس لئے، 1935 کے بعد مجلسِ اقوام کو کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔اس طرح، جب جاپان،اٹلی اور جرمنی جیسے جارحانہ ملکوں نے مجلسِ اقوام کی مخالفت کی، تو مجلس کے بانی ارکان جیسے فرانس اور برطانیہ بھی اقتصادی اقدامات یا فوجی کارروائی کے ذریعے اس کی حمایت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دراصل،اس وقت مجلس اتنی ہی مضبوط تھی جتنی کہ اس کے سرکردہ ارکان جارحیت کا مقابلہ کرنے کا عزم رکھتے تھے۔اس طرح، بدقسمتی سے 1930 کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس قسم کا عزم کم ہو رہا تھا۔

تاہم، کچھ مورخین کا خیال ہے کہ مجلسِ اقوام کو عالمی تاریخ میں ایک مکمل ناکامی اور ایک غیر متعلقہ ادارے کے طور پر مسترد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر، روتھ ہینیگ اپنی کتاب *The League of Nations* (published in 2010) میں لکھتی ہے کہ 'اب وقت آگیا ہے کہ اس مجلسِ اقوام کو چیلنج کیا جائے، جو بین الاقوامی تعاون کی جانب ایک جرات مندانہ قدم تھا جو اپنے بعض مقاصد میں ناکام اور بعض مقاصد میں مکمل طور پر کامیاب ہوئی'۔ وہ استدلال کرتی ہے کہ مجلسِ اقوام کی تخلیق ہماری عصری عالمی نظام کی بین الاقوامی تنظیم کا ایک اہم مرحلہ ہے، جسے مجلس کی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے،اور جو اقوام متحدہ کی شکل میں آج بھی مربوط اور مضبوط ہے۔'اس کے علاوہ، مجلسِ اقوام کی توقعات کافی زیادہ اور مکمل طور پر غیر حقیقی تھیں۔اس سے حملہ آوروں سے نمٹنے کی توقع کیسے کی جاسکتی تھی جب کہ اس کے پاس اپنی کوئی فوج ہی نہیں تھی،اور اس کے پاس ارکان کو اپنی فوجیں فراہم کرنے پر مجبور کرنے کا کوئی طریقہ کار بھی نہیں تھا۔درحقیقت،

اس کی عظیم شراکت یہ تھی کہ اس نے بین الاقوامی تعاون اور امن قائم کرنے کے لیے پہلا تجرباتی مرحلہ فراہم کیا، جس کا عروج 1945 میں اقوام متحدہ کا قیام تھا۔ مجلسِ اقوام کے اداروں جیسے کہ جنرل اسمبلی، کونسل اور سیکرٹریٹ کو اقوام متحدہ نے ایک بنیاد کے طور پر اپنایا۔ اقوام متحدہ کی بین الاقوامی عدالتِ انصاف نے مجلسِ اقوام کی عدالت کی شناخت کو دوبارہ پیش کیا۔ انٹرنیشنل لیبر تنظیم آج بھی کام کر رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے بہت سے دوسرے ادارے، جیسے اکنامک اینڈ سوشل کونسل اور عالمی ادارہ صحت مجلسِ اقوام کی ایجنسیوں کی بنیاد پر قائم کیے گئے تھے۔ الغرض، روتھ ہیننگ یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ 1920 میں اس ادارے کی تشکیل نے بین الاقوامی تعاون اور سمجھوتے کو فروغ دیا، اور یہ کوشش بین الاقوامی سفارت کاری میں ایک متحرک قدم ثابت ہوا... وہ مزید کہتی ہے کہ ہمیں تاریخ سے اہم اسباق سیکھنے کے لئے مجلسِ اقوام کی کمزوریوں پر غور کرنے یا اس کی ناکامیوں کی مذمت کرنے کے بجائے، ہمیں مجلس کی کامیابیوں کی مدح سرائی کرنی چاہیے۔

6.14 مجلسِ اقوام کے عہد نامے کی خامیاں

(Limitations of the Covenant of the League of Nations)

مجلسِ اقوام کے عہد کی مندرجہ ذیل خامیاں تھی:

- مجلسِ اقوام نے اپنے کسی بھی رکن کو دو سال کا نوٹس دے کر اپنی رکنیت ختم کرنے کی اجازت دی۔ اس شق کے تحت جاپان، جرمنی اور اٹلی نے جارحیت کا الزام لگنے پر اپنی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے علاوہ، برازیل اور کوسٹاریکا نے بھی مجلس کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔
- جنرل اسمبلی میں تمام اراکین کی رضامندی کے بعد ہی کوئی قرارداد منظور کی جاسکتی تھی۔ عام طور پر مجلس کے تمام اراکین کے لیے کسی مسئلے پر متفق ہونا مشکل تھا۔ اسی طرح مجلسِ اقوام کے عہد نامے میں کسی بھی ترمیم کے لیے تمام اراکین کی رضامندی ضروری تھی۔ اس کمی نے مجلس کو اپنے عہد کی اصلاح کرنے سے روک دیا۔
- مجلسِ اقوام کی معاشی صورتحال بھی صحیح بنیادوں پر نہیں رکھی گئی تھی۔ اسے اپنے اراکین کی رکنیت پر انحصار کرنا پڑا۔ اسے اپنی آمدنی حاصل کرنے کے لیے کوئی محصول یا ٹیکس لگانے کا اختیار نہیں تھا۔
- مجلسِ اقوام کے عہد میں ایک اور کجی یہ تھی کہ وہ اپنے کسی رکن کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ مجلسِ اقوام کی اس پابندی کا بالواسطہ نتیجہ یہ نکلا کہ کئی معاملات میں متعدد ممالک نے یہ دعویٰ کیا کہ کسی ملک کے ساتھ کوئی خاص تنازعہ اس کا اندرونی معاملہ ہے اور یہ مجلس کے دائرہ کار میں نہیں آتا ہے۔ شاید یہ بہتر ہوتا کہ اگر مجلسِ اقوام کسی اندرونی معاملے اور بین الاقوامی تنازعے کی نوعیت کو واضح طور پر بیان کرلیتا۔
- مجلسِ اقوام کے پاس نادہندہ اور کوتاہی کرنے والے ممالک کو سزا دینے کی طاقت نہیں تھی۔ اس کے پاس اپنی کوئی رسمی یا حسب دستور فوج بھی نہیں تھی کہ وہ کسی ایسے ملک کے خلاف کارروائی کرے جسے امن میں خلل ڈالنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہو۔ ایسی کسی بھی کارروائی کے لیے مجلسِ اقوام اپنے ارکان پر منحصر تھی، جو اپنے مفادات کے مطابق کام کرتے تھے۔ منچوریا اور ابیسینیا کے حوالے سے جارحیت

پسندوں کے خلاف مجلسِ اقوام کی مدد کرنے میں دو عظیم ممالک برطانیہ اور فرانس کی ہچکچاہٹ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

6.15 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ظاہر ہے کہ مجلسِ اقوام نے غیر سیاسی معاملات کو حل کرنے میں کافی کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ مجلس چھوٹے ملکوں کے درمیان تنازعات کو حل کرنے میں کامیاب ہوئی لیکن وہ ایسے تنازعات میں کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہی جن میں ایک یا ایک سے زیادہ طاقتور ملکوں کا مفاد شامل تھا۔ تاہم، ان ناکامیوں کے باوجود مجلس اقوام نے بین الاقوامی تعاون اور خیر سگالی کے جذبے کو جنم دیا۔ خفیہ سفارتی طریقوں کی کئی خامیوں کو ختم کر کے اس نے بین الاقوامی سیاست کو ایک نئی سمت دے دی۔ مجلسِ اقوام کی جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاسوں میں سات ممالک کے نمائندوں نے بین الاقوامی امن سے متعلق امور پر تبادلہ خیال کیا۔ اگرچہ کئی معاملات میں مجلس ناکام ثابت ہوئی، لیکن اس نے مجموعی طور پر لوگوں میں تعاون کے جذبے کو پروان چڑھایا۔ نتیجتاً بین الاقوامی معاملات میں رائے عامہ ایک قوت بن گئی۔ مجلسِ اقوام کا قیام امن قائم کرنے کے میدان میں پہلا تجربہ تھا۔ مجلس نے بین الاقوامی تعاون کے جذبے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے علاوہ، مجلس اقوام سے اخذ کیے گئے اسباق اقوام متحدہ کو ایک مضبوط اور کارآمد ادارہ بنانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ اسی لیے، اقوام متحدہ کے مقاصد، اصول، اجزا اور طرز عمل پر مجلسِ اقوام کا اثر اور حکومتی رسوخ واضح ہے۔"

6.16 کلیدی الفاظ (Keywords)

مجلسِ اقوام	:	مجلسِ اقوام بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینے اور امن وسلامتی کے حصول کے لیے قائم کی جانے والی پہلی بین الاقوامی تنظیم تھی۔
چودہ نکاتی کا پروگرام	:	چودہ نکاتی کا پروگرام 8 جنوری 1918 کو امریکی صدر ووڈرو ولسن کی طرف سے پیش کی گئی ایک تجویز تھی، جس میں پہلی عالمی جنگ کے خاتمے اور اس طرح کے تصادم کو روکنے کا احساس شامل تھا۔
مجلسِ اقوام کا عہد نامہ	:	یہ عہد نامہ تمہید اور 26 دفعات پر مشتمل ہے۔ یہ مجلسِ اقوام کے وجود اور بنیادی مقاصد کی وضاحت کرتا ہے۔ 'بین الاقوامی تعاون کا فروغ اور بین الاقوامی امن اور سلامتی کا حصول' اس کا نچوڑ یا لبِ لباب ہے۔

6.17 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.17.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. پہلی عالمگیر جنگ کب شروع ہوئی؟
2. مجلسِ اقوام کس سال وجود میں آ گئی؟
3. امن کی بحالی کے لئے چودہ نکاتی پروگرام کس نے دیا تھا؟

4. جاپان نے منچوریا پر کب حملہ کیا؟
5. اٹلی نے ابیسنیا پر کب حملہ کیا؟
6. جرمنی مجلسِ اقوام کا رکن کب بنا؟
7. 1926 میں مجلسِ اقوام کے کتنے ارکان تھے؟
8. مجلسِ اقوام کے قیام کا بنیادی مقصد کیا تھا؟
9. دوسری عالمگیر جنگ کب شروع ہوئی؟
10. باضابطہ طور پر مجلسِ اقوام کے اختتام کا اعلان کب کیا گیا؟

6.17.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مجلسِ اقوام کے اہم مقاصد پر روشنی ڈالئے۔
2. مجلسِ اقوام کی تنظیم سازی پر ایک مضمون تحریر کریں۔
3. سیاسی تنازعات کے حل میں مجلسِ اقوام کے کردار کو اجاگر کیجئے۔
4. مجلسِ اقوام کی غیر سیاسی کامیابیوں پر ایک مختصر نوٹ قلمبند کیجئے۔
5. مجلسِ اقوام کی ناکامی کے اسباب پر بحث کیجئے۔

6.17.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. 1920 کی دہائی میں مجلسِ اقوام بین الاقوامی تنازعات کو حل کرنے میں کتنی کامیاب رہی؟
2. 1920 کی دہائی میں مجلسِ اقوام کے کردار کو سراہا گیا لیکن 1936 کے بعد اسے ایک ناکام ادارہ قرار دیا گیا۔ بحث کیجئے۔
3. آپ اس بات سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں کہ مجلسِ اقوام ایک مکمل ناکامی اور عالمی تاریخ میں مکمل طور پر غیر متعلق تھی؟

6.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Burns and Ralph, *World Civilizations*, WW Norton: Goyal Saab Publishers, Delhi, 2001.
2. Dev, Arjun and Indira Arjun Dev, *History of the World from Late Nineteenth to the Early Twenty-First Century*, Orient Black Swan, 2009.
3. Fitzsimmons, O., *Towards One World*, London University Tutorial Press, 1974.
4. Griffin, Roger D., *The Nature of Fascism*, Routledge, London, 1993.
5. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
6. Henig, R., *The League of Nations*, Haus Publishing, 2010.
7. Lowe, Norman, *Mastering the Modern World History*, Palgrave Macmillan, 1982.
8. Martyn Housdon, *The League of Nations and the Organisation of Peace*, Pearson Education

Limited, 2012.

9. Mathur, L.P., *Twentieth Century World*, Avishkar Publishers & Distributors, Jaipur, 2004.
10. Nester, William R., *Globalization: A Short History of the Modern World*, Palgrave, Macmillan, 2010.
11. Overy, R., *The Inter-War Crisis, 1919–1939*, Longman, 1994.
12. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
13. Perry, Marvin., *Western Civilization: Ideas, Politics and Society*, Wadsworth Cengage Learning, 2011.
14. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
15. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).

اکائی 7۔ سرمایہ داری کا بحران اور عظیم کساد بازاری

(Crisis in Capitalism and the Great Depression)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 پہلی عالمی جنگ اور سرمایہ دارانہ نظام کا بحران

7.3 پہلی عالمی جنگ کے عالمی معیشت پر رونما ہونے والے اثرات

7.4 عالمی کساد بازاری کا مطلب اور ابتداء

7.5 عالمی کساد بازاری کے وجوہات

7.6 عالمی کساد بازاری کے نتائج

7.7 عالمی کساد بازاری اور ہندوستانی معیشت

7.8 اکتسابی نتائج

7.9 کلیدی الفاظ

7.10 نمونہ امتحانی سوالات

7.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

7.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید (Introduction)

پہلی عالمی جنگ کے بعد سامراجیت کی توسیع پسندانہ منصوبہ کو شدید جھٹکا لگا۔ قومیت کے نظریہ کے عروج کی وجہ سے 20ویں صدی میں سامراجیت بحران کا شکار ہو گیا۔ اس صدی میں نوآبادیات میں جنگ آزادی کی تحریکوں کی وجہ سے سامراجی قوتوں کو مزاحمت اور بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی عالمی جنگ سے پیدا ہونے والے تباہ کن سیاسی اور معاشی حالات 1929ء کے ابتدا میں بہت حد تک قابو میں آ چکے تھے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد صنعتی انقلاب کی وجہ سے انگلینڈ اور دوسرے یورپی ممالک میں پیداوار میں اضافہ ہونے لگا۔ لیکن ان کے خریدار نہ ہونے کے باعث صنعتی احیا تقریباً ناممکن ہو گئی۔ امریکہ نے یورپی ممالک کو قرض دینا بند کر دیا جس کی وجہ سے ان ممالک کے حالات مزید ابتر ہونے لگے جن کا انحصار امریکی قرضہ پر تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد عالمی بازار میں سونے کی کمی کے باعث قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ ہونے لگا۔ مہنگائی بڑھ گئی۔ یورپ میں امریکی سرمایہ آنا بند ہو گیا جس کی وجہ سے یورپ کے ممالک کو معاشی تنگی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے برخلاف امریکہ میں سرمایہ کی دستیابی نے صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز کر دیا۔ پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ پیداوار ملکی ضروریات سے زیادہ ہونے لگی مگر اس کے خریداروں کی تشویش ناحد تک کمی تھی۔ جس کی وجہ سے امریکہ میں بھی صنعتی پیداوار کی قیمتیں کم ہونے لگیں۔ امریکہ میں تاجر اور صنعتکار دیوالیہ پن کا شکار ہونے لگے۔ تقریباً 50 لاکھ لوگ بے روزگار ہو گئے۔ مزدوروں کے درمیان بے اطمینانی بڑھنے لگی۔ جس کے نتیجے میں ہڑتال شروع ہو گئی۔ شیئر بازار تباہ ہو گیا۔ بینک دیوالیہ پن کا شکار ہونے لگے۔ غرضیکہ امریکہ بھی عالمی کساد بازاری کے زد میں آ گیا۔ یہ کساد بازاری/اقتصادی جمود 1929 میں شرح ہو کر 1933ء تک جاری رہا۔ اس دوران پوری دنیا کی زراعت، تجارت اور صنعتی ترقی پر اس کا منفی اثر مرتب ہوا۔ اس نے دنیا کی معیشت کو تباہ کن حد تک نقصان پہنچایا۔ مورخین نے اس کے بہت سے اسباب بتائے ہیں۔ ماہرین معاشیات نے ان وجوہات کا تفصیلی جائزہ لے کر اس سے نکلنے کی صورت اور راستے بھی تجویز کیے۔ ماہرین معاشیات نے عظیم کساد بازاری سے پیدا ہونے مسائل کا بھی مطالعہ کیا اور ان کے سدِّباب کا طریقہ بھی بتایا۔ 1933ء کے بعد حالات میں بہتری آنا شروع ہوئی۔ کساد بازاری کا دور ختم ہو گیا۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ان عوامل کا تجزیہ کر سکیں گے کہ کس طرح پہلی عالمی جنگ نے دنیا کی معیشت کو اثرانداز کیا۔
- اس بات کا جائزہ لے سکیں گے پہلی عالمی جنگ کے بعد معاشی تبدیلیوں نے کس طرح پوری دنیا کو کساد بازاری کا شکار بنایا۔
- کساد بازاری کے وجوہات سے روشناس ہو سکیں گے۔
- عظیم کساد بازاری کے نتائج سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستانی معیشت پر کساد بازاری کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔

7.2 پہلی عالمی جنگ اور سرمایہ دارانہ نظام کا بحران

(The First World War and the Crisis of Capitalism)

جاگیرداری نظام کے زوال کے بعد یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا اور اسی کے ساتھ سرمایہ داری نظام کی داغ بیل بھی پڑی۔ مورخین اور دانشوروں نے ''سرمایہ داری'' کو سیاسی اور معاشی نظریہ کے طور پر تشریح کرنے کی کوشش کی۔ اس کو ''آزاد معیشت'' اور ''آزاد سرمایہ کاری'' کا نام دیا گیا۔ لیکن ویبر کے مطابق ''سرمایہ داری ایک ایسا طرز فکر تھا جس کا مقصد اعتدال پسندی اور منظم طریقے سے دولت کا حصول تھا۔'' مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا معاشی نظام تھا جس میں اشیاء کی پیداوار اور اس کی تقسیم کا مقصد زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھا کرنا تھا۔ اس کی اہم خصوصیات میں مرکزیت، بے تحاشا دولت کمانا مشین کا استعمال، مزدوروں کا استحصال اور تنظیم وغیرہ شامل تھیں۔ سرمایہ دارانہ نظر بطور ادارہ نظام کی ابتدا 13 ویں اور 14 ویں صدی میں ہوئی تھی، لیکن محققین کا خیال ہے کہ سرمایہ دارانہ ادارہ دراصل 15 ویں صدی میں وجود میں آیا۔ کچھ دانشوروں کا اتفاق ہے کہ ہندوستان کے لئے سمندری راستہ کی تلاش کے بعد سرمایہ داری نظام وجود میں آیا۔ انگلینڈ، فرانس اور اسپین میں طاقتور شہنشاہیت نے اس کو مزید تقویت بخشی۔ شہنشاہیت نے تجارت کو فروغ دے کر منافع کمانے پر زور دیا۔ پھر سرمایہ دارانہ تنظیمیں وجود میں آئیں اور اس کے بعد اسٹاک کمپنی پھر جوائنٹ اسٹاک اور پھر چارٹرڈ کمپنیاں وجود میں آئیں۔ جس کی بدولت بین الاقوامی تجارتی سرگرمیاں کئی گنا بڑھ گئیں۔ بینکنگ نظام اور چیمبر آف کامرس کے قیام سے تجارتی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سرمایہ داری نے پیداوار کے عملی نظام کو تبدیل کر دیا۔ ایک خوشحال متوسط طبقہ وجود میں آیا جس کے اندر تجارتی اور صنعتی اداروں میں سرمایہ کاری کر کے دولت اکٹھا کر کے منافع کمانے کا جذبہ تھا۔ انگلینڈ اور دوسرے یورپی ممالک میں سرمایہ داری کو فروغ دینے میں کئی عوامل کارگر ثابت ہوئیں۔ مثلاً جغرافیائی کھوج، تجارتی کمپنیوں کا قیام بینکوں اور کریڈٹ سسٹم کی ترقی، مضبوط بادشاہت وغیرہ۔

صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ دارانہ نظام میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جس نے اس نظریہ کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ 19 ویں صدی میں صنعتی سرمایہ داری نظام وجود میں آیا جس نے صنعتی ملکوں کے درمیان صف آرائی اور مقابلہ جاتی دور کا آغاز کیا۔ انگلینڈ کے بعد فرانس میں صنعتی ترقی اور سرمایہ داری نظام کا آغاز ہوا۔ صنعتی انقلاب نے فیکٹری سسٹم کو جنم دیا اور مشین کے ذریعہ پیداوار کئی گنا بڑھ گیا۔ اس اضافی پیدوار کی کھپت کے لئے نوآبادیات کی تلاش شروع ہوئی جس نے نوآبادیاتی نظام کو جنم دیا۔ 19 ویں صدی کے آخر میں جرمنی اور جاپان بھی صنعتی ملک بن چکے تھے اور ان کو بھی نوآبادیات کی تلاش تھی۔

صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والا سرمایہ داری نظام جب اپنے نکتہ عروج پر پہنچا اس کو کارل مارکس نے Imperialism کا نام دیا۔ 19 ویں صدی کی سب سے نمایاں خصوصیت یورپی ممالک کی دنیا کو فتح کرنے اور اس کو نوآبادیات میں تبدیل کرنے کا منصوبہ تھا۔'' 19 ویں صدی کے آخر اور 20 ویں صدی کے ابتدائی عشرے میں صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والی یورپی ممالک میں سامراج دشمنی یورپ سے نکل کر ایشیائی اور افریقی ملکوں میں مرکوز ہو گئی اور یورپی ممالک میں نوآبادیات کے حصول کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں کیونکہ صنعتی انقلاب کی وجہ سے وجود میں آنے والے سے پیدا ہونے والا سرمایہ دارانہ نظام کی بقا نوآبادیات کی تحویل اور ان کے استحصال پر مبنی تھی۔ نوآبادیات قائم

کرنے کے جذبہ کو روڈیارڈ کیپلنگ کے 'سفید نسل کا بوجھ' (Theory of White Man's Burden) سے بھی تقویت ملی۔ اس کے علاوہ 'مہذب کرنے کے مشن' (Civilising Mission) نے بھی سامراجیت کی توسیع پسندانہ پالیسی کی حوصلہ افزائی کی۔ یورپی ممالک نے نوآبادیات کے حصول کے لئے اوّل تو اپنے باشندوں کو دوسرے ممالک بھیج کر اپنے تہذیب و تمدن کو فروغ دے کر اپنے زیرِ اثر کیا۔ مثلاً انگلینڈ نے اوّل تو اپنے باشندوں کو امریکہ بھیج کر وہاں کے عوام کو اپنی سیاسی اور تہذیبی رسوخ سے متاثر کرلیا۔ دوئم نوآبادیات قائم کرکے وہاں کے قدرتی وسائل پر اپنا قبضہ جمالیا جس کا استحصال ان کا بنیادی مقصد تھا۔ سبھی سامراجی قوتوں کا ایک ہی نصب العین خدا، سونا اور جلال (God, Gold, and Glory) تھا۔ یورپ کی سامراجی طاقتیں سب سے پہلے ایشیائی اور افریقی ممالک سے ''تجارت اور منافع بخش تجارت'' کے بنیادی مقاصد تجارتی رشتہ استوار کرتیں اور پھر زیادہ سے زیادہ منافع (Maximisation of Profit) کے اصولوں پر کاربند ہو کر تجارتی بالادستی قائم کرکے اور زیادہ منافع کمانے کی ہوس نے سیاسی غلبہ قائم کرنے کا حوصلہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی پہلے تجارت پھر تجارتی بالادستی اور بالآخر ہندوستان پر سیاسی غلبہ قائم کرنے کو اپنا اوّلین سیاسی مقصد بنالیا۔ پلاسی کی جنگ کے بعد فتوحات کے ذریعہ یا دوسرے سیاسی حربوں کا استعمال کرکے 1856ء تک پورے ملک پر قابض ہوگئے جس کو مورخین نے "Trade followed the Fly" کے نظریہ سے موسوم کیا۔

سامراجی طاقتوں کی نوآبادیات کے حصول کا مقصد صنعتی پیداوار کے لئے بازار کے طور پر استعمال کرنا اور پھر ان ملکوں کی قدرتی وسائل پر قبضہ کرکے اس کا اپنے ملک کی معاشی ضرورتوں کے تحت استحصال کرنا تھا۔ اس کے علاوہ صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کے سرمایہ داروں نے بہت زیادہ دولت اکٹھا کرلی جس کو سرمائے کا اکٹھا کرنا (Capital Accumulation) کہا جاتا تھا۔ نوآبادیات میں اس کی سرمایہ کاری کرکے مزید منافع کمانے کی لالچ نے ہندوستان میں مالیاتی سرمایہ داری کے مرحلہ کا آغاز کیا جس کے تحت ریلوے کی تعمیر میں سرمایہ کاری کے ذریعہ خوب منافع کمایا۔ جبکہ تجارتی سرمایہ داری اور آزاد تجارت/صنعتی سرمایہ داری کے مرحلہ میں انگلینڈ نے دولت کی نکاسی کو اولین فوقیت دی۔ سامراجی قوتوں کا مقصد، دولت کے حصول اور قدرتی وسائل کے استحصال کے علاوہ اپنے مذہب، عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت بھی تھی جس کے تحت پورے ملک میں عیسائیت کا غلبہ قائم کرکے مقامی آبادی کے ایک بڑے حصہ کو عیسائی بنا کر اس ملک پر ہمیشہ کے لئے اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنا تھا۔

سوئز نہر کے افتتاح، جہاز بنانے والی کمپنیوں کے قیام، بینکنگ اور کریڈٹ نظام انشورنس کے قیام اور نقل و حمل کے ذرائع مثلاً سڑکیں اور ریلوے کی تعمیر نے سامراجیت کی توسیع پسندی کو براہِ راست فروغ دیا۔ نوآبادیات کے حصول کو یوروپی سامراجی قوتیں عزت اور قومی افتخار کی علامت سمجھتی تھیں اس لئے انہوں نے نوآبادیاتی نظام کی حوصلہ افزائی کی۔ ایشیا میں نوآبادیاتی نظام کا عمل دراصل 1498ء میں واسکوڈاگاما کے ہندوستان آنے سے شروع ہوا۔ پرتگالیوں کے بعد ڈچ، اسپینی، انگریز اور فرانسیسی ہندوستان اور دیگر مشرقی ایشیائی ممالک میں تجارت کی غرض سے آئے اور ان ممالک کو اپنی نوآبادیات بنالیا۔ 19ویں صدی میں ان سامراجی قوتوں نے پورے افریقی براعظم کو اپنا نوآبادیات بنالیا۔ انگلینڈ نے امریکہ کو بھی اپنی نوآبادیاتی ملک بنالیا۔ نوآبادیاتی نظام کی سب سے بڑی خامی اپنی بالادستی قائم کرکے سیاسی

غلبہ قائم کرنااوراپنے سیاسی اور معاشی مقاصد کے حصول کے لئے ان کا استحصال کرنا تھاانہوں نے نو آبادیاتی ممالک میں اپنے مذہب کو تھوپنے کی بھی کوشش کی اس کی وجہ سے ان ملکوں میں احتجاجی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیاجاچکاہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ دار/سامراجیت نواز ملکوں میں نو آبادیات قائم کرنے اوران کو بطور بازار استعمال کرنے کے لئےاور نو آبادیات کی قدرتی وسائل پر قبضہ اور صنعتی ممالک کے لئے اس کو استحصال کرنے کی کوشش کی وجہ سے یورپی ممالک میں آپسی ریشہ دوانیاں اور سیاسی رقابت شروع ہوگئی۔ سیاسی رقابت دشمنی میں تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ گروہ بندی کا آغاز ہو گیا۔ اس سیاسی گروہ بندی نے نئی تنظیموں اوران کی مخالف تنظیموں کے قیام نے پوری دنیا کی سیاسی سرگرمیوں کو مہمیز کرکے عالمی ہلچل پیدا کردی۔ جنگی اسلحوں کے لئے دوڑ شروع ہوگئی۔ مقابلہ جاتی وطنیت اور محدود قومیت، انگلینڈ، فرانس اور روس کی نو آبادیات پر بالادستی، جرمنی کا نو آبادیات میں حصہ داری کی مانگ جبکہ انگلینڈ اور فرانس کا شراکت داری سے انکار، جرمنی کا عالمی طاقت بننے کا خواب وغیرہ نے پہلی عالمی جنگ کے لئے راستہ ہموار کردیا تھا جس کا باقاعدہ آغاز 1914ء میں آرک ڈیوک فرڈیننڈ کے قتل سے ہو گیا۔

مغربی نو آبادیاتی نظام اور سامراجیت کی توسیع پسندانہ پالیسی کو پہلی عالمی جنگ سے شدید نقصان پہنچا جس کو مورخین نے ''سامراجیت کی بحران'' سے تعبیر کیا۔ کیونکہ پہلی عالمی جنگ سے قومیت کے نظریہ کو فروغ ملااوراس کا عروج سامراجیت کے لئے خطرہ بننے لگا۔ جدید تعلیم، جدید صحافت/پریس، جمہوری نظریہ کے عروج نے سیاسی اور سماجی بیداری پیدا کی۔ اور نو آبادیاتی لوگوں نے آزادی کی مانگ شروع کردی۔ سامراجی قوتوں کو طاقت کی زور پر ان نو آبادیات پر قبضہ رکھنا مشکل ہو گیا۔ قومیت کے نظریہ کی فروغ اور عالمی جنگ کی سیاسی انتشار اور معاشی زبوں حالی کی وجہ سے نو آبادیات کو خیرباد کہنے کا وقت آگیا تھا۔ نو آبادیات کی آزادی کے ساتھ Decolonisation کا عمل شروع ہو گیا۔ اگرچہ سامراجیت کو کچھ مورخین غیر اخلاقی اور بے رحم نظام مانتے ہیں تاہم اسی کے کچھ مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے۔ مثلاً ہندوستان میں سیاسی اتحاد، جدید تعلیم کی ابتدا، ریلوے کی تعمیر، پریس کی ابتدا سامراجیت کی دین تھی جس نے سیاسی شعور اور سماجی بیداری لاکر قومیت کے جذبہ کو فروغ دیا۔ معاشی سطح پر ایشیائی اور افریقی ملکوں میں صنعتی ترقی کو فروغ ملا، لیکن اسی کے ساتھ سامراجیت نے مقامی روایتی ہندوستان کی ترقی یافتہ صنعت کو تباہ وبرباد کردیا۔ سامراجیت نے نو آبادیاتی ممالک میں غربت اور مفلوک الحالی کو جنم دیا۔

7.3 معیشت پر پہلی عالمی جنگ کے مرتب ہونے والے اثرات

(Effects of the First World War on Economy)

پہلی عالمی جنگ سے سامراجیت کے خاتمہ کا آغاز ہوا۔ اور نو آبادیاتی ملکوں کے جنگ آزادی کی تحریک نے زور پکڑنا شروع کردیا۔ سامراجی طاقتوں کی نو آبادیات پر گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اسی کے ساتھ پوری دنیا پر پہلی عالمی جنگ کے معاشی اثرات بھی مرتب ہونا شروع ہوگئے تھے۔ لوگوں کا قتلِ عام اور جائداد کی ناقابل تلافی تباہی نے دنیا کے سامنے بہت بڑا بحران کھڑا کردیا۔ دنیا کے تقریباً تیس ملکوں نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ جس میں جان ومال کے نقصان کا تخمینہ لگانا ناممکن ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 9 ملین لوگ جاں بحق اور 29 ملین زخمی

ہوئے تھے۔ ماہر معاشیات نے جنگی اخراجات کا تخمینہ تقریباً چار سو بلین لگایا ہے۔ جنگ کی وجہ سے قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ نے عام لوگوں کی زندگی کو مفلوج کر دیا۔ معاشی خسارے کی بھرپائی کے لئے یورپی ممالک نے عوام پر نئے ٹیکس عائد کر دیے جس کی وجہ سے عوام کو مزید دُشواریوں کا سامنا کرناپڑا۔ جنگ کی وجہ سے صنعتی ترقی ہوئی کیونکہ جنگ کے دوران ایک طرف تو جنگی ساز و سامان کی مسلسل مانگ بڑھ رہی تھی دوسرے ثانوی صنعتیں بھی خوب ترقی کر رہی تھیں جس سے ایک بڑی آبادی کو روزگار ملا۔ لیکن جنگ کے خاتمہ کے بعد صنعتی ضرورتوں کی مانگ میں اچانک گراوٹ آنے کی وجہ سے صنعتی اکائی بند ہونے لگی جس کی وجہ سے مزدوروں کو فیکٹری سے نکالا جانے لگا۔ جس سے بے روزگاری جیسے مسائل پیدا ہوئے اور مزدوروں کی یونینوں نے ہڑتال اور تحریکیں شروع کر دیں جس سے سیاسی افراتفری کا ماحول پیدا ہوا۔ جنگ کے دوران حکومتوں نے فوجی اسلحہ اور جہاز کے دستوں کے لئے بڑی بڑی رقم بطور قرض لی تھیں جس کی ادائیگی سے ممالک قاصر تھے لہٰذا انہوں نے اپنی کرنسی کو Devalue کرنا شروع کر دیا جس سے اقتصادی کساد بازاری جیسے حالات پیدا ہونے لگے۔ بالآخر 1929 میں دنیا کساد بازاری کا شکار ہوگئی اور معاشی بحران پیدا ہو گیا جس نے دنیا کے تمام بڑے ممالک کو اپنی زد میں لے لیا۔ اسی اثنا میں جنگ آزادی کی تحریکیں بھی شروع ہو گئیں جس سے سامراجیت اور نوآبادیاتی نظام کو مزید مشکلات کا سامنا کرناپڑا۔

7.4 عظیم کساد بازاری کا مطلب اور اس کی ابتداء

(The Meaning of Great Depression and Its Origin)

عظیم کساد بازاری ایک معاشی بحران تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ کے دس سال بعد پوری دنیا اچانک معاشی دشواریوں کی زد میں آگئی۔ کساد بازاری سے مراد تمام معاشی سرگرمیوں کا رُک جانا اور پیداوار کے نظام کا بری طرح متاثر ہو جانا ہے۔ زراعت، تجارت اور صنعت غرضیکہ معیشت کا ہر شعبہ ناقابل تلافی حد تک تباہی کا شکار ہو گیا جس سے سماجی زندگی بھی متاثر ہوئی۔ قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ کی وجہ سے عام لوگوں کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی، اگرچہ عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد تمام ملکوں نے اپنی معیشت کو بہتر طریقے سے نظم کر لیا تھا اور معیشت ترقی کے راستے پر گامزن تھی۔ کچھ ملکوں نے بہت حد تک معاشی استحکام بھی حاصل کر لیا تھا۔ عظیم/عظیم کساد بازاری مارچ 1929 میں شروع ہوئی اور چار سال جاری رہنے کے بعد 1933ء میں دنیا اس عظیم اقتصادی جمود سے نکلنے میں بالآخر کامیاب ہو گئی۔

7.5 عظیم کساد بازاری کی وجوہات (Causes for the Great Depression)

1929 کے ابتدائی ایّام سے قبل پہلی عالمی جنگ کی تباہ کاریوں سے یورپ بہت حد تک نکل چکا تھا۔ یورپی باشندے ان حالات سے بخوبی نکلنے کے لئے پُرامید نظر آرہے تھے۔ جرمنی بھی اس تباہ کن جنگ کے نتائج سے نکل کر استحکام کی طرف پیش رفت کر رہا تھا۔ پیداوار کا نظام از سرِ نو شروع ہو چکا تھا۔ کرنسی نظام میں بھی مضبوطی آچکی تھی لیکن بہت جلد دنیا ایک نئے معاشی بحران کا شکار ہوگئی جس کے نتائج اور بھی مہلک ثابت ہوئے۔ اور دانشوروں نے یورپ کی معاشی تاریخ کا سب سے بڑا ''ڈرامائی حادثہ'' قرار دیا۔ جس کے معاشی زندگی اور سیاسی سطح پر دوررس نتائج سامنے آئے۔ انگلینڈ نے آزاد تجارت کے نظریہ کو ترک کر دیا۔ امریکہ بھی اپنے کاروباری مہم کو سرکاری تحویل میں لے آیا۔

جرمنی نے بھی اسے آمرانہ رویہ کو ترک کر دیا۔اس طرح ان ملکوں نے مقامی سطح پر خود کفالتی معیشت کو تحریک دے کر معاشی بحران سے نکلنے کی کوشش کی۔1929 کے معاشی بحران نے باقی دنیا کو بھی اپنے زد میں لے لیا۔ صنعتی ترقی رک گئی، تجارتی میدان میں برآمد اور درآمد بھی متاثر ہوئی۔ فیکٹریوں کے بند ہونے کی صورت میں بے روزگاری بڑھنے لگی۔ مزدوروں کی حالت خراب ہوگئی۔ معاشی کساد بازاری سے امریکی معیشت کو ناقابل یقین حد تک نقصان پہنچا۔ عظیم کساد بازاری کے وجوہات سے متعلق دانشوروں کے درمیان اتفاق رائے نہیں ہیں۔ بہر حال مورخین اور ماہر معاشیات نے اس کے وجوہات کا پتہ لگا کر اپنا تجزیہ پیش کیا ہے۔ عظیم کساد بازاری کی مختلف وجوہات تھیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت میں کاروباری ترقی یا پھر کساد بازاری اہم خصوصیت ہے جس کو تجارتی دورانیہ کہا جاتا ہے کچھ ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ کساد بازاری کی اصل وجہ سونا کا فقدان تھا۔ جس کی بنیاد پر ملک کی کرنسی کا دار و مدار ہوتا تھا۔امریکہ نے تجارت سے منافع کمایا اور دوسرے ملکوں کو قرض دیا جس کی ادائیگی سونے کی شکل میں ہوئی اسی طرح فرانس کے پاس بھی بہت زیادہ سونا جمع ہوگیا۔دنیا کہ چند ممالک کے پاس سونا کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے سونے کی قیمت کم ہونے لگیں۔ ہر ملک سونے کی ذخیرہ اندوزی کرنے لگا اور ہر ملک 'ساز گار تجارتی توازن' (Favorable Balance of Trade) کی دفاع کرنے لگا۔اور بین الاقوامی تجارت کو حکومت کے زیرِ نگرانی کر دی گئی۔ نئی سر گرمیاں رُک گئیں۔ بے روزگاری بڑھ گئی۔ جب معاشی سر گرمیاں ٹھپ پڑ گئیں اور بین الاقوامی بازار میں سونے کا فقدان ہو گیا تو یورپ کے بہت سے ممالک معاشی دیوالیہ پن کا شکار ہوگئے جبکہ کچھ ممالک دیوالیہ پن سے دوچار تھے۔ چاندی کی بہتات سے معاشی مسائل مزید پیچیدہ ہوگئے۔ کیونکہ چین اور ہندوستان میں اس وقت موجود چاندی سے کرنسی کی اہمیت طے ہوتی تھی۔

تجارتی سر گرمیوں میں کمی :

پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں بین الاقوامی اور ملکی تجارت تتر بتر ہوگئی۔اس کی وجہ سے معاشی بحران پیدا ہوئی جس کو عام طور پر اقتصادی کساد بازاری کہا جاتا ہے۔ جنگ کے دوران خام مال کی ضرورت کئی گنا بڑھ گئی اور پیداوار میں بھی کئی گنا اضافہ دیکھنے کو ملا۔ صنعتی پیداوار کی جب ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی تو ان کا خریدار ملنا مشکل ہو گیا۔ عالمی جنگ کے خاتمہ سے پیداوار میں کٹوتی کرنی پڑی جس کی وجہ سے فیکٹریاں بند کرنی پڑیں اور لوگ بے روزگار ہوئے۔ بازار میں اشیا ہونے کے باوجود قوت خرید کم ہونے کے باعث خریداری کم ہوگئے۔ لہٰذا صنعتی ترقی پر بریک لگ گیا۔

معاشی قومیت کے جذبہ کا فروغ :

اقتصادی کساد بازاری کے دیگر عوامل میں معاشی قومیت کے جذبہ کی ابتدا اہم تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد نو آبادیاتی ملکوں میں قومیت کا جذبہ پروان چڑھنے لگا اور ان ملکوں میں اپنی معیشت کو تحفظات فراہم کرنے کا جذبہ بھی پیدا گیا۔ لہٰذا غیر ترقی یافتہ ان ملکوں نے اپنی مقامی پیداوار کو غیر ملکی پیداوار پر ترجیح دینا شروع کر دیا۔اس طرح ترقی یافتہ ممالک کی صنعتی پیداوار کے خریدار کم ہوتے چلے

گئے۔ جس کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک کی تجارتی سرگرمیاں بری طرح متاثر ہوئیں اور کساد بازی کا شکار ہو گئیں۔

مشینوں کی پیداوار پر یورپی بالادستی کا خاتمہ :

پہلی عالمی جنگ کے دوران مشینوں کی ضرورت یا اسلحہ کی فراہمی کی پریشانیوں کی وجہ سے کئی ملکوں مثلاً انگلینڈ، فرانس، جرمنی، جاپان اور ہندوستان نے اپنی ضرورت کے تمام ساز و سامان غیر ملکوں سے خریدنے کے بجائے خود پیدا کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا ترقی یافتہ ممالک کی پیداوار کے خریدار کم ہو گئے۔ کناڈا اور روس نے اشیائے خورد نوش کی پیداوار شروع کر دیے۔ مشرقی یورپی ممالک مثلاً بلغاریہ، ہنگری، رومانیہ نے زرعی پیداوار باہر بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ مگر اس کی پیداوار پر اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے قیمت زیادہ تھی اس لئے خریدار کم تھے۔ لہٰذا انہوں نے غیر ملکی سامان خریدنا کم کر دیا کیونکہ ان ممالک کی معاشی حالت خراب ہو چکی تھی۔ اس طرح صنعتی ممالک کا سامان غیر ترقی یافتہ ممالک میں جانا بند ہو گیا۔ اس لئے کساد بازاری کی ابتدا ہوئی۔

مقروضیت کا شکار یورپی ممالک :

پہلی عالمی جنگ نے بلاشبہ سیاسی اور معاشی بحران پیدا کر دیا تھا جس کا سدِّباب آسانی سے ممکن نہیں تھا۔ اس لئے یورپ کے کئی ملکوں کی صنعتی ترقی کا انحصار قرض پر منحصر تھا۔ جنگ کے بعد جرمنی نے اپنے تعمیراتی منصوبوں کے لئے امریکہ سے 50 کروڑ پاؤنڈ کا قرضہ لیا۔ اس قرض کی مدد سے جرمنی کی از سر نو تعمیر شروع کی۔ تجارت کی توسیع کو عملی جامہ پہنایا اور اسی قرضہ سے زرتاوان بھی ادا کیا۔ جرمنی خوشحالی کے راستے پر گامزن ہو گیا اور اس کو جاری رکھنے اور مزید تعمیراتی منصوبوں کے لئے مزید قرض درکار تھی۔ لیکن جب امریکہ میں معاشی بحران پیدا ہوا تو اس نے دوسرے ملکوں کو قرض دینا بند کر دیا۔ اس کے بینک بھی دیوالیہ پن کا شکار ہو رہے تھے۔ امریکہ نے غیر ملکی مصنوعات پر بھاری محصول عائد کر دیا۔ معاشی بحران کی وجہ سے امریکہ نے یورپی ممالک کو جب قرض دینا بند کر دیا تو ان ممالک میں بھی معاشی بحران پیدا ہونے لگا اور وہ سبھی کساد بازاری کا بہت آسانی سے شکار ہو گئے۔ امریکہ یورپی مصنوعات کا خریدار تھا جب اس نے اپنے ملک میں درآمدات پر پابندی عائد کر دی تو یورپی ممالک کی صنعتی پیداوار بری طرح تباہ ہو گئی۔ 1930 میں جب قیمتوں میں گراوٹ آئی تو امریکی قرضہ بڑھ کر دوگنا ہو گیا جس کی ادائیگی یورپی ممالک کے لئے مزید مشکل ہو گئی اور ادائیگی کی صورت میں وہ خود دیوالیہ پن کا شکار ہونے لگے۔

روس میں اشتراکیت کا عروج :

روس میں اشتراکیت (Communism) کا عروج بھی عظیم کساد بازاری کے لئے بہت حد تک ذمہ دار مانا جاتا ہے۔ کیونکہ زار نکولس کے زمانے میں یورپی ممالک کو جو قرض دیا گیا تھا اس کے بقیہ حصّے اس کو روسی انقلاب کے بعد نئی قیادت نے منسوخ کر دیا۔ جس کی وجہ سے یورپی ممالک کو اپنی ترقی پسند منصوبوں کے لئے فنڈ کی فراہمی منقطع ہو گئی اور شدید معاشی بحران پیدا ہو گیا۔ یورپی ممالک نے عظیم کساد بازاری کو مزید تقویت بخشی۔

امریکی وال اسٹریٹ کا بحران :

معاشی کساد بازاری کو وال اسٹریٹ اور نیویارک شیئر بازار میں غیر یقینی کی صورت حال نے معاشی بحران نے مزید بڑھاوادیا۔ 26،اکتوبر1929ء کو شیئر کی قیمتوں میں بے تحاشا گراوٹ سے معاشی سر گرمیوں کو اچانک زبردست جھٹکالگا۔امریکی حکومت اور سرمایہ داروں نے مداخلت کر کے اگر چہ بحران کو مزید ابتر ہونے سے فوری طور پر ضرور بچالیا مگر نومبر 1929ء میں دوسری مرتبہ شیئر کی قیمتوں میں زبردست کمی آئی۔ جس کی وجہ سے امریکی سرمایہ دار طبقہ تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ایسی صورت حال میں امریکہ سرمایہ داروں نے کسی بھی دوسرے ملک میں سرمایہ کاری سے ہاتھ کھینچ لیا۔امریکی حکومت نے یورپی ممالک کو قرض دینے سے انکار کر دیا۔اس سے یورپی ممالک میں سرمائے کے فقدان اور معاشی بحران نے معیشت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔یہ حالات مجموعی طور پر کساد بازای کا موجب بنیں۔

بینکنگ نظام کی ناکامی :

عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد اگرچہ معاشی ادارے اپنی سر گرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے ترقی کے راستے پر گامزن تھے۔ لیکن 1928ء کے بعد بینک بھی دیوالیہ پن کا شکار ہونے لگے جس سے کساد بازاری کا مزید خطرہ بڑھ گیا۔مئی 1931ء میں آسٹریا کا مرکزی بینک کا دیوالیہ ہو گیا۔ حالانکہ امریکی صدر نے جرمنی پر عائد زرتاوان کی رقم کو معاف کر دیا تھا، قرض اور اس کی ادائیگی کو بھی موقوف کر دیا پھر بھی جرمنی کا مرکزی بینک بھی دیوالیہ ہو گیا اور جرمنی کو دوسرے بینک بھی بند کرنے پڑے۔یہی کچھ حال بینک آف انگلینڈ کا ہوا۔بدحواسی کے عالم میں دوسرے ملکوں نے بینک آف انگلینڈ سے اپنا اثاثہ نکال لیا۔دیوالیہ پن سے بچنے کے لئے بینک آف انگلینڈ نے امریکی اور فرانسیسی بینکوں سے کروڑوں کا قرضہ لیا۔ معاشی بحران کی وجہ سے انگلینڈ میں لیبر پارٹی کی حکومت کو استعفیٰ دینا پڑا اور بطور تادیبی کاروائی قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا تا کہ معاشی بحران کو حل کیا جاسکے۔نہ صرف انگلینڈ میں ایسے حالات رونما ہوئے بلکہ یورپ کے دیگر ممالک کو بھی اس مشکل حالت کا سامنا کرنا پڑا۔

زرعی میدان میں تکنیکی ترقی :

صنعتی انقلاب سے پہلے انگلینڈ میں زرعی انقلاب آچکا تھا نیز یورپ کے دیگر ممالک میں بھی زرعی انقلاب کے اثرات نمایاں تھے۔ یورپ کے تمام ممالک زرعی پیداوار کو بڑھانے اور زرعی اعتبار سے خود کفیل ہونے کے لئے زرعی میدان میں نئے ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے لگے۔اس کی وجہ سے زرعی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔عالمی جنگ سے قبل اور بعد میں یورپی ممالک میں ٹیکنالوجی کے استعمال سے گیہوں کی پیداوار میں گراں قدر اضافہ ہوا۔لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گیہوں کی قیمت میں رکارڈ گراوٹ آئی۔اسی کے ساتھ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ارجینٹینا وغیرہ میں گیہوں کی زبردست فصل ہوئی جو ضرورت سے زیادہ تھی۔غیر ترقی یافتہ ممالک کو اناج کی ضرورت تھی لیکن ان کی کمزور معیشت اور کمزور قوت خرید نے اناج کی درآمد کو مشکل بنادیا۔ جس کی وجہ سے زرعی طور پر خود کفیل ممالک کو معاشی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔کساد بازاری کے لئے زرعی میدان میں تکنیکی ترقی بہت حد تک ذمہ دار مانا جاتا ہے۔

صنعتی خودکارسازی :

صنعتی انقلاب نے فیکٹری سسٹم کو جنم دیا۔ فیکٹریوں میں مشین کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی وجہ سے پیداوار کے عمل میں تیزی آگئی۔ اس طرح نئی نئی مشینوں کی ایجاد اور ان کے استعمال نے صنعتی ترقی میں خوب اضافہ کیا۔ مشینوں کے استعمال سے صنعتی استعداد ضرور پیدا ہوئی لیکن اس نے بے روزگاری کو جنم دیا۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کی قوت خرید کم ہوگئی اور یورپ کی معیشت پر منفی اثرات پڑے۔ آج جدید ٹیکنالوجی مثلاً مصنوعی ذہانت کے استعمال سے صنعتی ترقی میں تیز ہوئی ہے۔ دانشوروں نے مصنوعی ذہانت سے مستقبل قریب میں بے روزگاری کے غیر معمولی طور پر بڑھنے کا خدشہ ظاہر کر رہے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح کساد بازاری سے قبل مشینوں کے استعمال نے بے روزگاری کو جنم دیا تھا۔

7.6 عظیم کساد بازاری اور ہندوستانی معیشت (The Great Depression and Indian Economy)

عظیم کساد بازاری نے یورپی اور امریکی سرمایہ دارانہ معیشت کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہندوستان کا یورپی ملکوں سے چونکہ تجارتی رشتہ تھا اس لئے ہندوستان کی معیشت بھی اس سے اثرانداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ عظیم کساد بازاری کی وجوہات کا تنقیدی اور تفصیلی جائزہ ماہر معاشیات نے بہت توجہ سے لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زرعی اور صنعتی سیکٹر میں مشینوں کے غیر معمولی استعمال اور پیداوار میں تیز رفتاری نے کساد بازاری کو فروغ دیا۔ کرنسی نظام میں گڑبڑی، افراط زر کی غیر منصفانہ تقسیم، تحفظاتی تجارتی پالیسی اور اسٹاک ایکسچینج میں بڑھتی قیاس آرائیوں نے اس کساد بازاری کے عمل کو مزید تیز کر دیا۔ سب سے پہلے امریکہ میں کساد بازاری کا عمل شروع ہوا بعد یورپی ممالک میں اس نے تباہی مچائی ہندوستان میں بھی اس کے منفی اثرات نے ہندوستانی معیشت اور سماج دونوں کو متاثر کیا۔

عظیم کساد بازاری اور ہندوستانی زراعت :

کساد بازاری کی وجہ سے امریکی اور یورپی زراعت کی طرح ہندوستان کی زراعت بھی اثرانداز ہوئی۔ ہندوستان میں اکتوبر 1929ء کے بعد زرعی پیداوار کی قیمتوں میں گراوٹ آئی جس کی وجہ سے کسانوں کی آمدنی میں کمی درج کی گئی۔ ہندوستانی تجارت چونکہ زرعی پیداوار پر منحصر تھی لہٰذا تجارت بھی بہت حد تک متاثر ہوئی۔ عظیم کساد بازاری کا اثر ہندوستان کی معیشت مثلاً قیمتوں، زراعت، صنعت، تجارت اور لوگوں کی آمدنی ان کی طرز زندگی اور روزگار پر دیکھنے کو ملا۔ زرعی پیداوار کی قیمتوں میں گراوٹ کی وجہ سے زرعی طبقہ کے لوگوں کی آمدنی کم ہوئی مگر ان پر عائد مالگذاری وقت پر ہی ادا کرنی ہوتی تھی۔ لہٰذا کساد بازاری کے دوران معاشی اعتبار سے یہ طبقہ مفلوک الحالی کا شکار رہا ان کی مقروضیت میں اضافہ ہو گیا۔ عظیم کساد بازاری کی وجہ سے جس طرح یورپی ممالک کی زراعت تباہ ہوئی تھی ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں زراعت تباہ و برباد ہوئی۔ سرمایہ کاری کے لئے کسانوں کے پاس پیسہ نہیں تھا جس کی وجہ سے کسان مقروض ہوتے چلے گئے اور بسا اوقات حالات سے نمٹنے کے لئے انہیں اپنا سونا بھی بیچنا پڑا۔ ڈی۔ آر گیڈ گل نے لکھا ہے کہ ”کساد بازاری کے دوران ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں حکومت نے زرعی طبقہ کی اس بحران کے دوران کوئی مدد نہیں کی۔“ کساد بازاری کے خاتمہ کے بعد ہی حالات میں کچھ تبدیلی آئی اور

زرعی طبقہ کوراحت ملی۔

کساد بازاری کا تباہ کن اثر ہندوستان کی صنعت پر بھی واضح طور پر نمایاں تھا چونکہ زرعی پیداوار کی قیمتوں میں گراوٹ اور بے روزگاری کی وجہ سے لوگوں کی قوّت خرید چونکہ کم ہو گئی تھی، لہٰذا صنعتی مصنوعات کی مانگ کم ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں صنعتی مصنوعات کی قیمتیں کم ہو گئیں اور منافع بھی کم ہونے لگا۔ لیکن ہندوستان میں جنگ آزادی کی جدوجہد کے دوران سودیشی تحریک نے یہاں کی صنعت کو فروغ دینے میں اہم کردار کیا۔ خام مال کی برآمدات اور جاپان سے معاہدہ ہونے کی صورت میں مقامی صنعتوں کو ترقی کا موقع ملا۔ مثلاً سوتی کپڑے، جوٹ اور دیگر صنعتوں نے سودیشی تحریک کے زیر اثر پیداوار کو مزید بڑھاوا دیا اور ملکی سطح پر قومی قیادت نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ کساد بازاری کی وجہ سے پیدا ہونے والا عالمی معاشی بحران نے ملکی اور بین الاقوامی تجارت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ جس سے ہندوستانی تجارت بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکی۔ کساد بازاری کی وجہ سے زیادہ تر ملکوں نے آزادانہ تجارت (*Laissez Faire*) کی پالیسی کو ترک کر کے تحفظاتی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کو فوقیت دی جس کا منفی اثر ہندوستانی تجارت پر بھی پڑا۔ برآمد سے حاصل ہونے والے زرمبادلہ میں بہت کمی آ گئی ''ہوم چارجز ''Home Charges'' کی ادائیگی کو یقینی بنانے کے لئے ملک کا سونا فروخت کرنا پڑا جس کا منفی اثر ہندوستان کی کرنسی نظام پر پڑا۔ اور معاشی بحران مزید تباہ کن ہو گیا۔ معاشی مورخین اور قومی رہنماؤں نے ''کساد بازاری کے دور کو ہندوستان کی معیشت کے لئے پریشان کن بتایا۔'' ہندوستانی عوام کے لئے یہ بہت ہی صبر آزما دور تھا کیونکہ کساد بازاری کی وجہ سے ایک طرف معاشی بحران کا سامنا تھا وہیں جنگ آزادی کی تحریک اور انگریزوں کے مظالم اور معاندانہ رویہ سے ہندوستان کو سیاسی بحران کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

7.7 عظیم کساد بازاری کے نتائج (Consequences of the Great Depression)

عظیم کساد بازاری نے دنیا کو معاشی بحران میں مبتلا کر دیا۔ اس کے نتائج صرف معاشی زندگی اور معیشت تک محدود نہیں تھی بلکہ اس نے سماجی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کو بھی متاثر کیا۔ عظیم کساد بازاری کے نتائج اور ان سے پیدا ہونے والے منفی اثرات کا تجزیہ معاشی ماہرین اور دانشوروں نے کر کے اس کے نتائج پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل نتائج رونما ہوئے:

دنیا کی نظام زر میں تبدیلی :

عظیم کساد بازاری کا آغاز اکتوبر 1927 میں امریکہ کے وال اسٹریٹ میں اسٹاک ایکسچینج کے اچانک ڈھیر ہو جانے سے ہوا اور کساد بازاری پوری دنیا بھر میں پھیل گئی۔ دنیا کے بینکنگ نظام فیل ہونے لگا۔ بینک دیوالیہ پن کا شکار ہونے لگے۔ اس بحران کے دوران انگلینڈ نے اپنی کرنسی پاؤنڈ کو گولڈ اسٹینڈرڈ سے الگ کر لیا تاکہ اپنی معیشت کو بہتر کر سکے۔ دنیا میں گولڈ کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے کساد بازاری کا مسئلہ سنگین ہوتا چلا گیا جب انگلینڈ نے اپنی کرنسی کو گولڈ اسٹینڈرڈ سے باہر کر لیا تو دنیا کے تقریباً 40 ملکوں نے اس کی پیروی کی جس سے دنیا کی نظام زر کو سنگین مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ 1931ء میں کساد بازاری کا مسئلہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ دانشوروں اور سیاستدانوں کو اس کساد بازاری سے پیدا شدہ معاشی بحران سے نکلنے کا کوئی عملی اور فوری راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کساد بازاری کا اثر ہندوستان کی نظام زر پر

پڑا۔ انگریزوں نے روپیہ کو برطانوی پاؤنڈ اسٹرلنگ سے منسلک کر دیا۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ ہندوستان نے اسٹرلنگ ایکسچینج اسٹینڈرڈ قبول کر لیا۔ قومی رہنماؤں نے اس کی مخالفت کی جبکہ برطانوی حکمرانوں نے اس کی مدافعت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہندوستان کی معیشت کے لئے بہتر قدم ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے ہندوستان کو بھاری قیمت چکانی پڑی۔ 1931ء سے لے کر 1940 تک ہندوستان نے تقریباً 382 کروڑ روپیہ کی قیمت کا سونا انگلینڈ کو برآمد کیا۔ جو ہندوستان کی معیشت کے لئے ایک بڑا خسارہ تھا۔

آزاد تجارت کی پالیسی کا خاتمہ :

سامراجیت کی توسیع کا مطالعہ مورخین نے تین مختلف ادوار میں تقسیم کر کے کیا ہے۔ پہلا تجارتی سرمایہ داری کا دور تھا جس میں سرمایہ دار ممالک نے درآمدات پر مکمل پابندی عائد کر کے اپنی معاشی ترقی کے لئے تحفظاتی قدم اٹھایا۔ دوسرا دور آزاد تجارت کا دور تھا جس کو *Laissez Faire* کہتے ہیں۔ تیسرا دور مالیاتی سرمایہ داری کا تھا۔ آزاد تجارت کی پالیسی نے بین الاقوامی تجارت کے حجم کو کئی گنا بڑھا دیا تھا اور اس دور نے سرمایہ دار ملکوں کو تجارت سے حاصل شدہ آمدنی کو دولت اکٹھا کرنے (Capital Accumulation) میں خوب مدد کی۔ کساد بازاری نے دنیا کو ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ کساد بازاری سے متاثرہ ملکوں نے اپنی معیشت کو بچانے اور اس معاشی بحران سے نکلنے کے لئے فوری طور پر آزاد تجارت کی پالیسی کو ترک کر دیا اور معیشت کو بچانے کے لئے تحفظاتی اقدام کے طور پر بھاری بھرکم محصول عائد کرنا شروع کر دیا۔ انگلینڈ نے انڈسٹریل پروٹیکشن ایکٹ پاس کیا۔ اس کا مقصد اپنے صنعتی مفاد کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔

جرمن شورش اور نازی ازم کا عروج :

معاشی کساد بازاری نے جرمنی میں سیاسی شورش برپا کر دیا۔ پہلی عالمی جنگ نے وہاں کی معیشت کو تہس نہس کر دیا تھا۔ بے روزگاری حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ عوام میں اضطراری کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جرمنی مقروض ہو گیا تھا۔ شکست خوردہ جرمنی پر فاتح ممالک کا غیر منصفانہ زرتاوان کی مانگ سے ملک میں عام بے چینی تھی۔ غرض یہ کہ جرمنی کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالات نے نازیت کے عروج کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ نازی پارٹی امن معاہدہ سے خوش نہیں تھی اور اس نے جنگی تاوان کے مطالبہ کی بھی مخالفت کی۔ معاشی بحران نے نازی پارٹی کی خدشات کو صحیح ثابت کر دیا اور ہٹلر کی قیادت میں نازیت کی سیاسی سرگرمیوں نے دوسری عالمی جنگ میں ڈھکیل دیا۔

یورپی ممالک کی معاشی گروہ بندی :

معاشی کساد بازی کے نتیجے میں یورپی ممالک تین مختلف گروہ میں منقسم ہو گئے۔ پہلا گروہ جس نے سونے کی آزادانہ برآمدات اور لین دین کی حمایت کی اور گولڈ اسٹینڈرڈ پر قائم رہے، مثلاً، فرانس، اٹلی، پولینڈ، بیلجیئم، ہالینڈ اور سوئزرلینڈ وغیرہ یہ گروپ ''گولڈ بلاک'' کہلایا۔ دوسرا گروہ ان ممالک پر مشتمل تھا جس نے گولڈ اسٹینڈرڈ کو مکمل طور پر منسوخ کر دیا اس میں انگلینڈ، سویڈن، ناروے، ڈنمارک، فنلینڈ وغیرہ شامل تھے۔ تیسرے گروہ نے دراصل گولڈ کی درآمد کو محدود کیا اور گولڈ اسٹینڈرڈ کو بھی موثر طریقے سے ترک کر دیا۔ لیکن اس

گروپ نے زرمبادلہ پر کنٹرول جاری رکھا اور اپنی کرنسی کا مصنوعی توازن برقرار رکھا۔ مثال کے طور پر جرمنی۔

اٹلی میں داخلی مسائل اور فسطائیت کی ابتدا :

عالمی کساد بازاری نے اٹلی نے خانگی مسائل پیدا کر دیے۔ جس کو کامیابی کے ساتھ حل کرنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ ملک کے سامنے سلامتی کا سنگین مسئلہ تھا۔ بے روزگاری حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے غربت وافلاس تھی۔ لوگوں میں عام مایوسی اور اضطراب تھا۔ سیاسی انتشار تھا جس نے اٹلی میں فسطائیت کے عروج کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔

سرمایہ دار ملکوں کی معاشی خستہ حالی :

سرمایہ دار ملک مثلاً امریکہ اور یورپی ممالک کساد بازاری کی وجہ سے معاشی خستہ حالی کا شکار ہو گئے۔ 1930 کے بعد معاشی کساد بازاری کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ سیاسی اعتبار سے تنہا پڑ گیا۔ صنعتی پیداوار ان سبھی ممالک میں 1929ء کے مقابلہ 1933 نصف رہ گئی۔ کیونکہ صنعتی مصنوعات کی مانگ میں کمی آ گئی۔ لوگوں کو کمپنیوں نے ملازمت سے نکال دیا۔ جس کے نتیجے میں عالمی سطح پر بے روزگاری میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں بے روزگاروں کی تعداد تقریباً 100 ملین تک پہنچ گئی۔ 14 ملین صرف امریکہ میں تھے معیار زندگی میں تشویشناک حد تک گراوٹ آ گئی۔ کساد بازاری کے نتیجے میں پوری دنیا غربت اور فاقہ کشی کا شکار ہو گئی۔ زرعی پیداوار کی قیمتوں میں بھی بے تحاشا گراوٹ آئی۔ جرمنی میں کساد بازاری کے نتیجے میں نازیت اور اٹلی میں فسطائیت کے عروج کا راستہ ہموار ہو گیا۔ جاپان میں کساد بازاری کی وجہ سے تجارت کم ہو کر آدھی ہو گئی جس کی وجہ سے ملک میں سیاسی انتشار اور سماجی خلفشار پیدا ہو گیا۔ اپنی معیشت کو پٹری پر لانے کے لئے جاپان معاشی توسیع پسندی کے منصوبہ پر عمل پیرا ہوا۔ 1931 میں جاپان نے منچوریا پر حملہ کر کے ایک اجتماعی سلامتی کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ فرانس میں کساد بازاری نے سیاسی استحکام کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ فرانسیسی کرنسی بھی عالمی سطح Depreciate ہو گئی۔ امریکی اور برطانوی معاشی امداد کے باوجود فرانس کساد بازاری کے تباہ کن نتائج سے بچ نہیں سکا۔

اشتراکی نظریات :

یہ بات قابل غور ہے کہ کساد بازاری کا اثر دنیا کے تمام سرمایہ دار ملکوں پر نمایاں طور پر دیکھنے کو ملا۔ لیکن حیرتناک طور پر اشتراکی ملکوں میں اس کا اثر قدرے کم تھا۔ دنیا میں لوگ سرمایہ دارانہ نظام چھوڑ کر اشتراکی نظریات کی حمایت کرنے لگے۔ یہی وجہ کہ 1930 سے لے کر 1939 تک کا وقفہ ''گلابی عشرہ'' "Pink Decade" ''گلابی عشرہ'' کہلایا۔ امریکہ اور یورپی سرمایہ دار ملکوں کے برخلاف سویت روس معاشی میدان میں ترقی کے راستے پر گامزن رہا۔

روزویلٹ کینیوڈیل اور برطانوی معاشی قومیت کی ابتدا :

پہلی عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں سب کچھ موثر اور پر اطمینان طریقے سے جل رہا تھا۔ معاشی اور صنعتی ترقی، تشفّی اور منافع بخش تھی۔ لیکن 1929ء کے اکتوبر میں امریکہ میں اچانک کساد بازاری نے دستک دے دی۔ امریکہ نے اتحادی ملکوں کو اتنا زیادہ قرض دے دیا کہ

خود اس کی معیشت پسماندگی کا شکار ہوگئی۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد امریکی مصنوعات کی مانگ کم ہوگئی جس کی وجہ سے پیداوار کچرے کا ڈھیر بن گیا۔ سرمایہ دار اور صنعت کار تباہ ہوگئے۔ فیکٹریاں بند ہونے لگیں لوگ بے روزگار ہوگئے۔ زرعی پیداوار کی قیمتیں کم ہونے لگیں اور کسان خسارہ میں آگیا۔ اسٹاک بازار تباہ ہونے کی وجہ سے لاکھوں شیئر ہولڈرس / سرمایہ کاروں کی زندگی تباہ ہوگئی۔ بینک دیوالیہ پن کا شکار ہورہے تھے۔ لوگوں کی معیار زندگی کم تر ہورہی تھی۔ دوسرے ملکوں میں امریکی مصنوعات کی مانگ کم ہوگئی تھی۔ اس کی وجہ سے امریکی غیر ملکی تجارت کو شدید نقصان ہوا۔ عظیم کساد بازاری کے تباہ کن اثرات سے امریکہ کو بچانے کے لئے امریکی صدر روزویلٹ نے ایک پالیسی وضع کی جسے 'نیوڈیل' کہا جاتا ہے۔ امریکی عوام کو کساد بازاری سے نکالنے کے لئے روزویلٹ نے کئی اہم اقدامات اٹھائے۔ روزویلٹ کا نعرہ تھا "Relief, Recovery, and Reform" تینوں اصولوں پر قائم رہتے ہوئے انہوں نے غربت زدہ اور مایوس امریکیوں کو کساد بازاری سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا اور برطانیہ نے اپنی معیشت کو تباہ کن کساد بازاری سے نکالنے کے لئے معاشی قومیت کا نظریہ پیش کیا۔ ملک کی معیشت کو سرکار کے زیر کنٹرول لاکر اس کو نئی زندگی بخشنے کی کوشش کی۔

مجلس اقوام کی بالادستی کا خاتمہ :

1929ء عظیم کسادی سے پیدا ہونے والی معاشی بحران نے مجلس اقوام جس کا قیام پہلی عالمی جنگ کے بعد عالمی امن وامان قائم کرنے اور ملکی تنازعات کو حل کرنے کے لئے کیا تھا۔ بہت حد تک مفلوج ہوکر رہ گیا۔ جس کی وجہ سے اس کی عالمی تنظیم کی حیثیت ختم ہوگئی۔ 1931 میں مشرقی بحران 1935ء میں ایتھوپیا پر جاپان کا حملہ، اسپین پر جرمنی اور اٹلی کا حملہ وغیرہ کو مجلس اقوام حل کرنے میں بری طرح ناکام ہوگیا اور عالمی امن اور سلامتی کی امیدیں مفقود ہوگئیں۔

کساد بازاری کے سیاسی نتائج :

دانشوروں اور ماہر معاشیات نے عظیم کساد بازاری کے معاشی نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے وہیں مورخین اور دانشوروں نے کساد بازاری مطالعہ کرکے اس کے عالمی سطح پر رونما ہونے والے سیاسی نتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً معاشی قومیت کے نظریہ کی ابتدا سے ہی یہ بین الاقوامی رشتہ کا اہم رہنما اصول بن گیا تھا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سیاسی نظام معاشی نظام سے مربوط ہوتا ہے۔ کسی بھی نظام میں تبدیلی دوسرے کو حیرتناک حد تک متاثر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب عظیم کساد بازاری کی وجہ سے دنیا میں معاشی بحران آئی تو اس نے سیاسی حکمرانوں کو آزاد تجارت کے نظریہ کو ختم کرنے کی ترغیب دے کر اس پر حکومت کا قبضہ قائم کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس کے علاوہ لوگوں کا خیال تھا کہ ملک میں قیادت کی تبدیلی سے معاشی مسائل کا حل ممکن ہے۔ انگلینڈ میں پارلیمنٹ کو مزید اختیارات دئے گئے تاکہ وہ معاشی بحران حل کرنے کے لئے منصوبہ بند طریقے سے کوشش کرے اس لئے لیبر پارٹی کی حکومت کو مستعفی ہونا پڑا اور قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ جرمنی نے پارلیمانی جمہوریت کے بجائے مطلق العنانیت کو پسند کیا گیا کیونکہ وہ معاشی بحران کو حل کرنے میں زیادہ کارگر ہوسکتے تھے۔ عظیم کساد بازاری کے دوران امریکی صدر روزویلٹ کو بے پناہ اختیارات تفویض کردی گئیں۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی ڈکٹیٹر شپ قائم کیا گیا تاکہ کساد بازاری کا مکمل خاتمہ کرکے معیشت کو از سرِ نو بحال کیا جاسکے۔

کساد بازاری سے نمٹنے کے لئے عالمی کوششیں :

کساد بازاری نے پوری دنیا کی معاشی اور صنعتی ترقی کو چند سالوں کے لئے موقوف کر دیا تھا۔اس کے تباہ کن نتائج سے نکلنے کے لئے امریکی صدر نے نیوڈیل(New Deal) جیسا اصلاحی قدم اٹھایا وہیں اس بحران سے نمٹنے کے لئے انگلینڈ ، فرانس، جرمنی، اٹلی، بیلجیم، جاپان کے نمائندوں کی ایک کانفرنس جون 1932 میں لوزان (Lausanne) میں منعقد ہوئی، ہفتوں تک چلی اس کانفرنس اور نمائندوں کی بحث اور مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ جرمنی پر جو زرتاوان عائد کیا گیا ہے اس کو منسوخ کر دیا جائے اور اس کی جگہ جرمنی 3 ہزار ملین مارک یورپ کی تعمیر نو کے لئے مختص کرے۔ جرمنی کو اپنی تمام واجب الادائیگی رقومات سے فوری طور پر ریلیف مل گیا۔ یہ مراعات جرمنی کو کسی ہمدردی کی جذبہ سے نہیں بلکہ عالمی تجارتی سرگرمیوں کو ازسرِ نو بحال کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔اس منصوبہ کو یورپی حکمرانوں نے خوش آئند بتایا۔ لیکن امریکہ چند بنیادی وجہ سے اس منصوبہ میں تصحیح چاہتا تھا اس کو جب تسلیم نہیں کیا گیا تو امریکہ کی مخالفت کی وجہ سے یہ معاہدہ موثر ثابت نہیں ہو سکا۔

لوزان کانفرنس کی ناکامی کے بعد 1933ء میں لندن میں 'World Monetary and Economic Conference' منعقد ہوئی جس میں 64 ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ لیکن لوزان کانفرنس کی طرح لندن کانفرنس بھی آغاز میں ہی ناکام ہوگئی کیونکہ مندوبین کا ماننا تھا کہ اگر یہ کانفرنس کساد بازاری کے ابتدائی ایّام میں منعقد ہوئی ہوتی تو" حکومتیں شاید قربانی کے لئے تیار ہوتیں جو اہم تبدیلیوں کو موثر بنا سکتی تھیں مثلاً محصولات کو کم کرکے اور تمام رکاوٹوں کو ختم کر کے بین الاقوامی تجارت کو بحال کیا جاسکتا تھا۔" لیکن 1933 میں کساد بازاری کے خاتمہ اور نئی تبدیلی مثلاً معاشی احیا اور بے روزگاری شرح میں کمی کے اشارے ملنے لگے تھے۔ایسی حالت میں بہت سے یورپی ممالک نے کانفرنس کی شرائط کو لاگو کرنے کے لئے متفق نہیں تھیں سے نااتفاقی کا اظہار کیا۔ جو کانفرنس کی ناکامی کی سبب تھی۔ یورپی ممالک اس پر متفق تھے کہ سب سے پہلا اور اہم قدم مالیاتی استحکام (Monetary Stabilisation) ہے بقیہ دوسرے مسائل ثانوی نوعیت کے ہیں اور ان کو رفتہ رفتہ حل کیا جاسکتا ہے۔ان ممالک کا خیال تھا کہ محصولات میں کمی لانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کرنسی میں اتار چڑھاؤ (fluctuation) ہوتا رہے گا لہٰذا مالیاتی استحکام، معاشی اصلاحات کے لئے اشد ضروری تھا۔ روزویلٹ نے امریکہ میں کرنسی نظام میں اصلاحات لانے کے لئے نیوڈیل کی پالیسی کو نافذ کر دیا تھا جو بنیادی طور پر امداد، بحالی اور اصلاح (Relief, Recovery, and Reform) کے اصول پر قائم تھا۔ لہٰذا ایسی صورت حالات میں یورپی ممالک کی تحفظاتی قدم اور معاشی قومیت کی آندھی کو روکنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

مطلق العنان حکومتوں کا قیام :

پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد یورپ میں جمہوری حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن جنگ کے خاتمہ کے بعد یہ حکومتیں سیاسی ،سماجی اور معاشی مسائل کو عوامی امیدوں کے مطابق حل کرنے میں ناکام ہو گئیں تھیں۔ان کی ناکامی کے پیشِ نظر یورپ کے کئی ملکوں میں ڈکٹیٹر شپ کا قیام عمل میں آیا۔ 1929ء کی عظیم کساد بازاری کی وجہ سے معاشی مسائل مزید پیچیدہ ہوگئے۔ جس کے نتیجے میں عوام

کو مشکلات، غربت اور بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ عوام میں عام بے چینی، مایوسی اور ناامیدی تھی۔ عوام نے ایسی قیادت کو خوش آمدید کہا اور تعاون دیا جسے روشن مستقبل اور ملک کو معاشی بحران سے نجات دلانے کا وعدہ کیا۔ اس طرح یورپی اور دیگر ممالک میں مطلق العنانیت کے لئے راستہ ہموار ہوا۔

7.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

پہلی عالمی جنگ کے دوران تمام تباہ کاریوں کے باوجود دفاعی اور زراعت پر مبنی صنعتی ترقی ہوئی کیونکہ دفاعی اسلحوں اور دیگر مصنوعات کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد اگرچہ معاشی تباہی نے ملکوں کی صنعتی ترقی کو وقتی طور پر موقوف کر دیا تھا لیکن جلد ہی امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں معاشی اور صنعتی احیا ہونے لگی۔ تجارتی اور صنعتی ترقی شروع ہو گئی۔ لیکن 1929 میں امریکہ جس کی معیشت پہلی عالمی جنگ کے بعد از سرِ نو تجدید اور احیا کے دور سے گذر رہی تھی عظیم کساد بازاری کا شکار ہو گئی اور بہت جلد پوری دنیا اس کے زد میں آ گئی۔ امریکہ جس نے کساد بازاری کو جنم دیا اس کے چند وجوہات جس کا جائزہ ماہر معاشیات نے لیا ہے ان میں بقول ڈائٹمیر رددمنڈ ''گیہوں کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ، دوئم امریکی کریڈٹ سسٹم کا ناکارہ انتظام و انصرام تھا، سوئم امریکی اسٹوک مارکیٹ کا بے قابو ہونا تھا۔''

عظیم کساد بازاری کا اثر ہندوستان کی زراعت، تجارت اور صنعت پر بھی دیکھنے کو ملی۔ ڈی۔ آر۔ گیڈ گل کا خیال ہے کہ ''پہلی عالمی جنگ نے نئے حالات پیدا کر دیئے تھے جو ہندوستانی صنعتوں کی ترقی کے لئے عموماً سازگار تھے اور جنگ کے اختتام پر بھی ہر چیز پوری گرم بازاری boom کے لئے تیار تھی'' لیکن جنگ کے خاتمہ کے بعد عالمی جنگ کے دوران کے مقابلہ اشیا کی مانگ میں عالمی سطح پر کمی آ گئی۔ اور صنعتی ترقی کے ساتھ ہندوستان کی معیشت جب دشوار کن دور سے گذر رہی تھی۔ 1920 کی کساد بازاری اور معاشی بحران نے ہندوستانی معیشت کو بھی اپنے گرفت میں لے لیا۔ گیڈ گل کساد بازاری کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''عالمی سرد بازاری نے ٹیکسٹائل انڈسٹری کو دو طریقوں سے متاثر کیا اوّل یہ ہے کہ زراعت کی پست حالت کی وجہ سے گھریلو مانگ کم ہو گئی اور دوئم یہ کہ بیرونی بالخصوص جاپانی مقابلہ نے شدّت اختیار کی۔ سیاسی میدان میں ابھرنے والے واقعات سے سرد بازاری کے ابتدائی برسوں میں ان عناصر کے اثرات کمتر ہو گئے۔'' مہاتما گاندھی کے ذریعہ چلائی گئی سودیشی تحریک نے ہندوستانی زراعت اور صنعت کو بہت حد تک ایک نئی زندگی دے کر صنعتی ترقی کی رفتار کو جاری رکھا۔ اس کے باوجود گیڈ گل لکھتے ہیں کہ ''1929ء میں شروع ہونے ہونے والی سرد بازاری نے بنگال کے جوٹ کی معیشت کو متاثر کیا جبکہ یہ بلندی پر جا رہی تھی۔ جوٹ کے کاشتکاروں کو سب سے زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑا۔ الغرض ہندوستان کی معیشت اور کسان بھی کساد بازاری سے یکساں طور پر متاثر ہوئے۔ عالمی کوششوں بالخصوص امریکہ کی اصلاحی پالیسی، مثبت سوچ اور دور اندیش قیادت نے اس عالمی معاشی بحران کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1933ء میں دنیا اس بحران سے نکلنے میں کامیاب ہوئی اور ترقی کے راستہ پر گامزن ہو گئی۔

7.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

سرمایہ داری	:	دولت مندی،امارت
سامراجیت	:	ملوکیت، شہنشاہیت
نوآبادیات	:	نوآبادی بنانے کا عمل، کسی علاقہ یا ملک پر قبضہ کرکے حکومت کرنا
کساد بازاری	:	بازار کی سر گرمی میں کمی، لین دین یا مانگ کا سرد ہو جانا، مندی
سرمایہ کاری	:	دولت لگا کر دولت کمانا
نصب العین	:	مقصد، منشا
دیوالیہ پن	:	کھوکھلا، بے مایہ، زوال پذیر

7.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سرمایہ داری نظام سے کیا مراد ہے؟
2. کساد بازاری کا مطلب کیا ہے؟
3. سامراجیت کس کو کہتے ہیں؟
4. 'Capital Accumulation' سے کیا مراد ہے؟
5. سونے کے فقدان نے کس طرح عظیم کساد بازاری کو فروغ دیا؟
6. "معاشی قومیت کا جذبہ" پر ایک مختصر نوٹ لکھیئے۔
7. کساد بازاری نے جرمنی میں نازیت کو کس طرح جنم دیا؟
8. صنعتی خود کار سازی کا مطلب کیا ہے؟
9. کساد بازاری سب سے پہلے کس ملک میں رونما ہوئی؟
10. آزاد تجارت (*Laissez Faire*) سے کیا مراد ہے؟

7.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پہلی عالمی جنگ کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے بحران پر نوٹ لکھیئے۔
2. عالمی معیشت پر پہلی عالمی جنگ کے اثرات کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔
3. وال اسٹریٹ کا بحران کیا ہے؟ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالئے۔

4. بینکنگ نظام کی ناکامی نے عظیم کساد بازاری کو کس طرح پروان چڑھایا۔ نوٹ لکھیے۔
5. تیکنیکی ترقی اور کساد بازاری کے تعلق سے ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

7.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. عظیم کساد بازاری کے وجوہات کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔
2. پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد رونما ہونے والی معاشی حالات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. عالمی کساد بازاری کے نتائج پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

7.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alford, B.W.E., *Depression and Recovery? British Economic Growth, 1918–1939*, London,1984.
2. Galbraith, John Kenneth, *The Great Crash of 1929–1997*.
3. Ketelbey, C.D.M., *A History of Modern Europe from 1789*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1929).
4. Kindleberger, Charles P., *The World in Depression,1929–1939*, London, 1973.
5. Lowe, Norman, *Mastering the Modern World History*, Palgrave Macmillan, 1982.
6. Nester, William R., *Globalization: A Short History of the Modern World*, Palgrave, Macmillan, 2010.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Phukan, Meenaxi, *Rise of the Modern West*: *Social and Economic History of Early Modern Europe*, Macmillan, New Delhi, 2012 (first pub. in 1998).
9. Piketty, Thomas, *Capital and Ideology*, The Belknap Press of Harvard University Press, Cambridge, 2020.
10. Rothermund, Dietmar, *The Worldwide Depression, 1929–1939*, New Delhi.
11. Rothermund, Dietmar, *The Global Impact of the Great Depression, 1929–1939*, London,1996.

اکائی 8۔ جرمنی میں نازیت اور اٹلی میں فسطائیت

(Nazism in Germany, and Fascism in Italy)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید
8.1 مقاصد
8.2 پہلی عالمی جنگ کے بعد جرمنی اور نازیت
8.3 جرمنی میں نازیت کی کامیابی کے اسباب
8.3.1 ہٹلر کی پالیسی
8.3.2 ورسائی معاہدے کی تردید اور مجلس اقوام سے استعفیٰ
8.3.3 1934 میں پولینڈ کے ساتھ معاہدہ، اور 1935 میں سار علاقے پر جرمنی کا قبضہ
8.3.4 آسٹریا کے ساتھ الحاق کی کوشش
8.3.5 جرمنی کی از سر نو اسلحہ بندی
8.3.6 1935 میں اینگلو جرمن بحری معاہدہ، اور رائن لینڈ کی دوبارہ عسکر کاری
8.3.7 روم- برلن، اور برلن-ٹوکیو معاہدہ
8.3.8 آسٹریا کے ساتھ الحاق
8.3.9 چیکوسلواکیہ کا بحران اور میونخ معاہدہ
8.3.10 چیکوسلواکیہ اور میمل پر قبضہ
8.3.11 1939 کا روس- جرمن معاہدہ
8.3.12 پولینڈ پر حملہ اور دوسری عالمی جنگ کا آغاز
8.4 فسطائیت اور اٹلی
8.4.1 نظریہ فسطائیت
8.4.2 فسطائیت کے عروج کے اسباب

8.4.3 مسولینی کی آمریت کا قیام
8.4.4 مسولینی اور فسطائی پارٹی کا عروج
8.4.5 فسطائیت کا پروپیگنڈہ
8.4.6 مسولینی کی اقتصادی پالیسی
8.4.7 مسولینی اور پوپ کے درمیان تعلقات
8.4.8 مسولینی کی خارجہ پالیسی
8.4.9 نسلی پالیسی
8.4.10 اطالوی فسطائیت کی تشخیص
8.5 اکتسابی نتائج
8.6 کلیدی الفاظ
8.7 نمونہ امتحانی سوالات
8.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید (Introduction)

جرمنی میں نازیت اور اٹلی میں فسطائیت دو جنگوں کے درمیانی دور میں ابھر کر دوسری عالمی جنگ کا محرک ثابت ہوئیں۔ 1933 میں، نازیت (Nazism) جرمنی میں برسراقتدار آگئی۔ 'نازی' (Nazi) ایک اصطلاح ہے جو ایڈولف ہٹلر (Adolf Hitler) کی نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی کے ارکان سے وابستہ ہے۔ اس دور میں لفظ نازی کسی ایسے شخص کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو جنون میں کسی سرگرم عمل پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی دوران 1922 میں، اٹلی میں بھی ایک فسطائی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ فسطائیت (Fascism) کی اصطلاح اطالوی لفظ فسطائی (*fascio*) سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے 'گٹھری'۔ علامتی طور پر، اس سے مراد سلاخوں یا چھڑیوں کی گٹھری ہے۔ 1919 میں، اس تحریک کی بنیاد بینیٹو مسولینی (Benito Mussolini) نے ڈالی تھی۔ پہلی عالمی جنگ میں جرمنی کی شکست نے اہم پیش رفتوں کا مشاہدہ کیا جیسا کہ ورسائی معاہدہ؛ فرانس اور جرمنی کے درمیان پرانی دشمنی کا تسلسل؛ روس میں پہلی اشتراکی (Socialist) ریاست کا ظہور؛ اور 1930 کی دہائی میں عظیم مالی بحران۔ دوسری طرف، 1919 میں اٹلی سیاسی طور پر مایوس اور اقتصادی طور پر بکھر چکا تھا۔ اٹلی پہلی عالمی جنگ میں ان امیدوں اور عزائم کے ساتھ شامل ہوا تھا کہ جنگ کے بعد اسے اراضی کی شکل میں انعامات حاصل ہو سکتے ہیں۔ تاہم، اس جنگ نے اٹلی کو بڑے بھرم، مایوسی اور بے روزگاری کا شکار بنا دیا۔ 1919 کا امن معاہدہ،

جو کہ ورسائی معاہدے کے نام سے جانا جاتا ہے، بھی اٹلی کے لیے غیر اطمینان بخش ثابت ہوا۔ یہ پیش رفتیں جرمنی میں ناتسیت اور اٹلی میں فسطائیت کے عروج کے لیے براہ راست یا بالواسطہ طور پر ذمہ دار تھیں؛ اور 1939 میں دوسری عالمی جنگ کے آغاز کے لیے ناتسیت اور فسطائیت بنیادی طور پر ذمہ دار تھے۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد

ہم ناتسیت اور فسطائیت سے متعلق مندرجہ ذیل پہلوؤں کے بارے میں جان جائیں گے:

- ناتسیت اور فسطائیت کے ظہور کی وجوہات۔
- ناتسیت اور فسطائیت کے نظریے کی بنیادی خصوصیات۔
- یورپ میں ناتسیت اور فسطائیت کے عروج اور بین الاقوامی تعلقات پر ان کے اثرات۔
- ناتسیت اور فسطائیت کے عروج کے اسباب۔
- ناتسیت اور فسطائیت کی خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی نقطہ نظر۔

8.2 پہلی عالمی جنگ کے بعد جرمنی اور ناتسیت (Germany and Nazism after the First World War)

1918 میں، جرمنی کی شکست نے شہنشاہ ولیم ثانی کو تخت سے دستبردار اور ہالینڈ فرار ہونے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد جرمنی میں اشتراکی رہنما فریڈرک ایبارٹ کی قیادت میں ایک عبوری حکومت قائم ہوئی۔ 11 نومبر 1918 کو ان کے دور حکومت میں جرمنی نے جنگ بندی پر دستخط کیے اور اس طرح پہلی عالمی جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ 19 جنوری 1919 کو جرمنی میں ہونے والے انتخابات میں کوئی بھی جماعت مطلق اکثریت حاصل کرنے میں ناکام ہوئی۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹی، جس نے 421 میں سے 163 نشستیں حاصل کی، معمولی اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اس نے سینٹر پارٹی اور ڈیموکریٹک پارٹی کی مدد سے ویمر میں حکومت قائم کی۔ 14 اگست 1919 کو جرمنی میں ویمر دستور کے نام سے ایک نیا آئین نافذ کیا گیا۔ ابتدا سے ہی ویمر جمہوریہ کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً بارہ سال تک ویمر جمہوریہ کی اشتراکی حکومت نے ملک کے سیاسی اور معاشی مسائل کے خلاف سخت جدوجہد کی۔ اس دوران، جرمن عوام غیر منظم، دکھی اور مایوس تھا۔ انہیں ایسی پارلیمانی حکومت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا جس کا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ، ورسائی معاہدے میں بتایا گیا تھا کہ جرمنی کو جنگی نقصانات کی بھاری رقم ادا کرنا ہوگی۔ لیکن ایسا کرنا جرمنی کی استطاعت سے باہر تھا، اور فرانس نے بار بار اس کی ادائیگی پر اصرار کیا۔ اس وجہ سے جرمنی میں مہنگائی بڑھ گئی، اور ویمر جمہوریہ کو شدید اقتصادی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ مزید یہ کہ جرمن عوام ورسائی معاہدے پر دستخط کرتے وقت ہونے والی توہین اور ذلت سے باخبر تھا۔ اس معاہدے کے بعد بھی بین الاقوامی سیاست میں جرمنی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ لوکارنو معاہدے (1925) نے اس کی بین الاقوامی حیثیت میں اضافہ کیا اور اسے مجلس اقوام (1926) کے رکن کے طور پر

قبول کیا گیا، لیکن اس سے جرمنی کی مشکلات ختم نہ ہوئیں۔ عظیم مالی بحران (1929) نے اس کی معیشت کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ ایسے نامساعد حالات میں جرمنی کے عوام کو ایک ایسا رہنما چاہیے تھا جو جرمنی میں ماضی کی شان بحال کر سکے۔

1889 میں، ہٹلر آسٹریا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ 1919 میں، انہوں نے اینٹون ڈریکسلر کے زیر اہتمام جرمن ورکرز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ بہت جلد ہٹلر اس گروہ کا ایک بااثر رکن بن گیا، اور لوگوں کو یقین دلایا کہ جرمنی جنگ میں نہیں ہارا بلکہ ورسائی معاہدے میں اس کی تذلیل کی گئی۔ اس گروہ نے جرمنوں میں ایک نئی روح پھونک دی، اور نازی تحریک کو ایک سر گرم اور انقلابی گروہ میں بدل دیا۔ ہٹلر نے اس بات پر زور دیا کہ ہم اپنی نسل، اپنے قوم کی سلامتی، اپنے بچوں کی پرورش، اور وطن کی آزادی کے لئے لڑنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جرمنوں کے جذبات سے اپیل کی کہ وہ 'جرمن ریک' (The German Empire) میں تمام جرمنوں کو شامل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں فرانس سے شدید نفرت تھی جسے وہ جرمن قوم کا ازلی اور اصلی دشمن سمجھتے تھے۔ انہوں نے ورسائی معاہدے کی مذمت کی اور اس پر نظرِ ثانی کی وکالت کی۔ انہوں نے فاتحین سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور بین الاقوامی سیاسی نظام میں داخل ہوا۔

1920 میں جرمن ورکرز پارٹی کا نام بدل کر نیشنل سوشلسٹ پارٹی (نازی پارٹی) رکھ دیا گیا۔ ہٹلر نے ڈریکسلر کو پارٹی سے نکال دیا، اور اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ نیشنل سوشلسٹ پارٹی کے پروگرام میں پچیس نکات تھے جن میں سے درج ذیل نمایاں تھے:

- ورسائی معاہدے کو منسوخ کر دیا جائے۔
- تمام علاقوں پر مشتمل ایک جرمن ریاست قائم کی جائے، جہاں جرمن زبان بولی جاتی ہے۔
- 1919 میں جرمنی سے چھینی گئی تمام سابقہ نوآبادیوں کو بحال کر دیا جائے۔
- جرمنی کی فوجی صلاحیت کو محدود کرنے والی تمام پابندیوں کو واپس لے لیا جائے۔
- غیر ملکیوں (یہودیوں) کو جرمنی کی شہریت سے محروم کر کے ملک بدر کر دیا جائے۔
- اشتراکیت، آزاد خیالی، اور جمہوری طرزِ حکومت جرمنی کی فلاح و بہبود کے لیے مضر ہیں، اس لیے ان کی مکمل مخالفت کرنی چاہیے۔

نیشنل سوشلسٹ پارٹی کا اپنا خاص نشان 'سواستیکا'، قومی ترانہ، اور نعرہ تھا۔ اس نے اپنے مقاصد کی وضاحت کے لیے ریلیاں نکالیں۔ ہٹلر کے پاس اپنی رضاکار فوج تھی جسے اس نے براؤن شرٹس ('Brown Shirts') کا نام دیا تھا۔ دوسری جماعتوں کے اجلاسوں میں خلل ڈال کر اس نے اپنی پارٹی کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ 1923 میں، ہٹلر نے جرمن جمہوریہ کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش کی۔ اس سلسلے میں انہیں پانچ سال قید کی سخت سزا سنائی گئی، لیکن 1924 میں رہا کر دیا گیا۔ اس نے قید کے دوران اپنی سوانح عمری 'میری جدوجہد' (*Mein Kampf*) لکھی۔ اس کتاب میں اس نے نازی پارٹی کی ابتدا، ارتقا اور مستقبل کے پروگراموں کو بیان کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ تمام جرمن بولنے والوں کو جرمن سلطنت کا حصہ بننا چاہیے۔ ذلت آمیز ورسائی معاہدے اور جرمنی پر عائد کیے گئے تخفیفِ اسلحہ سے ہٹلر نے جرمنوں کو ویمر جمہوریہ کے خلاف عداوت بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس نے فرانس کو جرمنی کا دائمی دشمن قرار دیا۔ انہیں تخفیفِ اسلحہ پر

کوئی یقین نہیں تھا،اوران کا خیال تھا کہ جرمنی عسکریت کے ذریعے ہی اپنے مقاصد حاصل کر سکتا ہے۔ تمام جرمن بولنے والوں کے لیے ایک ملک سے ہٹلر کا مطلب یہ تھا کہ سوویت روس، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، وغیرہ کے مخصوص علاقے جرمن سلطنت کا حصہ بن جائیں۔اس طرح، مین کامپف میں ہٹلر نے پہلے ہی ان ممالک کی طرف جارحیت کا اشارہ کیا تھا۔

1925 سے 1929 تک ہٹلر اپنے نظریات کے مطابق نازی پارٹی کی تنظیم نو اور توسیع میں مصروف رہا۔اس نے ان تمام ارکان کو پارٹی سے نکال دیا جنھوں نے ان کی مخالفت کی۔ اس نے ایک مضبوط فوجی قوت کو منظم کیا۔اس فوج کی پہلی شاخ 'Sturine Abteilang' کے نام سے جانی جاتی تھی جو جارحانہ مسلح رضاکاروں پر مشتمل تھی۔اس شاخ کے ارکان بھورے رنگ کی قمیضیں پہنتے تھے جن پر سواستیکا کا نشان ہوتا تھا۔اس کی دوسری شاخ 'Schulz Staffen' کے نام سے جانی جاتی تھی، جو سیاہ رنگ کی قمیضیں پہنتے تھے جن پر انسانی کھوپڑی کا نشان ہوتا تھا۔ ہٹلر کے پُرجوش پیروکار گوئبلز کو اس فوجی قوت کے دونوں بازوؤں کا سربراہ بنایا گیا تھا۔1926 کے آخر تک نازی پارٹی کی شاخیں پورے ملک میں قائم ہو چکی تھیں۔1930 کے انتخابات میں پارٹی نے ریشاخ کی 576 نشستوں میں سے 107 نشستیں حاصل کی۔ان انتخابات میں پارٹی کی کامیابی نے ہٹلر کو جمہوریہ کی صدارت کے لیے لڑنے کی ترغیب دی لیکن وہ ہندنبرگ کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔1932 کے انتخابات میں نازی پارٹی نے ریشاخ کی 608 نشستوں میں سے 230 نشستیں حاصل کی۔ اگرچہ اسے مطلق اکثریت نہیں ملی لیکن اس کے پاس دوسری جماعتوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ نشستیں تھیں۔

صدر ہنڈن برگ نے ہچکچاتے ہوئے ہٹلر کو 'رائش ٹیگ' میں نازی پارٹی کے رہنما کے طور پر حکومت کا سربراہ (چانسلر) بننے کی دعوت دی جس میں مختلف جماعتوں کے ارکان شامل تھے۔انتخابات کے اختتام پر ریشاخ کی عمارت میں پُراسرار آگ لگ گئی۔ ہٹلر نے اس المناک واقعے کا ذمہ دار کمیونسٹوں کو ٹھہرایا۔اس لیے، ہٹلر نے کمیونسٹوں، سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنماؤں اور یہودیوں کو گرفتار کیا۔ اس نے جلد ہی اقتدار پر قبضہ کر لیا،اور کمیونسٹ پارٹی اور دیگر سیاسی تنظیموں کو غیر قانونی قرار دیا اور ان پر پابندی لگادی۔اس طرح ہٹلر اور قوم پرستوں نے جرمنی میں دہشت کا راج قائم کیا۔جب 1934 میں صدر ہندنبرگ کا انتقال ہوا تو ہٹلر نے صدر کے عہدے کو چانسلر کے ساتھ جوڑ دیا اور جرمنی کا فوہرر (لیڈر) بن گیا۔

8.3 جرمنی میں نازیت کی کامیابی کے اسباب (Causes for the Success of Nazism in Germany)

جرمنی میں نازیت کے عروج کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

1. ورسائی معاہدے کو تمام جرمنوں نے جرمنی کے لیے سخت اور ذلت آمیز سمجھ لیا تھا۔اس لئے، جرمن اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔ وہ ویمر جمہوریہ سے مطمئن نہیں تھے اس لیے وہ ایک ایسے رہنما کی تلاش میں تھے جو جرمنی کا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکے۔ ہٹلر نے اپنی تمام تقاریر میں جرمنی کو مضبوط کرنے کی بات کی تاکہ وہ ورسائی معاہدے کی شرائط کو مسترد کر سکے۔ لیکن اگر ورسائی معاہدہ ہٹلر کے ظہور کا ذمہ دار ہوتا، تو اس معاہدے کے تین یا چار سال کے اندر ہی ہٹلر کا ظہور ہونا چاہئے

تھا۔ لیکن نانسیت اس کے کئی سال بعد وجود میں آ گیا، اور اس وقت تک معاہدے کے کئی سخت شرائط وضوابط میں ترمیم کی جا چکی تھی۔ 1926 میں اسے مجلس اقوام کا رکن بنادیا گیا تھا۔ ایسے حالات میں ورسائی معاہدے کو ہٹلر کے ظہور کے لیے مکمل طور پر ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ صرف ایک ذیلی وجہ تھا جس سے ہوئی ذلت کے بارے میں ہٹلر بار بار یاد دلاتا تھا۔

2. جرمنی کے لوگوں کے ذہنوں میں نظم وضبط اور ایک طاقتور رہنما کی پیروی کی روایت موجود تھی۔
3. اگرچہ یہودی آبادی جرمنی کی آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا، لیکن اس نے جرمنی کے فن، سیاست، کاروبار اور تجارت پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ اس نے عوامی زندگی کے کئی شعبوں میں نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔ پہلی عالمگیر جنگ میں جرمنی کی شکست کے بعد جرمن عوام نے محسوس کیا کہ وہ جنگ کے لئے ذمہ دار ہیں، اور ہٹلر نے ایسے جذبات کا فائدہ اٹھایا۔ اس نے پہلے ہی سے ایک یہود مخالف پروگرام شروع کیا تھا۔ اس نے لوگوں سے یہودیوں کو جرمنی سے نکالنے اور ان کی فیکٹریاں بے روزگار افراد کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔
4. روس میں لینن اور سٹالن کے تحت کمیونسٹ حکومت کی کامیابی، اور پہلی اور دوسری انٹرنیشنل کے قیام سے جرمنی میں کمیونزم کے پھیلاؤ کے بارے میں خوف پیدا ہوا۔ 1930 اور 1932 کے انتخابات میں، جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی نے ریشاخ کے انتخابات میں بہت مقبولیت حاصل کی تھی۔ لیکن ہٹلر نے دنیا میں کمیونزم کے پھیلاؤ کو ایک خطرے کے طور پر پیش کیا۔
5. جرمنی کے لوگ جمہوریت کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کی پرورش فوجی روایات میں ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ریشاخ میں زیادہ وقت فضول بحثوں اور التوا کی تحریکوں میں ضائع ہوتا ہے۔ انتخابات میں متعدد پارٹیوں کے درمیان جھگڑوں نے بھی انہیں پارلیمانی جمہوریت کے خلاف اکسایا۔ اس کے علاوہ، اٹلی میں مسولینی کے عروج اور کامیابی نے جرمنی میں آمریت کی حوصلہ افزائی کی۔
6. 1929 کے عظیم مالی بحران نے جرمنی کی اقتصادی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہٹلر نے ایسے حالات کے لئے حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس سے اس نے متوسط طبقے اور لاکھوں کی تعداد میں بے روزگار افراد کی حمایت حاصل کی۔
7. نازی پارٹی کے پروگرام میں وہ تمام چیزیں شامل تھیں جو ورسائی معاہدے کے بعد جرمنی کے لوگ حاصل کرنا چاہتے تھے جیسے ورسائی معاہدے کی ترمیم، جرمنی کے ہاتھوں کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی، سابقہ شان وشوکت کی بحالی، کمیونزم کی حوصلہ شکنی، اور مزدوروں کو ان کی حالتِ زار سے نجات دلانا، وغیرہ۔ اس طرح، نازی پارٹی کا پرکشش پروگرام بھی اس کے عروج کا ایک سبب بن گیا۔
8. ہٹلر میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جس کی ایک معروف ومقبول رہنما کو ضرورت تھی۔ وہ ایک ہوشیار سیاست دان، ایک طاقتور مقرر اور ایک بہادر سپاہی تھے۔ اس نے جرمنی کی سیاسی حالات کو اپنے مفادات کے مطابق بنادیا۔ وہ ایک قابل منتظم تھے۔ اس نے گوئبلز کے تحت اپنی پارٹی کے حق میں ایک منظم پروپیگنڈا کیا۔

8.3.1 ہٹلر کی پالیسی (Policy of Hitler)

نا تسیت فریڈرک نطشے، ہیگل اور روزنبرگ کی تعلیمات سے بہت متاثر تھا۔ ہیگل نے انتہائی عسکریت پسندی اور قوم پرستی کے نظریات پیش کیے، اور فریڈرک نطشے کے لاوجودیت ('Nihilism') نے اخلاقیات اور وقار کے مغربی نظریات کو مسترد کر دیا۔ اس کے علاوہ، سوشل ڈارونزم نے نظریہ نا تسیت کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ نا تسیت نے سوشل ڈارونزم کو نسلی درجہ بندی کے ساتھ ملا کر جرمنوں کو آریائی نسل کی ایک شاخ کے طور پر پیش کیا۔ اس طرح، آریائی نسل کی بقا اور پاکیزگی کے تحفظ کے لیے سوشل ڈارونسٹ نظریہ پہلی عالمی جنگ کے بعد نازی پارٹی کا بنیادی عنصر بن گیا، اور نسل کشی کے لیے سائنسی اور اخلاقی جواز فراہم کیا۔

ہٹلر کی پالیسی کے اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

- ہٹلر نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ساری اپوزیشن کو کچلنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کہا کہ جرمنی میں صرف ایک سیاسی جماعت ہے، اور وہ نیشنلسٹ سوشلسٹ ورکرز پارٹی ہے۔ اس نے کمیونسٹ اور اشتراکی تنظیموں پر پابندیاں عائد کی، اور ان کے دفاتر پر مہر لگادی۔ ریشاخ کے اجلاس صرف فوہرر کی مدح سرائی کے لیے ہوا کرتے تھے۔ ہٹلر کی مرضی پارٹی اور قوم کی مرضی ہوتی تھی۔ اس نے ملک کی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی پہلوؤں کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ گیسٹاپو یا جرمن خفیہ پولیس سروس نے فوہرر کی تمام مخالفتوں کو مٹانے میں اہم کردار ادا کیا۔
- جرمنی نے بڑی مقدار میں بھاری اسلحہ بالخصوص بکتر بند گاڑیاں، ٹینک اور ہوائی جہاز بنانے شروع کیے۔ 1935 میں، جرمنی میں لازمی فوجی تربیت متعارف کرائی گئی، اور ہٹلر نے واضح طور پر امن اور اسلحہ سے متعلق معاہدے کی دفعات کو مسترد کر دیا۔ اس طرح، نازی حکومت اپنی رسوائی کے داغ دھونے اور ورسائی معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے لیے جنگ کے راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔
- 1934 میں اقتدار سنبھالنے کے بعد، ہٹلر نے معیشت پر قابو پانے کے لیے چار سالہ منصوبہ تیار کیا۔ اس نے صنعتوں کو کرپس ('Krupps') جیسی کارپوریشنوں کے تحت مرکزیت بخشنے کی کوشش کی۔ 1935 کے بعد بڑے پیمانے پر دوبارہ اسلحہ سازی کی وجہ سے جرمنی کی صنعت کاری میں مزید ترقی ہوئی، جس نے جرمنوں کو روزگار کے کافی مواقع فراہم کیے۔ اس اقتصادی تعمیرِ نو کے عمل میں تقریباً تمام کاروباری حصے داروں نے نازی پارٹی کی حمایت کی۔
- نا تسیت کی توسیع پسندانہ پالیسی نے دوسرے ممالک کو بھی متاثر کیا۔ اس نے مساوات اور انسان دوستی کے اصولوں کا انکار کر کے یہودیوں پر ظلم کیا۔ ہٹلر کی توسیع پسندانہ فوجی پالیسی کے نتیجے میں سار، رائن لینڈ، آسٹریا، چیکوسلواکیہ، وغیرہ جرمنی کے قبضے میں آ گئے۔
- ہٹلر نے سول سروسز سے متعلق Restoration of Civil Services Law کے نام سے ایک قانون پاس کیا۔ اس قانون میں یہ بتایا گیا کہ اگر غیر آریائی (یعنی یہودی) اور دیگر اس حکومت کی وفاداری سے خدمت نہیں کرنا چاہتے ہیں تو انہیں

مختلف سرکاری خدمات سے نکال دیا جاسکتا ہے۔

- پریس، ریڈیو، سنیما، اسکولوں اور یونیورسٹیوں پر سخت کنٹرول قائم کیا گیا۔ خیالات کے اظہار اور کسی بھی معاشی یا سماجی سرگرمی کی آزادی ممنوع تھی۔ کسی بھی شخص کو کسی بھی وقت گرفتار کیا جاسکتا تھا اور بغیر کسی مقدمے کے اسے غیر معینہ مدت کے لیے قید کیا جاسکتا تھا۔ ارنسٹ روچن، براؤن شرٹس کے چیف، نے کہا تھا کہ نازی پارٹی کو اشتراکی پروگرام عمل میں لانا چاہئے، لیکن اس وقت ہٹلر کو بڑے سرمایہ داروں کی طرف سے حمایت مل رہی تھی۔ اس لیے، اس نے روچن کو گرفتار کرکے قتل کردیا۔ اس طرح، پارٹی کے اندر مخالفین کو بے رحمی سے دبانے سے عوام میں خوف وہراس پیدا ہوا۔
- ہٹلر جرمنوں کو خالص آریائی سمجھتا تھا، اس لیے اس نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ صرف خالص آریائی ہی جرمنی میں آباد ہوں گے۔ 1935 میں، اس نے تمام یہودیوں کو سرکاری اور نیم سرکاری عہدوں سے ہٹادیا۔ ستمبر 1935 میں اس نے نیورمبرگ قوانین پاس کیے۔ ان قوانین کے مطابق، صرف جرمن افراد کو جرمن شہری تصور کیا گیا، اور تحفظ بخشا گیا۔
- 1933 میں، ہٹلر نے پوپ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ اس کے مطابق پوپ نے تمام پادریوں کو سیاسی سرگرمیوں سے دور رکھنے پر اتفاق کیا، اور ہٹلر نے کیتھولک چرچ کو دوسرے مذہبی فرقوں کے ساتھ برابر شہری حقوق دینے کا وعدہ کیا۔
- بچوں اور نوجوانوں کو نازیت کے اصولوں سے آشنا کرنے کے لیے نازی حکومت نے نصاب پر نظر ثانی کی۔ اسکولوں اور کالجوں میں طلباء کو انتہائی قوم پرستی، نسل کی برتری، فوجی نظم وضبط، فرمانبرداری اور حفظانِ صحت کے بارے میں سکھایا جاتا تھا۔ اس طرح، ہر جرمن نوجوان کا آئیڈیل ایک نسل، ایک زبان، ایک ثقافت اور ایک رہنما ہونا چاہیے۔
- 1929 کے عظیم مالی بحران نے جرمن معیشت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مہنگائی اور بے روزگاری نے عوام کی زندگی کو خستہ کردیا تھا۔ اس نے صنعتکاروں کو اعتماد میں لیا، اور مزدوروں کے کام کے اوقات کم کردیے تاکہ روزگار کے زیادہ مواقع فراہم کیے جاسکے۔ ان اقدامات کے نتیجے میں لوگوں کو روزگار مل گیا، صنعتی پیداوار دوگنی ہوگئی اور غیر ملکی تجارت میں بھی ترقی ہوئی۔

8.3.2 ورسائی معاہدے کی تردید اور مجلس اقوام سے استعفیٰ

(Repudiation of the Treaty of Versailles and Resignation from the League of Nations)

ہٹلر کے مطابق ورسائی معاہدہ جرمنی کی عزت پر ایک سیاہ دھبہ تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ ہر جرمن کو اس معاہدے اور اس کے تباہ کن اثرات سے نفرت کرنی چاہیے۔ اس لیے، اس نے رفتہ رفتہ معاہدے کی شقوں سے انکار کیا۔ اس کے علاوہ، ہٹلر مشرق میں بھی توسیع کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے برطانیہ اور اٹلی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے، اور فرانس کو بقیہ طاقتوں سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔

17 مئی 1933 کو ہٹلر نے اعلان کیا کہ آج تک جرمنی نے پیرس امن معاہدے کو مکمل طور پر انجام دیا ہے، اور اس لیے اسے مساوات کا مطالبہ کرنے کا اخلاقی حق حاصل ہے۔ وہ اس صورت میں جرمنی کو غیر مسلح کرنے کے لیے تیار تھا کہ اگر دوسرے ممالک بھی اس

پر عمل پیرا ہوتے۔ اس دوران اس نے خفیہ طور پر بڑے پیمانے پر اسلحہ اور گولہ بارود تیار کرنے اور جرمنی کی بڑی فوجی طاقت کو بڑھانے کا حکم دیا۔ فرانس ہٹلر کی سرگرمیوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے، اس نے اپنی فوجی طاقت کو محدود کرنے سے انکار کر دیا۔ جرمنی کو اسلحہ سازی کے میدان میں برابری کے حقوق حاصل کرنے پر برطانیہ، امریکہ اور اٹلی نے فرانس کے موقف کی حمایت کی۔ اس وجہ سے 14 اکتوبر 1933 کو ہٹلر نے تخفیفِ اسلحہ کانفرنس کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کا اعلان کیا اور مجلسِ اقوام سے استعفیٰ دے دیا۔

8.3.3 1934 میں پولینڈ کے ساتھ معاہدہ، اور 1935 میں سار علاقے پر جرمنی کا قبضہ

(Treaty with Poland in 1934, and the Occupation of Saar in 1935)

ورسائی معاہدے کے مطابق، ڈینزنگ بندرگاہ، سائلیسیا، پوسن اور جرمنی کے کچھ دوسرے علاقے پولینڈ کو دے دیے گئے تھے۔ ہٹلر کی ترقی پولینڈ کے لیے پریشانی کا باعث تھی کیونکہ ہٹلر نے مذکورہ بالا تمام علاقوں کی واپسی کی وکالت کی تھی۔ لیکن طاقتور ملکوں کے شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لیے ہٹلر نے جنوری 1934 میں پولینڈ کے ساتھ دس سال کے لیے عدم جارحیت کا معاہدہ کیا۔ اس معاہدے نے جرمنی کے مشرقی حصے میں ممکنہ خدشات کو کم کر دیا۔ اس کے علاوہ، اس معاہدے کی بنیاد پر ہٹلر کچھ عرصے تک یہ پروپیگنڈہ کرتا رہا کہ وہ واقعی امن پسند پالیسی پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ یہ معاہدہ ہٹلر کی خارجہ پالیسی کی پہلی قابلِ ذکر کامیابی تھی جس نے مستقبل میں اس کی مزید کامیابیوں کی راہ ہموار کی۔ جنوری 1935 میں، ورسائی معاہدے کی ایک شق کے مطابق سار (Saar) میں مجلسِ اقوام کے زیرِ اہتمام ایک ریفرنڈم کرایا گیا تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس علاقے کے لوگ کس ملک (فرانس یا جرمنی) کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ سار کے عوام نے بھاری اکثریت سے جرمنی کے حق میں ووٹ دیا۔ سار علاقے کو جرمنی میں ضم کرنے کے بعد ہٹلر نے اعلان کیا کہ جرمنی اپنی مغربی سرحدوں پر مزید علاقے حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتا ہے۔ دراصل، یہ اعلان اس نے مغربی طاقتوں کے خوف کو دور کرنے کے لیے کیا تھا۔

8.3.4 آسٹریا پر قبضے کی کوشش (Attempt to Annex Austria)

1919 میں، آسٹریا میں ہیپسبرگ حکومت کی جگہ ایک پارلیمانی جمہوریہ قائم کی گئی۔ 1929 کے عظیم مالی بحران کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہٹلر نے آسٹریا میں نازی پارٹی کی ایک شاخ قائم کی۔ ان کا ارادہ اینجل برٹ ڈولفس کے تحت آسٹریا کی جمہوریہ حکومت کو گرانا تھا۔ خطرے سے دوچار ہو کر ڈولفس نے آئین کو معطل کر دیا اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ جون 1933 میں، اس نے نازی پارٹی کو غیر قانونی قرار دیا۔ جوابی کارروائی میں جرمنی کی نازی حکومت نے آسٹریا جانے والے جرمن سیاحوں پر عائد ممنوعہ ویزا کو ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت مسولینی بھی آسٹریا پر اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے، مسولینی نے ڈولفس کی حمایت کی۔ 25 جولائی 1934 کو آسٹریا کے نازی رہنماؤں نے چانسلر کے دفتر پر اچانک قبضہ کر لیا، اور ڈولفس کو بھی قتل کر دیا۔ لیکن اس بغاوت کو آسٹریا کی حکومت نے دبا دیا۔ چونکہ اس وقت ہٹلر اٹلی کے خلاف لڑنے کے لئے تیار نہیں تھا، اس لیے اس نے آسٹریا میں نازیوں کی اس کوشش سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ اس واقعے سے روس ہٹلر کے منصوبوں سے خوفزدہ ہو گیا، اور وہ مجلسِ اقوام کا رکن بن گیا۔

8.3.5 جرمنی کی از سرنو اسلحہ بندی (Rearmament of Germany)

مارچ 1935 میں ہٹلر نے اعلان کیا کہ اتحادی طاقتوں نے تخفیفِ اسلحہ کی سمت میں ٹھوس اقدامات نہیں اٹھائے ہیں۔ اس لیے ورسائی معاہدے میں تخفیفِ اسلحہ سے متعلق شقیں قانونی اور اخلاقی طور پر جرمنی پر عائد نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس وقت فرانس نے اپنے نوجوانوں کے لیے لازمی فوجی تربیت متعارف کی، اور برطانیہ نے اپنی فضائیہ طاقت کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ لہذا، 16 مارچ 1935 کو ہٹلر نے جرمنی کو دوبارہ مسلح کرنے کا اعلان کیا۔ اگرچہ فرانس، اٹلی اور برطانیہ نے اس فیصلے کی مخالفت کی لیکن وہ اس فیصلے کے خلاف کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھا سکے۔

8.3.6 1935 میں اینگلو جرمن بحری معاہدہ، اور رائن لینڈ کی دوبارہ عسکر کاری

(Anglo-German Treaty and Remilitarisation of Rhineland in 1935)

جرمنی کو دوبارہ مسلح کرنے کے اعلان نے فرانس اور روس میں بے چینی پیدا کر دی۔ چنانچہ ان دونوں ممالک نے باہمی تعاون کا معاہدہ کیا۔ لیکن ہٹلر اچھی طرح جانتا تھا کہ برطانیہ فرانس کی بڑھوتری کو پسند نہیں کرتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ برطانیہ جرمن فوج اور فضائیہ کی مضبوطی کو اپنی سلامتی کے لیے خطرہ نہیں سمجھتا ہے۔ لہذا، 25 مارچ 1935 کو اس نے برطانیہ کے ساتھ ایک بحری معاہدے کی تجویز پیش کی۔ جون 1935 میں، دونوں ممالک کے درمیان ایک معاہدے کے مطابق، برطانیہ نے جرمنی کو ہر قسم کے جنگی جہاز بنانے کی اجازت دی۔ جرمنی کو آبدوز کشتیاں بنانے کی بھی اجازت دی گئی۔ اس طرح، برطانیہ نے جرمنی کی بحری طاقت کے حوالے سے ورسائی معاہدے کی واضح خلاف ورزی کی۔ برطانیہ کی اس دوہری پالیسی نے فرانس اور اٹلی کو ناراض کر دیا، اور اس طرح سٹریسا (Stressa) میں قائم کیا گیا محاذ ٹوٹ گیا۔

ورسائی معاہدے کے مطابق، جرمنی کو رائن لینڈ میں مسلح افواج رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اکتوبر 1935 میں، ابیسینیا پر اٹلی کے حملے نے یورپ میں ایک کشیدہ صورتحال پیدا کر دی۔ برطانیہ اور فرانس نے اٹلی کے اس عمل کی شدید مخالفت کی۔ ہٹلر نے اس موقعے کا فائدہ اٹھایا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اٹلی ہار گیا تو وہ آسٹریا پر آسانی سے حملہ کر سکتا ہے، اور اگر اتحادی طاقتیں ناکام ہو جاتی ہے تو وہ کوئی ٹھوس کارروائی کرنے کے لیے آزاد ہے۔ ایسے حالات سے حوصلہ پا کر اس نے رائن لینڈ کے علاقے میں اپنی فوج بھیج دی۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ فرانکو-روس معاہدے نے لوکارنو صلح نامے کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے، وہ لوکارنو میں طے شدہ شرائط پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہے۔

8.3.7 روم-برلن، اور برلن-ٹوکیو معاہدہ (Rome-Berlin and the Berlin-Tokyo Axis)

1936 میں، ہٹلر نے روم اور برلن معاہدے کے ذریعے جرمنی کو مستحکم کیا۔ مسولینی نے کہا کہ یہ معاہدہ روم اور برلن کے درمیان کھینچی گئی ایک لکیر ہے، جس کے ارد گرد تمام امن پسند یورپی ممالک گھوم سکتے ہیں۔ 1937 میں، جرمنی نے جاپان اور اٹلی کے ساتھ کمیونزم کے خلاف سمجھوتے پر دستخط کیے، جس میں تینوں نے بولشوزم (Bolshevism) کے خلاف شانہ بشانہ کھڑا ہونے کا عہد

کیا۔ معاہدے کی شرائط درج ذیل ہیں:

- باہمی مفادات کے تمام معاملات میں تعاون۔
- کمیونزم کے خلاف یورپی ثقافت کا تحفظ۔
- دریائے ڈینیوب کے طاس میں اقتصادی تعاون۔
- سپین کی نوآبادیاتی اور علاقائی سالمیت کا تحفظ۔

8.3.8 آسٹریا کے ساتھ الحاق (Annexation of Austria)

اسپین کی خانہ جنگی، جاپان اور چین کے درمیان جنگ اور روم برلن ٹوکیو معاہدے نے یورپ کے سفارتی احساس کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ اٹلی کی بالواسطہ حمایت حاصل کرنے کے بعد ہٹلر نے اب آسٹریا کو جرمن سلطنت کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ اس وقت یورپ میں کمیونزم کے پھیلنے کے خوف کی وجہ سے برطانیہ نے جرمنی اور اس کے دوستوں کے ساتھ خوشامد کی پالیسی اپنائی۔ اپنے اندرونی مسائل کی وجہ سے فرانس جرمنی کے خلاف موثر کارروائی کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔ اس طرح حالات جرمنی کے حق میں تھے۔ فروری 1938 کے آغاز میں، ہٹلر نے آسٹریا کے چانسلر ششونگ کو برچسگیڈن میں اپنی رہائش گاہ پر بُلایا۔ ہٹلر نے انہیں دھمکی دی کہ اگر اس نے مخصوص شرائط قبول نہ کیے تو دونوں کے درمیان جنگ ہو گی۔ وہ مخصوص شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

- آسٹریا کی نازی پارٹی کو جائز قرار دیا جائے۔
- ڈولفس قتل مقدمے میں گرفتار نازیوں کو رہا کیا جائے۔
- آسٹریا کے نازی رہنما سیسن کارٹ (Seyssinquart) کو آسٹریا کا وزیر داخلہ بنایا جائے۔

آسٹریا کے چانسلر نے مندرجہ بالا شرائط پر رائے شماری کا مطالبہ کیا۔ لیکن، ہٹلر رائے شماری کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے چانسلر کو فوری طور پر مستعفی ہونے کا مشورہ دیا۔ آسٹریا کے چانسلر، ششونگ کے استعفیٰ پر نازی رہنما سیسن کارٹ (Seyssinquart) چانسلر بن گئے۔ اس نے ملک میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ٹیلی گراف کے ذریعے جرمن فوج کو آسٹریا بھیجنے کی درخواست کی۔ درحقیقت جرمن فوج ہٹلر تک درخواست پہنچنے سے پہلے ہی آسٹریا کی سرحد پار کر چکی تھی۔ 13 مارچ 1938 کو جرمن ریشاخ نے آسٹریا کو جرمن سلطنت کا حصہ تسلیم کرنے کی قرارداد منظور کی۔ بہت ہی جلد ہٹلر اپنی فوج کے ساتھ آسٹریا کے دارالحکومت ویانا میں داخل ہوا۔ اس معاملے میں، احتجاج اور خطوط ارسال کرنے کے علاوہ فرانس اور برطانیہ کچھ نہیں کر پائے۔ اگرچہ مسولینی ہٹلر کی اس عمل سے خوش نہیں تھا، لیکن اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس کی وجہ سے پولینڈ بھی خوفزدہ ہو گیا، کیونکہ جرمنی اب جنوب مشرقی یورپ کی تمام سڑکوں، دریاؤں اور ریلوے لائنوں پر اقتصادی اور فوجی کنڑول حاصل کر چکا تھا۔

8.3.9 چیکوسلواکیہ کا بحران اور میونخ معاہدہ (Czechoslovakian Crisis and the Munich Pact)

چیکوسلواکیہ روس اور فرانس کا دوست تھا اور مجلسِ اقوام کا پرجوش حامی تھا۔ وہ ورسائی معاہدے کی تخلیق بھی تھی۔ ہٹلر کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ چیکوسلواکیہ کے دوست اس وقت اس کی مدد کے لیے نہیں آسکیں گے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ چیکوسلواکیہ پر براہ راست حملہ فرانس اور روس کی مداخلت کو بھڑکا دے گا۔ اس لیے اس نے بالواسطہ طریقہ اختیار کیا۔ اس نے چیکوسلواکیہ کے ایک حصے (سوڈیٹن لینڈ) کو حکومت کے خلاف اکسایا۔ اس علاقے کے نازی رہنما، ہیملن، نے حکومت سے کئی مطالبات کیے۔ دوسری طرف ہٹلر نے چیکوسلواکیہ کی حکومت پر سوڈیٹن لینڈ میں جرمن بولنے والوں پر مظالم ڈھانے کا الزام لگایا۔ ہیملین کی پارٹی نے جرمنوں کے لیے مساوات اور خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ 24 اپریل 1938 کو ہٹلر نے چیک حکومت کے سامنے آٹھ مطالبات رکھے۔ ان مطالبات میں جرمنوں کے ساتھ مساوی سلوک، جرمن علاقوں کی حد بندی، اور 1918 سے چیک حکومت کی پالیسیوں کے نتیجے میں جرمنوں کو ہونے والے نقصان کے لیے معاوضہ دینا شامل ہے۔ اسی وقت برطانیہ اور فرانس نے ہٹلر کو چیکوسلواکیہ کے خلاف کسی بھی فوجی کارروائی کرنے سے خبردار کیا۔ روس اور فرانس نے ہٹلر کے حملے کی صورت چیکوسلواکیہ کو فوجی مدد کی یقین دہانی کی۔ لیکن ہٹلر نے اعلان کیا کہ اس کا چیکوسلواکیہ پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

برطانیہ کے وزیر اعظم چیمبرلین ثالثی کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے تھے۔ 14 ستمبر 1938 کو ان کی میونخ میں ہٹلر سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں ہٹلر نے واضح کیا کہ وہ سوڈیٹن لینڈ کو خود ارادیت کے اصولوں پر جرمنی کی اراضی میں ضم کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں برطانیہ (چیمبرلین) اور فرانس نے چیک حکومت کو ایک تجویز بھیجی کہ وہ امن کے قیام کے لیے وہ تمام علاقے جرمنی کے حوالے کر دے جہاں جرمن آبادی 50 فیصد سے زیادہ ہے۔ اس دباؤ کی وجہ سے چیک حکومت اس تجویز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ 22 ستمبر 1938 کو چیمبرلین نے دوبارہ ہٹلر سے گوڈسبرگ میں ملاقات کی۔ برطانوی وزیر اعظم کو ہٹلر کی طرف سے ایک میمورنڈم دیا گیا تھا جس میں مندرجہ ذیل مطالبات تھے:

- یکم اکتوبر 1938 تک پورا سوڈیٹن لینڈ جرمنی کے حوالے کیا جانا چاہئے۔
- علاقے میں واقع تمام قلعوں، ریلوے لائنوں اور فیکٹریوں کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔
- تمام جرمن قیدیوں کو رہا کیا جانا چاہیے۔
- سوڈیٹن لینڈ کی آخری حدود کا تعین بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں رائے شماری کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔

مندرجہ بالا مطالبات سے چیمبرلین حیران ہو گئے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس نے 29 ستمبر 1938 کو میونخ میں جرمنی، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی کانفرنس بلائی۔ اس میں روس اور چیکوسلواکیہ کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی، اور مذکورہ بالا چار ملکوں نے درج ذیل نکات پر اتفاق کیا:

- یکم اکتوبر سے 10 اکتوبر 1938 تک چیک حکومت سوڈیٹن لینڈ کو خالی کرنا شروع کرے، اور یہ علاقہ خالی کرتے وقت سوڈیٹن لینڈ

کی املاک کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔

- سوڈیٹن لینڈ کو خالی کرنے کے لیے شرائط وضوابط کا فیصلہ ایک بین الاقوامی کمیشن کرے گا جس میں جرمنی، برطانیہ، اٹلی، فرانس اور چیکوسلواکیہ کا ایک ایک نمائندہ شامل ہوگا۔
- چیک حکومت تمام جرمن سیاسی قیدیوں کو چار ہفتوں کے اندر رہا کردے گی۔
- فرانس اور برطانیہ نے چیکوسلواکیہ کی نئی سرحدوں کی حفاظت کی ضمانت دی۔

یہ شرائط میونخ معاہدے میں شامل کیے گئے۔ چیکوسلواکیہ اسے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یکم اکتوبر 1938 کی صبح جرمنی نے سوڈیٹن لینڈ پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد، 1939 میں، چیکوسلواکیہ نے تقریباً 4800 مربع میل کا علاقہ ہنگری کے حوالے کردیا، جہاں میگیار بڑی تعداد میں مقیم تھے۔ اس طرح، چیکوسلواکیہ ایک بہت چھوٹی ریاست بن گئی۔ اس معاہدے نے یورپی ممالک کے درمیان دراڑ پیدا کردی۔ متعدد ملکوں نے اس معاہدے کا خیر مقدم کیا لیکن یہ چیکوسلواکیہ کے لیے ذلت آمیز تھا۔ چھوٹے ممالک اب اپنی سلامتی کے بارے میں خوف زدہ ہوگئے۔ روس کا خیال تھا کہ برطانیہ اور فرانس نے ہٹلر کو مطمئن کرکے مشرق کی طرف توسیع کرنے پر اکسایا۔ اس سے جرمنی میں ہٹلر کے وقار میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ اس معاہدے کے بعد چرچل کے مطابق برطانوی وزیراعظم نے جنگ کی جگہ توہین کا انتخاب کیا۔ درحقیقت، یہ چیمبرلین کی سفارت کاری کی شکست تھی۔

8.3.10 چیکوسلواکیہ اور میمل پر قبضہ (Occupation of Czechoslovakia and Memel)

میونخ معاہدے کے اختتام پر ہٹلر نے کہا کہ وہ یورپ میں مزید علاقائی عزائم نہیں رکھتے ہیں، لیکن یہ صرف ایک دکھاوا تھا۔ اس نے ایک آزاد ریاست کے طور پر چیکوسلواکیہ کے وجود کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے اس نے چیکوسلواکیہ میں رہنے والے نازیوں کو اکسایا کہ وہ حکومت سے اقتدار کا مطالبہ کرے۔ اس نے چیکوسلواکیہ کے صدر ہاچھا کو برلن بلایا، اور اسے دھمکیاں دے کر اقتدار نازی پارٹی کے حوالے کرنے پر مجبور کیا۔ 15 مارچ 1939 کو جرمن فوج چیکوسلواکیہ میں داخل ہوئیں اور اس پر قبضہ کرلیا۔ ہٹلر کی اس عمل نے برطانیہ اور فرانس کی آنکھیں کھول دیں۔ 1919 میں میمل لتھوانیا کو دیا گیا تھا۔ 21 مارچ 1939 کو ہٹلر نے لتھوانیا کی حکومت سے میمل کو جرمنی کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ چونکہ لتھوانیا کو مغربی ممالک سے کوئی توقع نہیں تھی۔ اس لئے، اس نے میمل کو جرمنی کے حوالے کردیا۔

8.3.11 1939 کا روس-جرمن معاہدہ (Russo-German Agreement of 1939)

1939 تک ہٹلر کے ارادوں پر برطانیہ اور فرانس نے ایمان کھو دیا تھا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اب پولینڈ جرمنی کا اگلا شکار ہوگا۔ اس لیے ان دونوں نے جرمن حملے کی صورت میں پولینڈ کو مکمل مدد کا یقین دلایا۔ دوسری طرف ہٹلر بھی روس کے ساتھ معاہدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اس بات پر غور کرلیا کہ اسے پہلے مشرقی یورپ کے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہیے اور پھر روس پر۔ سٹالن نے یہ سوچ لیا کہ جرمنی کے خلاف برطانیہ اور فرانس کی مدد کی عدم موجودگی میں انہیں ہٹلر کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیے تاکہ انہیں جنگ کی تیاریوں میں مزید وقت مل

سکے۔اس لئے، ان کے درمیان یہ معاہدہ طے ہوا کہ دونوں ممالک آپس میں پُرامن تعلقات برقرار رکھیں گے۔ معاہدے کی خفیہ شقیں مندرجہ ذیل ہیں:

- فن لینڈ، ایسٹونیا اور لاتویا کو روس کے زیر اثر تسلیم کیا گیا اور لیتھوانیا کو جرمنی کے زیر اثر رکھا گیا۔
- پولینڈ کو آزاد ملک کے طور پر تسلیم کیا گیا؛ اور مستقبل میں اس کے بارے میں حالات کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔
- رومانیہ کا بیسار بیا علاقہ روس کے زیر اثر رکھا گیا۔

اس طرح، روس اور جرمنی کے درمیان عدم جارحیت کا معاہدہ برطانیہ اور فرانس پر ہٹلر کی سفارتی کامیابی تھی۔

8.3.12 پولینڈ پر حملہ اور دوسری عالمی جنگ کا آغاز

(Attack on Poland and the beginning of the Second World War)

1934 میں جرمنی اور پولینڈ نے عدم جارحیت کے معاہدے پر دستخط کیے تھے۔اس معاہدے پر دستخط کرنے میں ہٹلر کا مقصد پولینڈ کو آسٹریا کی مدد سے روکنا تھا۔اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہٹلر نے ڈانزنگ کی بندرگاہ تک پہنچنے کے لیے ایک گذرگاہ کا مطالبہ کیا۔ پولینڈ نے ہٹلر کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا۔اسی دوران ہٹلر نے روس کے ساتھ عدم جارحیت کا معاہدہ کیا تھا۔اس طرح، روس کی طرف سے عدم مداخلت کی یقین دہانی پر ہٹلر نے یکم ستمبر 1939 کو پولینڈ پر حملہ کیا۔ برطانیہ اور فرانس نے ہٹلر کے اس اقدام کی مخالفت کی، اور 3 ستمبر 1939 کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔اس طرح، دوسری عالمگیر جنگ کی شروعات ہوئی۔

8.4 فسطائیت اور اٹلی (Fascism and Italy)

یورپ کے جنوبی حصے میں واقع اٹلی کی جغرافیائی صورتحال اس کی مضبوط بیرونی پالیسی کا ایک اہم سبب تھی۔اٹلی جنوبی وسطی یورپ کا ایک اہم ملک ہے، جو اس پورے جزیرہ نما اراضی پر آباد ہے اور بحیرہ روم کے بیچ تک پھیلا ہوا ہے۔اٹلی قرہ ارض پر سب سے زیادہ متنوع اور قدرتی مناظر سے مالا مال جغرافیائی خطہ ہے۔اس کے شمال میں الپس چوٹی کھڑی ہے، جو دنیا کے سب سے ناہموار پہاڑوں میں سے ایک ہے۔ اس کی جغرافیائی صورتحال ایسی ہے کہ اسے آسانی سے سمندر کی ناکہ بندی کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔اس لیے اسے "بحیرہ روم کا قیدی" بھی کہا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تجارت کی بہتری، سمندری مفادات کے تحفظ اور اپنے آپ کو ایک مضبوط طاقت بنانے کے لئے اٹلی نے بحیرہ روم پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی خواہش کی۔یہی امنگیں تھیں جس نے اطالویوں کے اندر مضبوط قوم پرستانہ جذبے کو جنم دیا۔بینیٹو مسولینی نے اس قوم پرستی کے احساس کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اور اس نے اقتدار پر قبضہ کرکے اٹلی کی آمریت کا قیام عمل میں لایا۔

پہلی عالمی جنگ میں اٹلی اتحادی طاقتوں کے شانہ بشانہ لڑا تھا۔جنگ کے دوران اٹلی کو فوج اور املاک کے لحاظ سے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ پیرس امن کانفرنس کے دوران اٹلی نے لندن کے خفیہ معاہدے میں اتحادی طاقتوں کے وعدے کے مطابق اپنی سرحدوں پر واقع

کئی علاقوں کا مطالبہ کیا، لیکن ولسن نے اس خفیہ معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جنگ کے بعد فارغ ہونے والے ہزاروں فوجی روزگار سے محروم ہو گئے۔ اسلحہ تیار کرنے والے کئی کارخانے بند ہونے سے بے روزگاری کا مسئلہ مزید بڑھ گیا۔ نتیجتاً جنگ کے بعد اٹلی کو معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی کرنسی کی قیمت گر گئی اور مہنگائی بڑھنے لگی۔ اٹلی میں ہر طرف بے اطمینانی پیدا ہو گئی۔ اس بے اطمینانی اور مایوسی نے فسطائیت کے لئے راہ ہموار کر دی، جو آخر کار دوسری عالمی جنگ کا سبب بن گیا۔

8.4.1 نظریہ فسطائیت (Theory of Fascism)

مارکس اور لینن کی طرح مسولینی نے سیاسی اور شہری زندگی پر اپنے نظریات کے حوالے سے کوئی روداد شائع نہیں کی ہے۔ فسطائیت مختلف ذرائع سے لیے گئے نظریات کا مجموعہ تھا۔ اس کے علاوہ، ان کے اپنے کچھ سماجی اور سیاسی مقاصد تھے جن کا اظہار اس نے اپنے تقاریر اور بیانات میں کیا ہے۔ ان کے نظریات کے بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہیں:

- ریاست میں ایک سے زیادہ مقتدر نہیں ہو سکتے ہیں۔
- ریاست کسی فرد کے لیے نہیں بلکہ فرد ریاست کے لیے ہے۔ مسولینی اکثر کہا کرتے تھے کہ سب کچھ ریاست کے لئے ہے؛ اور ریاست سے باہر اور ریاست کے خلاف کچھ نہیں ہونا چاہئے۔
- فسطائیت کا دعویٰ ہے کہ ایک فرد کو ریاست میں اسی وقت مقام حاصل ہوتا ہے جب دونوں کے مفادات یکساں ہوں۔
- فسطائیت جمہوریت، آزاد خیالی اور اشتراکیت کی تمام شکلوں کے مخالف تھا، چاہے وہ انقلابی ہو یا ارتقائی۔
- فسطائیت تاریخی مادیت کے نظریے کو قبول نہیں کرتا ہے۔ اس کے مطابق سیاسی عناصر کی وجہ سے تاریخ ایک مخصوص شکل اختیار کرتی ہے۔ فسطائیت اس نظریے کو بھی قبول نہیں کیا کہ صرف طبقاتی جنگ ہی معاشرے میں تبدیلی لا سکتی ہے۔
- فسطائیوں کا ماننا تھا کہ آزاد تجارت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ان کی رائے میں اس سے عظیم مالی بحران پیدا ہو گیا۔ اس لیے تمام حکومتوں کو تجارت میں مداخلت کرنی چاہیے۔
- فسطائیت عقلی تحقیقات پر یقین نہیں رکھتا ہے۔ اس کے مطابق ریاست ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ عوام کو چاہیے کہ وہ اپنے قائد کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل کرے۔
- فسطائیوں نے ان کوششوں کو منظور نہیں کیا جو پہلی عالمگیر جنگ کے بعد امن قائم کرنا چاہتی تھیں۔
- فسطائیت نے انتہائی قوم پرستی کی حمایت کی، اور اس بات پر زور دیا کہ ریاست سے وابستگی شہریوں کا سب سے بڑا فرض ہے۔

گیووانی جنٹائل (1875-1944) فسطائی نظریے کا سب سے بڑا حامی تھا اور ہیگل کا شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ بینیٹو مسولینی کا بھی بڑا مداح تھا۔ ان کا خیال تھا کہ فرد اور ریاست کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور "زیادہ سے زیادہ آزادی سے ریاست کو زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔" 1928 میں، اس نے کہا کہ فسطائیت کوئی فلسفیانہ نظام نہیں بلکہ ایک منصوبہ ہے۔

8.4.2 فسطائیت کے عروج کے اسباب (Causes for the Rise of Fascism)

فسطائیت کے عروج کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

1. لندن کے خفیہ معاہدے (1915) کے مطابق اٹلی نے ڈالمٹیین کی ساحلی پٹی، بریز پاس تک ٹیرول کا علاقہ، البانیہ، ٹرینٹینو، ٹریسٹ، آسٹریا اور فیوم کا مطالبہ کیا، لیکن ولسن کی مخالفت کی وجہ سے اسے صرف ٹرینٹینو، ڈالمٹیین کی ساحلی پٹی اور جنوبی ٹیرول حاصل ہوا۔ جب اطالویوں نے دیکھا کہ فرانس اور برطانیہ کو اٹلی کے مقابلے میں بہت زیادہ علاقے دیے گئے، تو اس نے امن کانفرنس میں ناکامی کا ذمہ دار اٹلی کی جمہوریہ حکومت کو ٹھہرایا۔
2. جانی اور مالی لحاظ سے جنگ میں اٹلی کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ اٹلی میں بے روزگاری کافی حد تک بڑھ گئی۔ غیر ملکی منڈیوں کی عدم موجودگی میں اس کی تجارت میں کافی کمی آگئی۔ جنگ کے بعد اٹلی سیاسی اور اقتصادی بدامنی سے عدم طمانیت کا شکار ہو گیا۔ اس وجہ سے عوام ایک مضبوط حکومت کا خواہاں تھا جو انہیں ان مشکلات سے نجات دلا سکے۔
3. انیسویں صدی میں قوم پرستی کے نظریے نے یورپ کے لوگوں کو بہت متاثر کیا، اور اٹلی بھی اس کا شکار ہو چکی تھی۔ 1881 میں فرانس نے اٹلی کو تیونس پر قبضہ کرنے سے روک دیا۔ 1888 میں اڈووا (Adowa) کی شکست نے اٹلی کے وقار پر اور ایک کاری ضرب لگائی۔ اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اٹلی نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر پہلی عالمگیر جنگ میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن پیرس امن کانفرنس کے دوران اٹلی کے وزیر اعظم اورلینڈو (Orlando) کو ولسن کے رویے سے غیر مطمئن واپس لوٹنا پڑا۔
4. ایک جرمن مفکر ہیگل کا ماننا ہے کہ "ریاست زمین پر خدا کا سب سے بڑا مظہر ہے۔" "ایک خدائی یا سماوی ریاست کبھی غلطی نہیں کر سکتی ہے۔ شہریوں کے حقوق اور ریاست کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ شہریوں کے پاس صرف وہی حقوق ہوتے ہیں جو ریاست انہیں دیتی ہے۔ اس لیے، انسان ریاست کی اطاعت سے ہی ترقی کر سکتا ہے۔ چونکہ ہیگل کے نظریہ اور فسطائی پارٹی کے خیالات میں واضح مماثلت تھی، اس لیے ہیگل کے نظریات کی تبلیغ پارٹی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔
5. روسی انقلاب کے بعد اٹلی میں کمیونسٹ نظریے کا بڑے پیمانے پر پرچار کیا گیا۔ لوگ کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے خوفزدہ ہو گئے۔ لہذا، اٹلی کا ابتدائی فسطائیت کمیونزم کا رد عمل تھا۔ فسطائی پارٹی نے کمیونزم کی شدید مخالفت کی۔ اس طرح، اس نے عام لوگوں کی حمایت حاصل کی۔ زمینداروں کو یہ خدشہ تھا کہ ان کی زمینوں پر کسان قبضہ کریں گے۔ صنعتکار اپنے اثاثوں کے تحفظ کے حوالے سے خوفزدہ تھے۔ ایسے حالات میں کمیونزم کی تنقید کر کے فسطائیوں نے جاگیرداروں، صنعت کاروں اور سماج کے دیگر طبقات کی حمایت حاصل کی۔
6. اٹلی میں کئی سیاسی جماعتیں موجود تھیں۔ وقتاً فوقتاً ہونے والے انتخابات میں ہر سیاسی جماعت کے نمائندے پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوتے رہے لیکن کوئی بھی سیاسی جماعت اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس لیے عام طور پر اٹلی میں مخلوط حکومتیں وجود میں آتی تھیں۔ ایسی حکومتوں کو ہمیشہ اپنی اکثریت کھونے کا اندیشہ رہتا تھا، اور وہ کسی بھی معاملے پر اختلافات کی وجہ سے اپنی حمایت واپس لے لیتے تھے۔ اس طرح، اٹلی میں وزارتیں مستحکم نہیں ہوتی تھیں اور مسائل کے ساتھ مضبوطی سے نہیں نمٹا جا سکتا

تھا۔

7. اٹلی کے لوگ ورسائی معاہدے سے مطمئن نہیں تھے۔ اس نے اتحادیوں پر مکمل دباؤ نہ ڈالنے کے لئے حکومت کو موردِ الزام ٹھہرایا۔اس کے علاوہ، یہ حکومت معاشی مسائل حل کرنے میں بھی ناکام رہی۔

13مارچ 1919 کو مسولینی نے میلان شہر میں Fascio di Combattimento یا فسطائی فوجی گروپ قائم کیا۔ پارٹی کا پروگرام کچھ یوں تھا:

- مزدوروں کو دن میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جانا چاہیے۔
- چرچ کی جائیداد ضبط کی جانی چاہیے۔
- ایک نیا آئین بنانے کے لئے ایک آئین ساز اسمبلی کا انتخاب بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے۔
- عوام کو عالمگیر حقِ رائے دہی فراہم کرنی چاہیے۔
- فیوم اور ڈالمٹیا کو اٹلی کے تحت لایا جائے۔
- خواتین کو حق رائے دہی فراہم کی جائے۔
- اطالوی پارلیمنٹ میں سینیٹ (ایوانِ بالا) کا خاتمہ ہونا چاہیے۔اس کے اراکین کا انتخاب امیر شہریوں کے ذریعے کیا جاتا تھا، لیکن حقیقت میں یہ بادشاہ کی براہ راست تقرری ہوتی تھی۔
- صنعت، نقل و حمل، صحت عامہ، مواصلات وغیرہ کے لیے ماہرین کی قومی کونسل کی تشکیل ہونی چاہیے۔
- ریلوے اور پبلک ٹرانسپورٹ سیکٹر کی تنظیم نو کی جانی چاہیے۔

مسولینی کا بیان کردہ پروگرام لوگوں میں بہت مقبول ثابت ہوا۔اس پروگرام کے ساتھ مسولینی نے کمیونزم کی مذمت کی۔ان کے مطابق فسطائیت حقیقت پسندی پر مبنی ہے جبکہ کمیونزم ایک خیالی نظریہ ہے۔ مسولینی کی شخصیت اٹلی میں فسطائیت کے عروج کا ایک اہم وجہ تھی۔ 1912 میں وہ اونتی ('Avanti') نامی اشتراکی اخبار کے مدیر بن گئے۔ جنگ کے آغاز میں اس نے غیر جانبداریت کا مظاہرہ کیا، لیکن اس کے فوراً بعد اس نے اتحادی طاقتوں کے ساتھ جنگ میں اٹلی کی شمولیت کی حمایت کی۔ 1915 میں اس نے فوج میں شمولیت اختیار کی۔ جنگ کے اختتام تک وہ جنگ مخالف پروپیگنڈے کی مخالفت کرتا رہا۔اس نے کمیونزم کے نظریے کی بھرپور مخالفت کی۔مارچ 1919 میں اس نے فسطائی پارٹی قائم کی، جو دن بدن ترقی کررہی تھی۔ مسولینی پارٹی کا چیف کمانڈر تھا،اور ڈیوس (the Duce) کے نام سے مشہور تھے۔

8.4.3 مسولینی کی آمریت کا قیام (Establishment of Mussolini's Dictatorship)

29 اکتوبر 1922 کو بادشاہ نے مسولینی کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ اس طرح، پارلیمنٹ نے آمرانہ اختیارات مسولینی کو سونپے،اور اٹلی میں فسطائی آمریت کا آغاز ہوا۔ اس نے اپنے تمام مخالفین کو انتظامیہ سے نکال کران عہدوں پر اپنے پیروکاروں کو مقرر کیا۔

اپریل 1924 کے انتخابات میں فسطائی پارٹی نے 65 فیصد ووٹ حاصل کیے اور اس طرح پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کی۔ 1925 اور 1926 میں دو ایسے قوانین منظور کیے گئے جنہوں نے مسولینی کو اعلیٰ طاقت دے دی۔ 1926 میں، اس نے اپوزیشن کو ضبط کر دیا۔ اس نے خصوصی عدالتیں قائم کیں، جن میں فسطائی شہریوں اور فوجی افسران کو سیاسی مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔

8.4.4 مسولینی اور فسطائی پارٹی کا عروج (Mussolini and the Rise of the Fascist Party)

معاشی بدحالی نے اٹلی میں اشتراکیوں اور انقلابیوں کے عروج کو آسان بنایا۔ مزدور اور کسان اکثر دیہی علاقوں کی سڑکوں پر ریاست کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ صنعت کاروں اور زمینداروں کو مزدوروں کے لیے زیادہ اجرت اور کام کے اوقات کم کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے علاوہ، کمیونسٹ انٹرنیشنل (کامینٹرن) کے قیام نے 1892 میں قائم کردہ اطالوی سوشلسٹ پارٹی ('Italian Socialist Party') کے کام کو بہت متاثر کیا۔ اطالوی سوشلسٹ پارٹی نے اٹلی میں "پرولتاریہ کی آمریت" کے قیام کا مطالبہ کیا۔ اس نے نومبر 1919 کے انتخابات میں حصہ لیا اور تقریباً ایک تہائی ووٹ حاصل کیے۔ اس طرح، یہ ایوان زیریں (Chamber of Deputies) میں سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھر آئی۔ بہت جلد ہی کیتھولک کسانوں نے مذہبی راسخ العقیدہ سے متاثر ہو کر وسطی اور جنوبی اٹلی میں زمینداروں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ ستمبر 1920 میں، شمالی اٹلی کے شہروں میں اشتراکیت پسندوں نے صنعتوں کو اپنے تحویل میں لے لیا۔

وزیر اعظم فرانسسکو نیتی (1919 سے 1920 تک) اور گیوانی گیولیٹی (اٹلی کے سابقہ وزیر اعظم) کی لبرل حکومت بے بس ہو گئی، اور اس نے انقلابی بغاوت سے خوفزدہ ہو کر کوئی اقدام اٹھانے سے گریز کیا۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اشتراکیت پسندوں کے صفوں میں پھوٹ پیدا ہو گئی۔ انقلابی اشتراکیت پسندوں نے جنوری 1921 میں ایک علیحدہ کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔ اشتراکیت پسندوں کی بغاوت نے جاگیرداروں اور صنعت کاروں کو خوفزدہ کر دیا۔ نتیجتاً، انہیں ایک محبِ وطن اور قوم پرست تحریک میں پناہ مل گئی جو بینیٹو مسولینی کی قیادت میں مشہور ہو رہی تھی۔ ان قوم پرستوں نے اٹلی کے کھوئے ہوئے مقام، وقار اور احترام کو بحال کرنے کا وعدہ کیا۔ اسی پس منظر میں اٹلی میں بینیٹو مسولینی کی قیادت میں فسطائیت کا ظہور ہوا۔

بینیٹو مسولینی ابتدا سے ہی نظریہ اشتراکیت سے متاثر تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ فسطائی پارٹی کے سرکردہ رہنما بن گئے۔ مسولینی نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ایک اشتراکی انتہا پسند کے طور پر کیا، جس کی وجہ سے انہیں سوئٹزرلینڈ جلاوطن کر دیا گیا۔ 1912 میں، اس نے اطالوی جارحیت کی مخالفت کی، جس کی وجہ سے انہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ 1914 میں، اس نے اتحادیوں کی طرف سے پہلی عالمی جنگ میں شرکت کرنے پر اٹلی کے خلاف تحریک چلائی۔ آخرکار، انہیں جنگ کی حمایت کرنے کی وجہ سے سوشلسٹ پارٹی چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ بعدازاں، انہوں نے فوج میں شامل ہو کر جنگ میں حصہ لیا۔ 1917 میں، وہ فوجی خدمات انجام دیتے ہوئے زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ روسی کمیونزم کے سخت دشمن بن گئے، اور ساری زندگی اس کے خلاف لڑتے رہے۔

پہلی عالمی جنگ کے دوران اور اس کے فوراً بعد اٹلی میں جو حالات تھے وہ بینیٹو مسولینی کے تحت فسطائی آمریت کے عروج کے لیے انتہائی سازگار ثابت ہوئے۔ مارچ 1919 میں، اس نے محبِ وطن اور دانشوروں کے پہلے کلب کی بنیاد رکھی، جس سے اٹلی میں فسطائی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس نے صنعت کاروں اور جاگیر داروں سے امداد وصول کی۔ اس نے ان لوگوں کی طرف سے اشتراکیت کی سخت تنقید کی۔ فوجی افسران نے مسولینی کو اسلحہ اور گولہ بارود فراہم کیے، جس سے ان کے پیروکار سیاسی مخالفین کی ملاقاتیں توڑ دیتے تھے۔ فسطائی پارٹی کے پیروکار اور کارکنان نظم وضبط کے ساتھ پرجوش حامی تھے۔ ان کی پارٹی کے رضاکاروں کو ان کے لباس کی وجہ سے 'بلیک شرٹس' کے نام سے جانا جاتا تھا اور وہ اپنے 'ڈیوس' (لیڈر) کو پرانے رومن انداز میں ہاتھ پھیلا کر سلام پیش کرتے تھے۔ اس طرح، فسطائی پارٹی ایک نیم فوجی تنظیم بن گئی۔ فسطائی تحریک کی مسلسل بڑھتی ہوئی جارحیت دوسری جماعتوں کے زوال کا باعث بن گئی۔

1921 کے انتخابات میں، فسطائیوں نے ایوان زیریں (Chamber of Deputies) میں اشتراکی اور کمیونسٹوں نے 122 کے مقابلے میں 35 نشستیں حاصل کیں۔ 28 اکتوبر 1922 کو مسولینی نے نیپلز میں نیشنل فسطائی کانگریس کا انعقاد کیا، اور ایک تقریر میں کہا کہ اگر حکومت کی ذمہ داری اس کے سپرد نہ کی جائے وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ "روم پر مارچ" کریں گے۔ اس تقریر کے بعد وہ میلان میں داخل ہوئے، جب کہ ہزاروں مسلح فسطائی روم پر توجہ مرکوز کر رہے تھے۔ اس طرح، اکتوبر 1922 میں فسطائیوں نے طاقت کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کی مضبوط کوشش کی۔ اس دوران حکومت نے فوجی قانون نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بادشاہ وکٹر ایمانوئل ثالث نے فیصلے پر دستخط کرنے سے انکار کیا۔ 27 اکتوبر 1922 کو لبرل حکومت نے استعفیٰ دے دیا؛ اور 29 اکتوبر 1922 کو بادشاہ نے مسولینی کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ اس طرح، پارلیمنٹ نے آمرانہ اختیارات مسولینی کو سونپے، اور اٹلی میں فسطائی آمریت کا آغاز ہو گیا۔ 1922 سے 1943 تک فسطائی پارٹی مسولینی کی قیادت میں برسراقتدار رہی۔ مسولینی کی اکیس سالہ حکمرانی نے ملک کو ایک فسطائی ریاست میں تبدیل کر دیا۔ ہٹلر کے بعد مسولینی نے 1940 میں جنگ میں شمولیت اختیار کی۔ 1943 میں، اٹلی کو شکست ہوئی اور مسولینی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

8.4.5 فسطائی پروپیگنڈہ (Fascist Propaganda)

اطالوی عوام کو فسطائی اقدار اور ثقافت کو قبول کرنے کے لئے پروپیگنڈے کو بہت اہمیت دی گئی۔ حکومت نے پریس، ریڈیو اور سنیما پر اپنا کنٹرول جمانے کی کوشش کی۔ ریاست نے احتسابی عمل کے ذریعے فسطائی مخالف اخبارات اور رسائل پر پابندی لگا دی، یا ان کی ادارت فسطائی حامیوں کے سپرد کر دی گئی۔ 1937 میں فسطائی پیغام پھیلانے کے لیے منسٹری آف پاپولر کلچر کا قیام عمل میں لایا گیا۔ لوگوں کو اس نعرے سے قائل کرنے کی کوشش کی گئی کہ 'مسولینی ہمیشہ صحیح ہوتا ہے'۔ قدیم روم کی فوجی بالادستی کی مسلسل تعریف کی گئی، اور اس بات پر زور دیا کہ اٹلی فسطائیت کے ذریعے ہی مزید برتری حاصل کر سکتا ہے۔

8.4.6 مسولینی کی اقتصادی پالیسی (Economic Policy of Mussolini)

معیشت پر ریاستی کنٹرول (State Control over Economy)

مسولینی نے ریاستی معیشت کو کنٹرول کرنے کے لیے موثر اقدامات اٹھائے تھے۔ کیمونسٹوں کی طرح فسطائی بھی تمام صنعتوں کو حکومت کے کنٹرول میں لانا پسند نہیں کرتے تھے لیکن وہ تمام معاشی سرگرمیوں میں ریاست کی مداخلت کے حق میں تھے۔ اس لیے، ریلوے، لوہا اور فولاد کے کارخانے ریاستی کنٹرول میں لائے گئے۔ دیگر صنعتوں میں سرمایہ داروں سے کہا گیا کہ وہ مزدوروں کا مکمل تعاون حاصل کریں اور اہم معاملات یا پالیسی سازی پر حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے نمائندوں سے مشورہ کریں۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے دونوں کو اپنی اپنی الگ سنڈیکیٹ بنانے کا حکم دیا گیا۔

1922 میں، تمام فسطائی سنڈیکیٹوں یا مزدور یونینوں کو پانچ کارپوریشنوں کے تحت منظم کیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد فسطائی کارپوریشنوں کی ایک وفاق وجود میں آگئی۔ جب 1922 میں مسولینی اقتدار میں آیا تو فسطائی سنڈیکیٹوں کی رکنیت میں کافی اضافہ ہوا۔ 1926 میں، مسولینی نے پورے ملک کو سینڈ کلزم ('Syndicalism') کے تحت لایا۔ چھ بڑے اقتصادی شعبوں جیسے صنعت، زراعت، تجارت، بینکنگ اور انشورنس، پانی، اور ہوائی اور زمینی ٹریفک کے لیے سنڈیکیٹس کے الگ الگ قومی وفاقیں بنائی گئی۔ ہر سنڈیکیٹ کے تحت صوبائی اور مقامی اکائیاں تھیں۔ سنڈیکیٹ نظام کا بنیادی مقصد سرمایہ داروں اور محنت کشوں کے درمیان کشمکش کو ختم کرنا تھا۔ 1926 میں پاس ہونے والے ایک قانون کے مطابق یہ حکم دیا گیا کہ مزدوروں کی اجرت اور کام کی دیگر شرائط وضوابط کے بارے میں اجتماعی معاہدے کیے جائیں۔ ہڑتال اور تالہ بندی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ اپریل 1927 میں، ریاست نے ایک چارٹر جاری کیا جس کے مطابق اتوار کو ہفتہ وار تعطیل قرار دیا گیا اور ہر کارکن کو پوری تنخواہ پر چھٹی لینے کا حق دیا گیا، اور انہیں سوشل انشورنس فراہم کی گئی۔ اس کے علاوہ، کارکنوں کی سیر و تفریح کے انتظامات بھی کیے گئے۔

اقتصادی ترقی کے لیے اقدامات (Initiatives for Economic Development)

مسولینی کے اقتدار پر قابض ہونے کے وقت ریاست کو شدید مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ قومی بجٹ خسارے کا شکار تھی۔ ملک کا قرضہ بڑھ رہا تھا اور کرنسی کی قیمت گر رہی تھی۔ صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے اس نے ریاستی اخراجات میں زبردست کمی کی، اور نئے محصول عائد کیے۔ اس طرح، 1925 تک بجٹ میں توازن قائم ہوا۔ ان کی کوششوں سے ریلوے نے اپنے خسارے پر قابو پالیا، جس سے ریلوے نے مسلسل ترقی کرنا شروع کیا۔ پیداوار کے اضافے میں سب سے بڑی رکاوٹ ملک میں خام مال اور معدنیات کی کمی تھی۔ اس کمی پر قابو پانے کے لیے اس نے سائنسدانوں اور انجینئروں کی مدد حاصل کی۔ اٹلی کو غذائی اجناس کی پیداوار میں خود کفیل بنانے کے لیے اس نے 1928 میں دلدل اور بنجر زمینوں کو قابل کاشت زمینوں میں تبدیل کرنے کا پروگرام شروع کیا۔ آبپاشی کے لیے ڈیم اور نہریں تعمیر کی گئیں اور دیہی علاقوں کو بجلی فراہم کی گئی۔ ان تمام اقدامات کے نتیجے میں اٹلی کو پہلے کی نسبت کم مقدار میں اناج برآمد کرنا پڑا۔ سنڈیکیٹ نظام کے تحت،

ریاست نے نئی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی،اور ضرورت کے وقت انہیں مالی امداد اور تحفظ فراہم کیا۔1930 میں اس نے غیر ملکی گاڑیوں پر کسٹم ڈیوٹی کو دوگنا کر دیا۔ نتیجتاً اٹلی کی فیاٹ موٹر کمپنی نے بہت زیادہ منافع کمایا۔ کوئلے کی کمی کو پورا کرنے کے لیے الپس اور ایپنائن پہاڑوں کی ڈھلوانوں میں بجلی کی تخلیق شروع کی گئی۔ جہاز سازی کی صنعت کو ریاست کی سرپرستی میں لایا گیا۔ بے روزگاری کو کم کرنے کے لیے فسطائی حکومت نے عوامی کاموں کا ایک جامع پروگرام شروع کیا۔ اس اسکیم کے تحت سڑکیں، اسکولوں کی عمارتیں، مکانات، ڈیم، نہریں اور بندرگاہیں تعمیر کی گئیں۔ اس کے علاوہ، قدیم روم کی یادگاروں کی آرائش کی گئی، اور اہم اور تاریخی شہروں کو خوبصورت بنایا گیا۔

8.4.7 مسولینی اور پوپ کے درمیان تعلقات (Relationship between Mussolini and the Pope)

اقتصادی تعمیر نو کے مسئلے کے علاوہ مسولینی کو درپیش دوسرا اہم مسئلہ پوپ کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ اٹلی کے اتحاد کے بعد پوپ نے خود کو 'ویٹیکن کا قیدی' قرار دیا، اور اطالوی حکومت سے تمام تعلقات منقطع کیے۔ اگرچہ مسولینی کو مذہب پر یقین نہیں تھا لیکن انہیں مذہب کی سیاسی قدر کا بہت احساس تھا۔ 11 فروری 1929 کو دونوں فریقوں کے درمیان روم میں ایک معاہدے پر دستخط ہوئے، جسے 'لیٹرین ایکارڈ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت، اٹلی نے پوپ کی خود مختاری کے تحت ویٹیکن شہر کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کیا۔ بعد ازاں، پوپ نے بھی اٹلی کی حکومت کو ایک خود مختار ریاست کے طور پر تسلیم کیا۔ اس کے علاوہ، کیتھولک مذہب کو اٹلی کا واحد سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا۔ پوپ کو آرچ بشپ اور بشپ کی تقرری کی آزادی اس شرط پر دی گئی تھی کہ ان کی تقرری سے قبل ان کے بارے میں تفتیش اور چھان بین اٹلی کی حکومت کرے گی، اور عہدہ سنبھالنے پر انہیں اطالوی حکومت سے وفاداری کا حلف اٹھانا ہوگا۔ اس کے علاوہ، پرائمری اور سیکنڈری سکولوں میں مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا۔ مزید برآں، اطالوی حکومت پوپ کو 75 کروڑ لیر (Lira) کی نقد رقم اور 1870 میں ضبط کی گئی چرچ کی جائیداد کے معاوضے کی شکل میں ایک عرب لیر دینے پر رضامند ہوئی۔ پوپ نے اسے اپنے تمام مالیاتی دعووں کے حتمی تصفیے کے طور پر قبول کیا۔

8.4.8 مسولینی کی خارجہ پالیسی (Foreign Policy of Mussolini)

مسولینی کے اقتدار پر قبضے کے وقت اطالوی احساس کمتری کا شکار تھے، کیونکہ پیرس امن کانفرنس میں اٹلی کے نمائندوں کو مناسب اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ اس لیے مسولینی کی خارجہ پالیسی کا بنیادی مقصد بین الاقوامی دنیا میں اٹلی کا وقار بڑھا کر اسے ایک طاقتور ملک بنانا تھا۔ پیرس امن کانفرنس میں 1915 کے لندن معاہدے کی عدم تکمیل نے اٹلی کو یورپ کے کئی علاقوں سے محروم کر دیا تھا۔ اس لیے مسولینی کی رائے میں ضروری تھا کہ اٹلی کے حق میں ورسائی معاہدے کی ترمیم کی جائے۔ وہ بحیرہ روم میں اٹلی کے اثر و رسوخ کو بڑھانا چاہتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ بحیرہ روم کو 'رومی جھیل' میں تبدیل کر دے۔ مسولینی مستقل امن کے قیام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک امن کی خواہش کرنا ایک لغو بات تھی۔ ان کی رائے میں مجلسِ اقوام کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ مجلسِ اقوام کی بنیاد تمام اقوام کے مساوات پر نہیں ہے، اس لیے انہیں بقائے باہمی کے نظریہ پر کوئی یقین نہیں تھا۔ اس طرح، مسولینی بین الاقوامی میدان میں اٹلی کے لیے ایک باوقار

مقام، اور اسے دنیا کی بڑی طاقتوں کے برابر لانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ، وہ بحیرہ روم کے ساحلوں پر افریقہ میں ایک وسیع اطالوی سلطنت قائم کرنا چاہتے تھے۔

مذکورہ مقاصد کے حصول کے لیے اس نے درج ذیل اقدامات اٹھائے:

- اس وقت اٹلی آبنائے جبرالٹر یا نہرِ سوئز کے ذریعے ہی سمندر تک پہنچ سکتا تھا۔ مسولینی نے محسوس کیا کہ نہرِ سویز کسی بھی وقت کسی حادثے کی وجہ سے بند ہو سکتی ہے اور جبرالٹرا انگریزوں کے کنٹرول میں تھا۔ سمندر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اٹلی نے بحیرہ روم کے مشرقی حصے میں روڈز اور ڈوڈاکانی جزائر پر قبضے کا دعویٰ کیا۔ لیکن 1920 کے سیورز معاہدے کے مطابق اٹلی کو یہ دعویٰ واپس لینا پڑا۔ 1922 میں اطالوی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ ترکی کے ساتھ اس معاہدے کا احترام نہیں کرے گی۔ اگرچہ یونان اور برطانیہ نے اس کی مخالفت کی لیکن لوزان کے معاہدے (1924) کے ذریعے ان دونوں جزائر پر اٹلی کے دعوے کی توثیق کر دی گئی۔ مسولینی کی خارجہ پالیسی کی یہ پہلی کامیابی تھی۔
- اگست 1923 میں، البانیہ اور یونان کی سرحدوں کی حد بندی کرنے والے بین الاقوامی کمیشن کے اطالوی چیئرمین کو یونان میں جنینا کے قریب اپنے چار ساتھیوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ اٹلی نے یونان سے قتل کی تحقیقات، معاوضے کے طور پر 50 ملین لیر اور معافی کا مطالبہ کیا۔ یونانی حکومت نے ان مطالبات کو ٹھکرا دیا کیونکہ یہ اس کی خود مختاری اور قومی وقار کے خلاف تھے۔ اطالوی حکومت نے یونان کے کورفو جزیرے پر بمباری کے لیے ایک بحری بیڑا بھیجا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یونان نے مجلسِ اقوام سے تنازعہ حل کرنے کی اپیل کی۔ مسولینی نے کہا کہ یہ مسئلہ مجلسِ اقوام کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ سفیروں کی ایک کونسل (Council of Ambassadors) میں بھیج دیا گیا۔ غور و خوض کے بعد کونسل نے یونان سے کہا کہ وہ اٹلی سے معافی مانگے اور اس کی طرف معاوضے کے طور پر 50 ملین لیر ادا کرے۔ کونسل نے اٹلی کو کورفو سے دستبردار ہونے کی تاکید کی۔ اس معاملے میں مسولینی کی کامیابی نے اسے اپنے توسیع پسندانہ نظریات پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔
- 1920 میں، فیوم کی بندرگاہ کو ایک آزاد بندرگاہ کے طور پر قرار دیا گیا تھا۔ اطالوی اس بندرگاہ پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ 1924 میں مسولینی نے یوگوسلاویہ کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیا۔ معاہدے کے مطابق، مسولینی نے پوسٹ باروس (Post Baros) کو یوگوسلاویہ کے حوالے کر دیا اور فیوم پر قبضہ کر لیا۔
- فیوم کے حصول نے بحیرہ ایڈریاٹک میں اٹلی کی حیثیت کو مضبوط کیا۔ مسولینی اب بحیرہ ایڈریاٹک کے دوسرے ساحل پر البانیہ پر قبضہ کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ البانیہ کے حکمران احمد بی زوگنے کو قرضہ دے کر مسولینی نے وہاں اٹلی کی معاشی بالادستی قائم کی۔ نومبر 1926 میں، زوگن نے دوبارہ مدد کے لیے اٹلی سے رابطہ کیا، تاکہ وہ بغاوت کو دبا سکے۔ صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسولینی نے البانیہ کے ساتھ تیرانہ معاہدہ (26 نومبر 1927) کیا۔ اس معاہدے کے ذریعے البانیہ اٹلی کی پروٹیکٹوریٹ (Protectorate) بن گئی۔

- 1922 کے واشنگٹن معاہدے میں اٹلی کو بحری معاملات میں فرانس کے برابر درجہ دیا گیا تھا۔ جنوب مشرقی یورپ میں اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لیے مسولینی نے روس کے ساتھ ایک معاہدہ (1929) کیا۔ اس معاہدے کے مطابق اٹلی نے روس کے ساتھ دوستی قائم کی۔ اس نے مجلسِ اقوام کا رکن بننے میں بھی روس کی مدد کی۔
- 1922 میں فرانس اور اٹلی کے تعلقات شمالی افریقہ، مغربی بحیرہ روم اور بلقان ریاستوں میں ان کی دشمنی کی وجہ سے کشیدہ ہو گئے۔ یہ دونوں بحیرہ روم میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتے تھے۔ 1933 میں ہٹلر کے عروج نے دونوں ممالک کو قریب لایا۔ جب 1934 میں ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، تو اس وقت مسولینی نے اپنی فوجیں برینر پاس ('Brenner Pass') بھیج دیں۔ اس عمل پر فرانس نے اٹلی کی مدح سرائی کی۔ جنوری 1935 میں، انہوں نے ایک معاہدہ کیا۔ اس کے مطابق فرانس نے لیبیا کے چند ہزار مربع میل صحرائی علاقہ اٹلی کو دے دیئے۔
- افریقہ میں اٹلی نے صومالی لینڈ، اریٹیریا اور لیبیا پر قبضہ کر رکھا تھا۔ مسولینی اٹلی کی نو آبادیاتی سلطنت میں ابیسنیا کو شامل کرنا چاہتا تھا۔ 5 دسمبر 1934 کو اطالوی صومالی لینڈ اور ابیسینیا کی سرحد پر والوال کے مقام پر تیس اطالوی مارے گئے۔ مسولینی نے ابیسینیا سے معافی مانگنے اور بھاری معاوضہ ادا کرنے کے لئے کہا۔ ابیسنیا نے مجلسِ اقوام سے اپیل کی لیکن مجلس تقریباً آٹھ سے دس ماہ تک کوئی ٹھوس قدم اٹھانے میں ناکام رہی۔ مسولینی نے فرانسیسی حمایت حاصل کی اور اکتوبر 1935 میں ابیسنیا پر حملہ کیا۔ مجلسِ اقوام نے اسے ایک جارح ملک قرار دیا اور اپنے ممبران سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ اپنے تمام معاشی تعلقات ختم کرے۔ فرانس اور برطانیہ نے ان پابندیوں کا سختی سے اطلاق نہیں کیا۔ جرمنی نے اٹلی کو فوجی ساز و سامان فراہم کیا۔ مئی 1936 میں اٹلی کی فوج ادیس ابابا میں داخل ہوئی۔ نومبر 1938 میں، برطانیہ اور فرانس نے ابیسنیا پر اطالوی بالادستی تسلیم کی۔
- اکتوبر 1936 میں، اٹلی اور جرمنی نے برلن میں ایک معاہدے پر دستخط کیے جسے تاریخ میں روم-برلن معاہدے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ (اس اکائی میں 8.10 ملاحظہ کیجئے)
- 1936 میں، اسپین میں بائیں بازو اور راسخ العقیدہ عناصر کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ راسخ العقیدہ اپنے آپ کو قوم پرست کہتے تھے۔ قوم پرستوں کی قیادت ایک فوجی افسر جنرل فرانکو کر رہے تھے، لیکن وہ فطرتاً ایک فسطائی تھے۔ مسولینی کے لیے یہ بحیرہ روم میں اٹلی کے اثر و رسوخ کو بڑھانے کا ایک سازگار موقع تھا۔ اگر فرانکو اٹلی کی حمایت سے جنگ جیت لیتے تو اٹلی کو اسپین کے سمندری ساحل پر فضائی اور بحری اڈے حاصل ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ، فرانکو کے مفادات میں جرمنی نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ تاہم برطانیہ اور فرانس نے جنرل فرانکو کی مخالفت کی۔ 1939 میں، جنرل فرانکو جرمنی اور اٹلی کی مدد سے فتح یاب ہوا۔

بالآخر پولینڈ پر جرمنی کے حملے سے دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ ابتدا میں مسولینی نے جرمنی کا ساتھ نہیں دیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ جرمنی نے بیلجیئم اور فرانس میں فتوحات حاصل کر لی، تو 10 جون 1940 کو اس نے اتحادی طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کر دی۔

8.4.9 نسلی پالیسی (Racial Policy)

اپنے اقتدار میں مسولینی نے نسل سے بہت کم دلچسپی ظاہر کی۔ اس نے یقینی طور پر یہودی مخالف پالیسی کی کوئی علامت نہیں دکھائی۔ اس نے صیہونیت کی حوصلہ افزائی کی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ انگریزوں کو شرمندہ کرنے کے لیے مفید ہو سکتا تھا۔ فسطائی پارٹی کے بہت سے سرکردہ ارکان یہودی تھے۔ وہ نازیوں کی یہود پالیسی کی بہت تنقید کرتے تھے۔ دوسری طرف اس نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ بعض نسلیں دوسروں سے برتر ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ اطالویوں کا تعلق آریائی نسل سے ہے جو اسپینی، یونانیوں اور افریقیوں سے برتر ہیں۔ وہ اس بات کے بارے میں زیادہ فکر مند دکھائی دیتے تھے کہ رومی سلطنت کے دور میں بہت سارے غلام اٹلی میں لائے گئے تھے۔ وہ اس بارے میں فکر مند تھے کہ ان کی اولاد نے خالص آریائیوں کے ساتھ کئی نسلوں سے شادیاں کیں، جس سے اطالوی قومی کردار کا غلط تاثر سامنے آجاتا ہے۔ ستمبر 1937 کے آخر میں اس نے کہا کہ اٹلی میں یہودیوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہے، اور اس وقت اٹلی میں یہودیوں کی کل تعداد صرف ستر ہزار تھی۔ تاہم، 1939 کے موسمِ گرما میں، مسولینی نے نازیوں کی طرح یہودی مخالف قوانین اجرا کیے۔ ان کے پہلے اعلانات کے پیش نظر اکثر لوگ اس اچانک تبدیلی سے چونک گئے۔ تبدیلی کے وجوہات سادہ تھے۔ 1935 میں ابیسینیا پر اطالوی حملے کے بعد فرانس اور برطانیہ کی مخالفت اور اٹلی پر اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کی وجہ سے مسولینی ہٹلر کے ساتھ اتحاد کرنے میں مجبور ہو گیا۔ 1936 میں اس نے ہٹلر کے ساتھ روم۔ برلن معاہدہ کیا؛ اور 1937 میں اس نے جرمنی اور جاپان کے ساتھ اینٹی کمینٹرن سمجھوتا میں شمولیت اختیار کی، جو کمیونزم کے خلاف تھا۔ 1937 میں جرمنی کے چار روزہ دورے کے بعد مسولینی نے اٹلی کو جرمنی کے ساتھ منسلک ہونے کی سیاسی ضرورت کو محسوس کیا۔ پالیسی میں تبدیلی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس طرح مسولینی افریقہ میں مزید نوآبادیاں حاصل کریں۔ بالآخر، جولائی 1938 میں *Charter of Race* شائع ہوا جس میں دعویٰ کیا گیا کہ عربی، افریقی اور یہودی آریوں سے کمتر ہیں۔

8.4.10 اطالوی فسطائیت کی تشخیص (An Assessment of Italian Fascism)

فسطائیت اٹلی میں آج بھی ایک متنازعہ موضوع کی حیثیت کا حامل ہے، جہاں اس کی ذاتی تجربات کی یادیں آج بھی موجود ہیں۔ فسطائی دور کی دو تشریحات ہیں:

- یہ اطالوی تاریخ میں ایک عارضی گمراہی تھی۔ اس عمل کا ذمہ دار صرف مسولینی تھا۔ اے۔ کیسلز (A. Cassels) اسے بینیٹو مسولینی کے ذریعے اطالوی قوم پر اعتماد کی ایک بہت بڑی چال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔
- اطالوی تاریخ میں فسطائیت قدرتی طور پر پروان چڑھا؛ اور حالات نے فسطائیت کے عروج اور کامیابی کو تشکیل دیا۔

زیادہ تر مورخین اب دوسرے نظریہ کو قبول کرتے ہیں، کہ فسطائیت کی جڑیں روایتی اطالوی معاشرے میں پیوست ہیں اور یہ تحریک پہلی عالمی جنگ کے بعد کے حالات میں پھل پھول گئی۔ اطالوی مورخ رینزو ڈی فیلیس (*Renzo de Felice*) نے دلیل دی کہ فسطائیت بنیادی طور پر 'ایک ابھرتے ہوئے متوسط طبقے' کی تحریک تھی، جو روایتی اور آزاد خیال حکمران طبقے کے اقتدار کو چیلنج کرنا چاہتی

تھی۔اس نے دعویٰ کیا کہ اس تحریک نے اٹلی کی معیشت کو جدید بنانے کے لئے بہت کامیابی حاصل کی۔دوسری طرف برطانوی مورخ مارٹن بلنک ہورن(Martin Blinkhorn)معیشت سے متعلق دعوے کو قبول نہیں کرتا ہے،اور دلیل دیتا ہے کہ ڈی فیلیس نے فسطائیت کے منفی اور ظالمانہ پہلو کو نظر انداز کیا ہے۔اطالوی مورخین کے حالیہ رجحان نے مسولینی کو ایک ایسے متاثر کن رہنما کے طور پر پیش کیا ہے، جنہوں نے دوسری عالمی جنگ میں شامل ہونے تک کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ برطانوی مصنف نکولس فیرل مسولینی کی سوانح عمری (*Mussolini: A New Life*)میں استدلال کرتی ہے کہ مسولینی ایک عظیم انسان کے طور پر یاد کیے جانے کے مستحق ہیں۔وہ دعویٰ کرتی ہے کہ مسولینی نے نہ صرف اٹلی کو لا قانونیت اور کمیونسٹ بغاوت سے بچایا بلکہ اطالوی عوام کو بہت فائدہ پہنچایا اور ان کا معیارِ زندگی بہتر کیا۔ان کی ایک اور کامیابی یہ بھی تھی کہ اس نے رومن کیتھولک چرچ اور ریاست کے درمیان تاریخی جھگڑے کا خاتمہ کیا، جو دوسری عالمی جنگ کے بعد بھی جاری رہا۔

8.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

فسطائیت اور نازیت کا عروج ایک عارضی رجحان تھے لیکن اس نے دنیا کی تاریخ پر تباہ کن اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔یہ دونوں طاقتیں دو عالمگیر جنگوں کے درمیان بین الاقوامی افق پر ابھر آئے۔دونوں نے آمریت کا سہارا لیتے ہوئے پورے یورپ کو دوسری عالمی جنگ کے لپیٹ میں لا لیا۔اس نے نظریہ قوم کو دیوتا کا درجہ دیا اور قوم کو ایک جاندار ہستی کے طور پر پیش کیا جس کا مقصد افراد کی فلاح و بہبود سے بالا تر تھا۔ان نظریات کے مطابق حقوق سے زیادہ اہم وہ فرائض ہیں جو ایک فرد کو ملک یا قوم کے لئے ادا کرنے چاہیے۔ایک عضلاتی اور عسکری قوم پرستی، علاقائی توسیع کے لیے جنگ کی تیاری، نسل پرستی اور نسلی برتری کے نظریے میں فطری اعتقاد، دیگر ممالک کی تباہی اور 'دوسروں' (نازی جرمنی کے معاملے میں یہودی) سے نفرت فسطائیت اور نازیت کی خصوصیات تھیں۔الغرض، دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ فسطائیت اور نازیت کے نظریات کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا، جس کے بعد ہی دنیا نے راحت کی سانس لے لی۔

8.6 کلیدی الفاظ (Key Words)

گیسٹاپو(Gestapo)	:	جرمن خفیہ پولیس
کرپس(Krupps)	:	جرمنی کی کارپوریشنیں
فوہرر	:	اعلیٰ ترین رہنما، سپریم لیڈر
فسطائیت	:	فسطائیت ایک سیاسی فلسفہ یا ایک تحریک ہے جو ایک آمرانہ رہنما کی سربراہی میں ملک کو افراد سے بالاتر کرتی ہے۔

8.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ورسائی معاہدہ کس سال میں طے ہوا؟
2. اٹلی میں فسطائی ریاست کا قیام کب عمل میں آیا؟
3. عظیم مالی بحران کب واقع ہوا؟
4. *Mein Kamph* کس نے لکھی ہے؟
5. فوہررسے کیا مراد ہے؟
6. ریشاخ کسے کہتے ہیں؟
7. دوسری عالمگیر جنگ کب شروع ہوئی؟
8. 1915 کا لندن معاہدہ کس کے درمیان طے ہوا؟
9. اٹلی کس سال میں دوسری عالمگیر جنگ میں شامل ہوگیا؟
10. *Mussolini: A New Life* کس نے لکھی ہے؟

8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. نازیت کے ظہور کے اسباب بیان کیجئے۔
2. فسطائی نظریے کے بنیادی عناصر کیا تھے۔
3. آپ اس بات سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں کہ اقتصادی صورتحال کے بجائے سیاسی سازش نے ہٹلر کو جنوری 1933 میں اقتدار میں آنے کے قابل بنایا۔
4. 1933 سے 1939 کے درمیان جرمنی کی سیاسی فتوحات پر ایک مضمون لکھئے۔
5. مسولینی کی خارجہ پالیسی پر نوٹ لکھئے۔

8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. 1933 سے 1939 کے درمیان ہٹلر نے نازی جرمنی میں سیاسی، معاشی اور سماجی انقلاب برپا کیا۔ بحث کیجئے۔
2. نازیت کے عروج کے اسباب پر ایک تفصیلی روشنی ڈالئے۔
3. مسولینی کی اقتصادی پالیسی پر بحث کیجئے۔

8.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Blinkhorn, M., *Mussolini and Fascist Italy*, Routledge, 2006.
2. Bosworth, R.J.B., *Mussolini*, Bloomsbury, 2011.
3. Carsten, F.L. *The Rise of Fascism*, Methuen, London, 1967.
4. De Felice, R., *Interpretations of Fascism*, Harvard University Press, 1977.
5. Dev, Arjun and Indira Arjun Dev, *History of the World from Late Nineteenth to the Early Twenty-First Century*, Orient Black Swan, 2009.
6. Farrell, N., *Mussolini: A New Life*, Phoenix, 2005.
7. Griffin, Roger D., *The Nature of Fascism*, Routledge, London, 1993.
8. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
9. Kershaw, Ian, *The Nazi Dictatorship*, Edward Arnold, London, 1993.
10. Laqueur, W. ed., *Fascism: A Reader's Guide*, Harmondsworth, Penguin 1979.
11. Lowe, Norman., *Mastering the Modern World History*, Palgrave, Macmillan, 1982.
12. Mathur, L.P., *Twentieth Century World*, Avishkar Publishers & Distributors, Jaipur, 2004.
13. Nester, William R., *Globalization: A Short History of the Modern World*, Palgrave, Macmillan, 2010.
14. Overy, R., *The Inter-War Crisis, 1919–1939*, Longman, 1994.
15. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.

اکائی 9۔ دوسری عالمی جنگ کے اسباب اور اثرات

(Causes and Effects of the Second World War)

اکائی کی اجزا

9.0 تمہید
9.1 مقاصد
9.2 دوسری عالمی جنگ
9.3 دوسری عالمی جنگ کی ابتداء
9.4 دوسری عالمی جنگ کے اسباب
9.5 دوسری عالمی جنگ کی واقعات
9.6 دوسری عالمی جنگ کے نتائج
9.7 دوسری عالمی جنگ کے اثرات
9.8 دوسری عالمی جنگ میں ہندوستان کا تعاون
9.9 دوسری عالمی جنگ کے بعد واقعات
9.10 اکتسابی نتائج
9.11 کلیدی الفاظ
9.12 نمونہ امتحانی سوالات
9.12.1 معروضی سوالات کے حامل جوابات
9.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
9.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید (Introduction)

دوسری عالمی جنگ، جو 1939 سے 1945 تک جاری رہی، ایک عالمی تنازعہ تھا جس نے جغرافیائی سیاسی منظر نامے کو نئی شکل دی اور پوری دنیا میں اس کے گہرے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی اثرات سامنے آئے۔ اس جنگ میں دنیا کے ملکوں کی اکثریت شامل تھی اور اس میں ہولوکاسٹ، ایٹم بموں کا استعمال، اور متعدد محاذوں پر بڑی لڑائیوں سمیت اہم واقعات شامل تھے۔ 20 ویں صدی کی تاریخ کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے دوسری عالمی جنگ کے اسباب کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ یہ تنازعہ پہلی عالمی جنگ کے حل نہ ہونے والے مسائل کے امتزاج سے پیدا ہوا، خاص طور پر معاہدہ ورسائی کی تعزیراتی شرائط، عظیم کساد بازاری سے معاشی عدم استحکام، اور جرمنی، اٹلی اور جاپان میں مطلق العنان حکومتوں کا عروج۔ ان عوامل نے ایک غیر مستحکم ماحول پیدا کیا جہاں جارحانہ توسیع پسندانہ پالیسیاں آمرانہ لیڈروں کی طرف سے چلائی گئیں، جو بالآخر بڑے پیمانے پر تنازعات کا باعث بنیں۔ دوسری عالمی جنگ کے اثرات بھی اتنے ہی دور رس تھے، جس کے نتیجے میں لاکھوں جانوں کا ضیاع، بے مثال تباہی، اور اہم سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، جن میں امریکہ اور سوویت یونین کا عظیم طاقت بن کر ابھرنا بھی شامل ہے۔ مزید برآں، جنگ نے نوآبادیات، انسانی حقوق کی وکالت، اور مستقبل کے تنازعات کو روکنے کے لیے بین الاقوامی اداروں کے قیام کی جانب تحریکوں کو متحرک کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے اسباب اور اثرات کی یہ کھوج تاریخی واقعات کے باہمی ربط اور عصری عالمی تعلقات پر ان کے دیرپا اثر کو اجاگر کرتی ہے۔ تاریخ کے اس اہم لمحے کو سمجھنا سیکھے گئے اسباق کو تسلیم کرنے اور دنیا میں امن واستحکام کو فروغ دینے کے لیے جاری چیلنجز کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ

- دوسری عالمی جنگ کیا ہے؟ اس کو سمجھ پائیں گے۔
- دوسری عالمی جنگ کی ابتدا سے واقفت حاصل کریں گے۔
- دوسری عالمی جنگ کی وجوہات کے ساتھ اس کے فوری وجہ سے بھی روبرو ہوں گے۔
- جنگ کے طویل مدتی نتائج سے بھی واقف ہوں گے۔
- دوسری عالمی جنگ کے اثرات کی معلومات حاصل کریں گے۔

9.2 دوسری عالمی جنگ (The Second World War)

یہ دنیا کی سب سے زیادہ تباہ کن جنگوں میں سے ایک تھی۔ اس کا اثر عالمی سطح پر پڑا۔ یہ آگ صرف یورپ تک محدود نہیں تھی بلکہ پوری دنیا کو گھیرے میں لے چکی تھی۔ یہ 1939 سے 1945 کے عرصے میں ہوئی تھی۔ دوسری عالمی جنگ 20 ویں صدی کا سب سے اہم

دور تھا(Dennis Cove, 2002)۔یورپ میں جنگ یکم ستمبر 1939 کو نازی جرمنی کے پولینڈ پر حملے کے ساتھ شروع ہوئی اور 2 ستمبر 1945 کو آخری محور ملک جاپان کے سرکاری ہتھیار ڈالنے کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ بہر حال، ایشیا میں جنگ کا آغاز پہلے چین میں جاپانی مداخلتوں سے ہوا، اور یورپ میں، یہ جنگ پہلے 8 مئی 1945 کو جرمنی کے غیر مشروط ہتھیار ڈالنے کے ساتھ ختم ہوئی۔اور بڑی بحری لڑائیوں کا ایک سلسلہ۔اس نے ٹیکنالوجی میں بڑے پیمانے پر اضافہ کیا اور اس کی بنیاد رکھی جس نے جنگ کے بعد کی سماجی تبدیلیوں کی اجازت دی جس میں یورپی نوآبادیت کا خاتمہ، ریاستہائے متحدہ میں شہری حقوق کی تحریک اور خواتین کے حقوق کی جدید تحریک کے ساتھ ساتھ بیرونی خلا کی تلاش کے پروگرام شامل ہیں۔ .اس جنگ میں دنیا دو گروہ میں تقسیم ہوگئی تھی پہلا محور ممالک(Axis Power) جس میں نازی جرمنی، فسطائی اٹلی، امپیریل جاپان اور ان کے چھوٹے اتحادی شامل تھے اور دوسرا گروہ اتحادی ممالک کا تھا، جن کی قیادت برطانیہ اور اس کی دولت مشترکہ ممالک، سوویت سوشلسٹ جمہوریہ کی یونین اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کر رہے تھے۔اس جنگ کے فاتح اتحادی تھے۔دو عالمی طاقتیں، USA (United State of America) اور USSR(Union of Soviet Socialist Republics)دوسری عالمی جنگ سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔لیکن آگے چل کر ان دو ممالک کے درمیان عظیم طاقت ثابت کرنے کے لئے سرد جنگ کا سبب بنا۔اس میں دنیا کے بیشتر بڑے ممالک شامل تھے جو دو مخالف قوتوں میں بٹے ہوئے تھے: اتحادی اور محور۔ یورپ کے علاوہ بحرالکاہل میں، جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلوں، روس کے میدانی علاقوں اور افریقہ کے صحراؤں میں مصروفیات لڑی گئیں۔ جنگ کے دوران مجموعی طور پر 100 ملین سے زیادہ فوجی جوان متحرک ہوئے۔

9.3 دوسری عالمی جنگ کی ابتداء (Beginning of the Second World War)

دوسری عالمی جنگ 1939 میں شروع ہوئی۔یکم ستمبر کو جرمنی نے پولینڈ پر مغرب سے حملہ کیا اور سوویت یونین نے بھی مشرق سے پولینڈ پر حملہ کیا۔نتیجے کے طور پر، برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا لیکن پولینڈ کو نہ بچا سکے۔اس کے بعد جرمنی نے مغربی پولینڈ پر قبضہ کر لیا اور یو ایس ایس آر نے مشرقی پولینڈ کا کنٹرول سنبھال لیا۔ جلد ہی، 1940 میں، اس نے بالٹک قوم ایسٹونیا، لٹویا اور لتھوانیا کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

پولینڈ کے علاقے: 1940 کی دہائی کے اوائل میں، پولینڈ پر حملہ کرنے کے بعد، ہٹلر نے ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کیا۔اس نے ناروے پر اس لیے حملہ کیا کہ کیونکہ وہاں سے وہ فن لینڈ پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے بیلجیم اور ہالینڈ پر بھی حملہ کیا۔وہ جرمنی کی Blitzkrieg مہم کا شکار ہو گئے۔Blitzkrieg ایک جنگی حربہ ہے، جو ایک تیز، اچانک فوجی حملہ ہے، جو عام طور پر زمینی افواج کو فضائی مدد کے ساتھ ملاتا ہے۔ بیلجیئم اور ڈنمارک کو فتح کرنے میں چند دن اور نیدرلینڈز کو فتح کرنے میں چند ہفتے اور ناروے کو ایک مہینہ لگا۔یو ایس ایس آر نے 'مولوٹوف معاہدے' کا استعمال کرتے ہوئے بالٹک ریاستوں اور فن لینڈ پر قبضہ کر لیا۔ پھر، اٹلی بھی شامل ہو گیا اور جون میں فرانس پر حملہ کر دیا۔ جرمنی نے 10 جون کو فرانس پر حملہ کیا اور 14 جون کو پیرس گر گیا۔ جرمنی نے کئی مہینوں تک مسلسل فضائی بمباری کے ذریعے برطانیہ کے کئی شہروں جیسے لندن، برمنگھم وغیرہ پر حملہ کیا۔اسے بلٹز کہا جاتا تھا۔اس حملے کے پیچھے مقصد برطانیہ کو امن معاہدے پر دستخط کروانا تھا جو

نہیں ہوا۔ چند مہینوں کے بعد، برطانیہ نے اس حملے کو کامیابی سے منسوخ کر دیا۔ یہ برطانیہ کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اس سے پہلے برطانیہ کا خیال تھا کہ کوئی بھی ان کے وطن پر براہ راست حملہ نہیں کر سکتا لیکن ہٹلر کے قیادت میں جرمنی نے ایسا کیا۔

جرمنی، اٹلی اور جاپان کا سہ فریقی معاہدہ: اس معاہدے کو مضبوط بنانے کے لیے جرمنی نے اٹلی اور جاپان کے ساتھ ایک مشترکہ معاہدہ کیا۔ یہ ممالک Axis Powers کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد میں ہنگری، بلغاریہ اور رومانیہ بھی محوری طاقت میں شامل ہو گئے۔ 1941 میں، مصر سے برطانوی افواج نے لیبیا میں اطالویوں کو پیچھے دھکیل دیا، لیکن بعد میں جرمن کمک پہنچی اور انگریزوں کو مصر واپس بھیج دیا۔ پھر جرمنی نے یوگوسلاویہ اور یونان پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ جرمنی نے پورے وسطی اور جنوبی یورپ کو زیر کر لیا۔

آپریشن بار باروسا: محوری طاقت نے جون 1941 میں یو ایس ایس آر پر حملہ کیا حالانکہ سوویت یونین کے ساتھ اُن کا امن معاہدہ تھا، پھر بھی ہٹلر نے اس پر حملہ کیا۔ کیونکہ، وہ Lebensraum میں رہنے کی جگہ چاہتا تھا جب سے جرمنی وسیع ہو رہا تھا، اُسے فصلیں اگانے کے لیے مزید زمین کی درکار تھی۔ چنانچہ اس نے 1941 میں 'آپریشن بار بروسا' (Operation Barbarossa) شروع کیا۔ اسے زمینی فوج کا اب تک کا سب سے بڑا آپریشن سمجھا جاتا ہے۔ اس نے جون میں حملہ شروع کیا، لیکن اکتوبر۔ نومبر آتے تک وہ سب کچھ نہیں جیت سکے، اور جب روس میں سخت سردی پڑی تو جرمن فوج جھک گئی، اور 1941 کے آخر تک تعطل کا شکار ہو گیا۔

بحر الکاہل کی جنگ: جاپان نے 1940 تک ساحلی چین کے بڑے حصوں کو فتح کر لیا تھا۔ محوری طاقت میں شامل ہونے کے بعد جاپان نے چین میں مغربی نوآبادیوں پر حملے شروع کر دیے۔ فرانس اور برطانیہ کی ایشیا میں مختلف نوآبادیاں تھیں جیسے ہانگ کانگ، برما، فلپائن، انڈوچائنا (ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا)، گوام، انڈونیشیا (ڈچ ایسٹ انڈیز) اور سنگاپور (برطانیہ کی کالونی)۔ اس وقت امریکہ نے جاپان کو تیل کی سپلائی روک دی تھی۔ اس نے ایمبارگو لگا دیا تھا۔ اس پابندی کی وجہ سے جاپان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ جاپان کو خطرہ تھا کہ اگر امریکہ جنگ میں داخل ہوا تو وہ براہ راست ان پر بحر الکاہل میں حملہ کر دے گا۔ چنانچہ اس کو روکنے کے لیے جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا۔

پرل ہاربر حملہ: امریکہ اور برطانیہ کی بحری طاقت کو کمزور کرنے کے مقصد سے، جاپان نے 8-7 دسمبر 1941 کو متعدد مقامات پر حملہ کیا۔ اس نے پرل ہاربر (ہوائی)، ملائیشیا، فلپائن اور ہانگ کانگ جیسے مقامات پر حملہ کیا۔ پرل ہاربر حملہ امریکی سرزمین پر اب تک کا سب سے بڑا حملہ تھا۔ تقریباً 2500 فوجی مارے گئے۔ جاپان نے برطانیہ کی نوآبادیوں آسٹریلیا اور پاپوانیو گنی پر بھی بمباری کی۔ اس کے بعد امریکہ اتحادی افواج کے شانہ بشانہ جنگ میں داخل ہوا۔

1942 میں امریکہ کا جنگ میں شامل ہونا: امریکہ اور جاپان کے درمیان بحر الکاہل اور جنوب مشرقی ایشیا کے جزائر میں 44-1942 تک متعدد لڑائیاں ہوئیں جاپان مڈوے اور بعد میں گواڈالکینال کی اہم جنگ میں ہار گیا۔ اس نے جاپان کے خلاف لہر کا رخ موڑ دیا۔ جوار 1942 میں بدل گیا۔ 1942 تک، محوری طاقت پورے یورپ کے کنٹرول میں تھی۔ لیکن پھر، لہر بدل گئی۔ روسیوں نے جرمنوں کو پیچھے دھکیلنا

شروع کر دیا۔ مشرقی محاذ پر بہت زیادہ جانی نقصان ہوا اور بہت سے جنگی جرائم ہوئے۔ سوویت یونین کی فوج نے لینن گراڈ (سینٹ پیٹرز برگ)اور اسٹالن گراڈ (وولگو گراڈ) سے جرمنوں کو پیچھے دھکیل دیا اور وہاں سے یو ایس ایس آر کی فتح شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ اس نے مشرقی یورپ کے کچھ علاقوں کو بھی فتح کر لیا۔ اتحادیوں نے لیبیا سے جرمنوں اور اطالویوں کو بھی پیچھے دھکیل دیا۔ امریکی فوج نے مراکش پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے مصر پر حملہ کیا۔ تیونس بالآخر 1943 میں جیت لیا گیا۔

9.4 دوسری عالمی جنگ کے اسباب (Causes for the Second World War)

اگرچہ متعدد واقعات نے براہ راست تنازعہ میں شرکت کیا، لیکن بنیادی وجوہات بہت زیادہ پیچیدہ اور جاری تنازعہ کا موضوع ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے لیے مختلف اسباب تھیں جن کی تفصیل ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

1. ورسائی کا غیر منصفانہ معاہدہ (Treaty of Versailles,1919)

پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد اتحادی طاقتوں نے جرمنی کو ورسائی کے معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا، معاہدے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرانس نے جرمنی سے انتقام لیا۔ اس نے اگلے 20 سال تک جرمنی کو رسوا کیا۔ اس معاہدے کے تحت جرمنی نے اپنے علاقوں کو کھو دیا اور ساتھ ہی ایک بڑی فوج رکھنے کی بھی ممانعت بھی ہو گئی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جرمنی کو جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا وہ جرمنی میں شدید قوم پرستی (Ultra-Nationalism) کو پھیلانے کا باعث بنا۔

2. سامراج کے مطالبات (Demands of Imperialism)

نئے سامراجی، جیسے جاپان اور جرمنی، افریقہ اور ایشیا میں وسائل اور مختلف علاقوں کے لیے پرانی سامراجی قوموں جیسے برطانیہ، فرانس وغیرہ سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔

3. لیگ آف نیشنز کی ناکامی (Failure of the League of Nations)

یہ پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد 1919 میں فوجی جارحیت کو روکنے کے ارادے سے لیگ آف نیشنس کو تشکیل دیا گیا تھا، اس تنظیم کا یہ بھی مقصد تھا کہ اس کے تمام ممبران اور مختلف اقوام کے درمیان تنازعات جارحیت کے بجائے مذاکرات کے ذریعے طے کیے جائیں۔ لیگ آف نیشن اقوام کے درمیان تنازعات کو حل کرنے میں ناکام رہی کیونکہ اٹلی نے ایتھوپیا پر حملہ کیا اور جاپان نے چین میں منچوریا پر حملہ کیا اور اس کے علاوہ دنیا کے تمام ممالک لیگ میں شامل نہیں ہوئے۔

4. 1929 کی عظیم کساد بازاری (The Great Depression of 1929)

یہ صنعتی دنیا کی تاریخ کی بدترین معاشی تباہی تھی جس نے یورپ اور ایشیا میں اپنا راستہ مختلف طریقے سے لیا۔ یورپی ممالک جیسے جرمنی، اٹلی اور اسپین میں، سیاسی طاقت مطلق العنان سے سامراجی حکومت کی طرف منتقل ہو گئی، جبکہ ایشیا میں کم جاپان نے چین پر حملہ کر کے

اور بحر الکاہل کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرکے ایک جارحانہ توسیع پسندانہ پالیسی کا انتخاب کیا۔

5. جاپان میں سامراج کا عروج (Rise of Imperialism in Japan)

جاپان بہت جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔ تائیوان 1895 میں جاپان کی پہلی کالونی بنا۔ 1931 میں جاپان نے چین کے منچوریا کے علاقوں اور بحر الکاہل کے آس پاس کے تمام جزائر پر حملہ کر دیا۔ ایشیا میں جنگ بنیادی طور پر 1937 کی دوسری چین-جاپانی جنگ کی وجہ سے شروع ہوئی تھی۔ ان کا تعلق امریکہ ہے، چنانچہ جاپان کے پرل ہاربر پر حملے کے ایک دن بعد، 8 دسمبر 1941 کو امریکہ نے جاپان کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔

6. ہٹلر اور NSDAP کا عروج (Rise of Hitler and Nazism)

نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی، جسے عام طور پر 'نازی پارٹی' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، سامی مخالف (یہود مخالف)، مارکسسٹ مخالف تھی، آریائی نسل کی برتری پر یقین رکھتی تھی، اور یہ کہ دیگر تمام نسلوں کو خارج کر دیا جانا چاہیے۔ ہٹلر جنوری 1933 میں جرمنی کا چانسلر (PM) بنا، اگرچہ وہ منتخب ہو گیا تھا، لیکن یہ مکمل اکثریت نہیں تھی، بلکہ پارلیمنٹ کو لٹکا دیا گیا، پھر بھی اسے حکومت بنانے کے لیے بلایا گیا، اور آہستہ آہستہ وہ ایک آمر میں تبدیل ہو گیا۔ ورسائی کے معاہدے کے بعد جرمنی کو اپنی فوج بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ہٹلر نے ایک بہت بڑی فوج اور فضائیہ بنانا شروع کر دی۔ اس نے یہودیوں کے لیے خاص علامتیں مختص کیں تاکہ وہ بڑے پیمانے پر فرق کر سکیں۔ اس نے فادر لینڈ کی شان کو بحال کرنے کا بھی اعلان کیا۔ اس طرح کے اُٹھائے گئے قدم نے بھی دوسری عالمی جنگ کی وجہ بنی۔

9.5 دوسری عالمی جنگ کی واقعات (Events of Second World War)

دوسری عالمی جنگ کا باعث بننے والے اہم واقعات: وہاں بعد کے بڑے واقعات رونما ہوئے جو دوسری عالمی جنگ کا باعث بنے۔ 1936 کے آس پاس کے واقعات: ہٹلر نے رائن لینڈ کو دوبارہ ملٹرایئز کیا، حالانکہ ورسائی کے معاہدے کے مطابق، اس علاقے کو عسکری شکل نہ دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، کیونکہ یہ فرانس کے لیے خطرہ تھا۔ اٹلی اور جرمنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسے روم-برلن ایکسس کہا جاتا ہے، اس واقعہ سے Axis Power کا نام تصویر میں آیا۔ بعد میں جرمنی نے جاپان کے ساتھ بھی معاہدہ کیا۔

1938 جرمن الحاق: ہٹلر نے آسٹریا کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا، اور اس عمل کو Anschluss کہا گیا۔ ہٹلر نے دعویٰ کیا کہ آسٹریا تاریخی طور پر جرمنی کا حصہ رہا ہے۔ اس کو کبھی بھی مختلف ملک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ مصنوعی طور پر پہلی عالمی جنگ کے بعد بنایا گیا تھا۔ لہذا، اس نے آسٹریا کو دوبارہ جرمنی کا حصہ بنانے کا مطالبہ کیا۔ شروع میں یہ ایک بغیر خون خرابے کی بغاوت تھی۔ آسٹریا کے لوگوں نے ہٹلر کا استقبال کیا۔ سوئز لینڈ کو جرمنوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ یہ چیکوسلواکیہ اور جرمنی کی سرحد پر پڑا تھا اور ہٹلر نے اس علاقے پر بھی دعویٰ کیا تھا۔

اتحادی ممالک نے سوچا کہ یہ صرف 1-2 ممالک کی بات ہے اور پھر ہٹلر خاموش رہے گا۔ وہ آسٹریا جیسے چھوٹے ملک کے لیے جنگ نہیں چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے ہٹلر کو ایسا کرنے سے نہیں روکا۔ اس سے ہٹلر کو لگنے لگا کہ تھا کہ برطانیہ اور فرانس کمزور ہیں اور وہ جنگ نہیں چاہتے۔

1938 کے آس پاس کے واقعات: ہٹلر نے سوئزلینڈ کو ضم کرنے کے بعد مارچ 1939 میں پورے چیکوسلواکیہ پر حملہ کر کے اسے بھی فتح کر لیا۔ پھر بھی کسی ملک نے ہٹلر کے خلاف کچھ بھی نہیں کہا اب ہٹلر کا اگلا ہدف پولینڈ تھا۔ لیکن اسے برطانیہ اور فرانس نے تحفظ فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جرمنی اور سوویت یونین کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جسے Molotov Ribbentrop Pact کہا جاتا ہے، جس کے ذریعے USSR جنگ میں جرمنی کی مدد کرنے کا پابند تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر اسے برطانیہ اور فرانس کے خلاف جنگ میں جانا پڑے گا۔

9.6 دوسری جنگ عظیم کے نتائج (Consequence of the Second World War)

اس جنگ سے جو سب سے بڑا نقصان ہوا وہ جانی نقصان تھا۔ امریکہ کی جانب سے جاپان کے ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کو انسانی تہذیب کی تاریخ کا سب سے ظالمانہ، تباہ کن اور دردناک واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی نسلیں بھگت رہی ہیں اور کئی بھگتنے والی ہیں، اس لیے اس کے بعد اس پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ لیکن پھر بھی جنگ کے دوران کل 12 ملین فوجی مارے گئے، جب کہ 25 ملین شہری بھوک، بیماری وغیرہ کی وجہ سے مر گئے۔ اس جنگ میں 24 ملین لوگ زخمی اور معذور ہوئے۔ جاپان پر امریکی بمباری کے نتیجے میں 160,000 ہلاکتیں ہوئیں۔ اس طرح دوسری عالمی جنگ بنی نوع انسان کے لیے ہر لحاظ سے بہت تباہ کن جنگ ثابت ہوئی۔ تاہم دوسری عالمی جنگ کے دوران شہریوں کی ہلاکتوں کی اصل تعداد کبھی معلوم نہیں ہو سکی۔ ان میں سے بہت سی اموات بم دھماکوں، قتل عام، بھوک اور دیگر جنگی سرگرمیوں کی وجہ سے ہوئیں۔ ہٹلر کے الٰہی "حتمی حل" کے ایک حصے کے طور پر نازی حراستی کیمپوں میں 6 ملین تک یہودیوں کو ہلاک کیا گیا، ایک اندازے کے مطابق 60-45 ملین لوگ اس میں مارے گئے جسے اب ہولوکاسٹ (Holocaust) کہا جاتا ہے۔ جبکہ سوویت یونین کے 70 لاکھ فوجی زخمی ہوئے۔

اتحادیوں نے بین الاقوامی امن کو برقرار رکھنے کی کوشش کے لیے اقوام متحدہ کا قیام کیا۔ یہ باضابطہ طور پر 24 اکتوبر 1945 کو وجود میں آیا۔ یورپ میں، براعظم کو بنیادی طور پر مغربی اور سوویت زونز کے درمیان نام نہاد آئرن پردے کے ذریعے تقسیم کیا گیا تھا، جو ماتحت آسٹریا اور اتحادی جرمنی کو تقسیم کرتا تھا۔ ایشیا میں، امریکہ نے جاپان پر قبضہ کر لیا اور مغربی بحرالکاہل میں اپنے سابقہ جزائر آباد کر لیے۔ سوویت یونین نے سخالین اور کریل جزائر پر قبضہ کر لیا۔ جاپانی حکمرانی والا کوریا دو طاقتوں کے درمیان تقسیم اور قابض تھا۔ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان کشیدگی جلد ہی امریکہ کی قیادت میں نیٹو (NATO) اور سوویت کی قیادت میں وارسا معاہدہ (The Warsaw Pact) کے فوجی اتحاد کی تشکیل اور ان کے درمیان سرد جنگ کے آغاز تک پہنچ گئی۔

عوامی جمہوریہ چین سرزمین پر قائم ہوا جبکہ قوم پرست قوتوں نے تائیوان میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ یونان میں کمیونسٹ قوتوں اور اینگلو امریکن حمایت یافتہ شاہی قوتوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی جس میں شاہی قوتوں کو فتح حاصل ہوئی۔ کوریا میں، جنوبی کوریا کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جسے مغربی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی، اور شمالی کوریا، جسے سوویت یونین اور چین کی حمایت حاصل تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جنگ کے دوران نازی حراستی کیمپوں میں لگ بھگ 60 لاکھ یہودی مارے گئے تھے۔ اور ہزاروں رومیوں کو قتل کیا گیا جن میں ذہنی اور جسمانی طور پر معذور بھی شامل تھے۔ اس جنگ میں زمین کا بہت زیادہ نقصان ہوا، ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں تقریباً 1000 ارب ڈالر خرچ ہوئے، جس میں صرف امریکہ نے 350 ارب ڈالر خرچ کیے۔ اس جنگ میں کئی عمارتیں، سڑکیں، انفراسٹرکچر، جنگی جہاز اور لڑاکا طیارے تباہ ہوئے۔ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں دنیا کے تمام ممالک دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ، جس میں سرمایہ داروں کی قیادت امریکہ جبکہ کمیونسٹوں کی قیادت روس کر رہا تھا۔ انہوں نے عالمی سطح پر ایک دوسرے پر تنقید کرنا شروع کر دی جس کا نتیجہ سرد جنگ کی صورت میں نکلا۔ اور اس سرد جنگ کے دوران دونوں فریقوں نے اپنے اپنے جوہری ہتھیار تیار کیے، جس سے دنیا کو جلد اس کے مہلک نتائج بھگتنے پڑیں گے۔

9.7 دوسری عالمی جنگ کے طویل مدتی نتائج

(Long-term Consequence of the Second World War)

دوسری عالمی جنگ کے دور رس اثرات تھے جو 1945 میں اپنے اختتام سے آگے بڑھ گئے۔ ان طویل مدتی نتائج نے بین الاقوامی تعلقات کو نئی شکل دی، معاشی ترقی کو متاثر کیا، اور پوری دنیا میں سماجی حرکیات کو تبدیل کیا۔ عصری عالمی مسائل کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے ان اثرات کو سمجھنا ضروری ہے۔

1. جغرافیائی سیاسی تبدیلیاں اور سرد جنگ (Geopolitical Shifts and the Cold War)

دوسری عالمی جنگ کے سب سے اہم طویل مدتی نتائج میں سے ایک دو سپر پاورز کا ابھرنا تھا: امریکہ اور سوویت یونین۔ اس تبدیلی نے سرد جنگ کا آغاز کیا، نظریاتی، سیاسی اور فوجی دشمنی کا ایک طویل عرصہ۔ اس وقت کے دوران ابھرنے والا دو قطبی عالمی نظام کمیونزم اور سرمایہ داری کے پھیلاؤ کی خصوصیت رکھتا تھا، جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں مختلف پراکسی جنگیں اور علاقائی تنازعات جنم لیتے ہیں۔ یورپ کی مشرقی اور مغربی بلاکس میں تقسیم، جس کی مثال لوہے کے پردے نے دی، بین الاقوامی تعلقات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ 1949 میں نیٹو (نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن) کا قیام اور 1955 میں وارسا معاہدے نے اس تقسیم کو ادارہ جاتی شکل دی، جس کے نتیجے میں کئی دہائیوں کی کشیدگی اور تنازعات پیدا ہوئے۔ سرد جنگ نے خارجہ پالیسیوں، فوجی حکمت عملیوں اور اتحادوں کو متاثر کیا، جس نے افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ممالک کے سیاسی منظر نامے کو تشکیل دیا۔

2.عدم نوآبادیت اور قومی آزادی (Decolonisation and National Independence)

جنگ نے دنیا بھر میں غیر آبادکاری کی تحریکوں کو نمایاں طور پر تیز کیا۔ بہت سی یورپی طاقتیں اس تنازعے سے ابھری تھیں جو کمزور پڑی تھیں اور اپنی نوآبادیوں پر کنٹرول برقرار رکھنے میں ناکام رہی تھیں۔ آزادی کی جدوجہد نے زور پکڑا، جس کے نتیجے میں 1940 کی دہائی کے اواخر سے لے کر 1960 کی دہائی کے دوران متعدد نئی قومیں، خاص طور پر افریقہ اور ایشیا میں ابھریں۔ ہندوستان، پاکستان، گھانا، اور متعدد دیگر ممالک نے اپنی خودمختاری پر زور دیا، عالمی سیاسی منظر نامے کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا۔ غیر آبادکاری کی اس لہر نے مواقع اور چیلنج دونوں لائے۔ نئی آزاد قوموں کو نسلی، ثقافتی اور اقتصادی تنوع کے درمیان قوم سازی کے کام کا سامنا کرنا پڑا۔ نوآبادیت کی وراثت، بشمول معاشی انحصار اور سماجی تقسیم، اکثر ان کوششوں کو پیچیدہ بناتی ہے، جس سے تنازعات اور استحکام کے لیے جدوجہد ہوتی ہے جو آج بھی گونج رہی ہے۔

3.انسانی حقوق اور بین الاقوامی قانون(Human Rights and International Law)

دوسری عالمی جنگ کے دوران ہونے والے مظالم، بشمول ہولوکاسٹ، نے انسانی حقوق کے حوالے سے عالمی حساب کتاب کو جنم دیا۔ 1948 میں انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کا قیام بین الاقوامی قانون اور اخلاقیات میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا مقصد دنیا بھر میں انفرادی حقوق اور وقار کا تحفظ کرنا ہے۔ انسانی حقوق پر اس زور نے بین الاقوامی اصولوں، معاہدوں اور تنظیموں کو متاثر کیا ہے جو شہری آزادیوں کے تحفظ اور مستقبل میں ہونے والے مظالم کو روکنے کے لیے وقف ہیں۔ مزید برآں، نیورمبرگ ٹرائلز نے جنگی جرائم، انسانیت کے خلاف جرائم اور نسل کشی کے لیے افراد کو جوابدہ ٹھہرانے کی مثالیں قائم کیں۔ اس قانونی فریم ورک نے بعد کے بین الاقوامی فوجداری قانون کو متاثر کیا، جس کے نتیجے میں مختلف ٹریبونل اور بین الاقوامی فوجداری عدالت (ICC) کا قیام عمل میں آیا۔

4.اقتصادی تبدیلیاں اور عالمگیریت(Economic Transformation and Globalisation)

جنگ کے بعد کے دور میں خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں اہم معاشی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ مارشل پلان، جس نے یورپی ممالک کی تعمیر نو کے لیے اقتصادی امداد فراہم کی، بحالی اور ترقی میں سہولت فراہم کی، بالآخر یورپی انضمام کا باعث بنی۔ اس انضمام نے یورپی یونین کے قیام کی راہ ہموار کی، خطے میں اقتصادی تعاون اور سیاسی استحکام کو فروغ دیا۔ اس کے برعکس، امریکی معیشت دنیا کی سب سے مضبوط، تکنیکی ترقی اور صارفی ثقافت کے طور پر ابھری۔ جنگ کے بعد کی معاشی تیزی نے عالمگیریت میں اضافہ کیا، جس کی خصوصیت بین الاقوامی تجارت، سرمایہ کاری اور ثقافتی تبادلے کی ہے۔ اس باہمی ربط نے دنیا بھر کی معیشتوں، معاشروں اور ثقافتوں پر دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں۔

5.سماجی تبدیلی اور صنفی کردار (Social Changes and Gender Roles)

دوسری عالمی جنگ نے اہم سماجی تبدیلیوں کو بھی متحرک کیا، خاص طور پر صنفی کردار کے حوالے سے۔ جیسے ہی مرد لڑنے کے لیے نکلے، خواتین نے بے مثال تعداد میں افرادی قوت میں شمولیت اختیار کی، کارخانوں، دفاتر اور فوجی خدمات میں کردار ادا کیا۔ اس تبدیلی نے روایتی صنفی اصولوں کو چیلنج کیا اور بعد میں خواتین کے حقوق اور صنفی مساوات کی وکالت کرنے والی تحریکوں کی بنیاد رکھی۔ سماجی ڈھانچے پر

جنگ کا اثر شہری حقوق کی تحریکوں تک بھی پھیلا، خاص طور پر ریاستہائے متحدہ میں۔ افریقی امریکی اور دیگر پسماندہ گروہ جنہوں نے جنگی کوششوں میں حصہ ڈالا، انہوں نے زیادہ سے زیادہ شناخت اور مساوات کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں آنے والی دہائیوں میں اہم سماجی ہلچل مچ گئی۔

9.8 دوسری عالمی جنگ کے اثرات (Impact of the Second World War)

دوسری عالمی جنگ کے گہرے اور دور رس نتائج تھے جنہوں نے تنازعہ کے بعد کے سالوں میں عالمی منظر نامے کو نئی شکل دی۔ اس کے اثرات کو کئی کلیدی شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: انسانی لاگت، سیاسی تبدیلیاں، اقتصادی نتائج، سماجی تبدیلیاں، اور بین الاقوامی تعلقات پر دیرپا اثرات۔

1. انسانی قیمت (Human Cost)

دوسری عالمی جنگ کا انسانی نقصان حیران کن تھا۔ ایک اندازے کے مطابق 70-85 ملین لوگ اپنی جانیں گنوا بیٹھے، جو اسے تاریخ کا سب سے مہلک تنازع بنا۔ اس اعداد و شمار میں فوجی اہلکار اور عام شہری شامل ہیں، بم دھماکوں، فاقہ کشی اور نسل کشی جیسے عوامل کی وجہ سے شہری ہلاکتوں کا ایک اہم حصہ ہے۔ ہولوکاسٹ کے نتیجے میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو منظم طریقے سے ہلاک کر دیا گیا، ان کے ساتھ ساتھ نازی حکومت کی طرف سے "ناپسندیدہ" سمجھے جانے والے لاکھوں افراد، بشمول رومی عوام، معذور افراد، اور سیاسی اختلاف کرنے والے۔ جنگ نے لاکھوں افراد کو بھی بے گھر کر دیا، جس سے پناہ گزینوں کا بحران پیدا ہو گیا کیونکہ لوگ جنگ زدہ علاقوں سے فرار ہو گئے۔ شہر کھنڈرات میں پڑے ہوئے تھے، اور بہت سی برادریوں کو تباہی کے بعد جسمانی اور جذباتی طور پر دوبارہ تعمیر کرنے کے مشکل کام کا سامنا کرنا پڑا۔

2. سیاسی تبدیلیاں (Political Changes)

دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا کا سیاسی منظر نامہ ڈرامائی طور پر تبدیل ہو گیا تھا۔ اس تنازعہ نے یورپی تسلط کے خاتمے اور دو عظیم طاقت امریکہ اور سوویت یونین کے ظہور کی نشان دہی کی۔ اس تبدیلی نے سرد جنگ کا آغاز کیا، ایک ایسا دور جس کی خصوصیت نظریاتی تصادم، فوجی تناؤ، اور دنیا بھر میں پراکسی جنگیں ہیں۔ اقوام متحدہ کا قیام 1945 میں بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینے اور مستقبل کے تنازعات کو روکنے کے لیے کیا گیا تھا، جو کہ اجتماعی سلامتی کے لیے عالمی عزم کی عکاسی کرتا ہے۔ عدم نوآبادیت کی تحریکوں نے ایشیا، افریقہ اور کیریبین میں زور پکڑا کیونکہ سابق نوآبادیوں نے جنگ سے کمزور یورپی طاقتوں سے آزادی کی کوشش کی۔ ہندوستان، پاکستان، اور مختلف افریقی ممالک جیسے ممالک خود مختار ریاستوں کے طور پر ابھرنے لگے، جغرافیائی سیاسی نقشے کو نمایاں طور پر تبدیل کرتے ہوئے۔ جنگ نے شہری حقوق اور سماجی انصاف کی وکالت کرنے والی سماجی تحریکوں کو بھی متحرک کیا، خاص طور پر ریاستہائے متحدہ میں، جہاں افریقی امریکیوں اور دیگر پسماندہ گروہوں نے جنگ کی کوششوں میں اپنی شراکت کے نتیجے میں مساوات کے لیے جدوجہد کی۔

3.اقتصادی نتائج (Economic Consequences)

دوسری عالمی جنگ کے معاشی نتائج گہرے اور مختلف خطوں میں مختلف تھے۔ یورپ کو بے پناہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا، انفراسٹرکچر تباہ ہو گیا اور معیشتیں تباہ ہو گئیں۔ مارشل پلان، 1948 میں ریاستہائے متحدہ کی طرف سے شروع کیا گیا تھا، جس کا مقصد مالی امداد فراہم کر کے یورپی معیشتوں کی بحالی میں سہولت فراہم کرنا تھا، اس طرح کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنا اور استحکام کو فروغ دینا تھا۔ اس منصوبے نے نہ صرف جنگ زدہ ممالک کی تعمیر نو میں مدد کی بلکہ امریکہ کو ایک غالب اقتصادی طاقت کے طور پر بھی قائم کیا۔ اس کے برعکس، جنگ نے امریکی معیشت کو نمایاں طور پر تقویت بخشی، جس سے خوشحالی کا دور شروع ہوا۔ جنگ کے وقت کی پیداوار کی مانگ نے صنعتی ترقی کی حوصلہ افزائی کی، جس کے نتیجے میں ملازمتیں پیدا ہوئیں اور تکنیکی ترقی ہوئی۔ اس معاشی عروج نے جنگ کے بعد کے سالوں میں صارفین کی ثقافت کے عروج میں اہم کردار ادا کیا، کیونکہ لوگوں نے ڈسپوزایبل آمدنی میں اضافہ اور سامان تک رسائی حاصل کی۔

4.سماجی تبدیلیاں (Social Transformations)

جنگ کے نتیجے میں بہت سی قوموں کے سماجی تانے بانے میں ڈرامائی تبدیلی آئی۔ خواتین کے کردار تنازعات کے دوران نمایاں طور پر تیار ہوئے، کیونکہ وہ روایتی طور پر ان مردوں کے پاس تھیں جو لڑائی سے دور تھے۔ اس تبدیلی نے صنفی مساوات اور خواتین کے حقوق کی وکالت کرنے والی جنگ کے بعد کی تحریکوں کی بنیاد رکھی۔ جنگ نے شہری حقوق کے مسائل کے بارے میں بیداری کو بھی بڑھایا، خاص طور پر ریاستہائے متحدہ میں، جہاں افریقی امریکیوں نے سماجی انصاف اور مساوات کے مطالبے کے لیے اپنی جنگ کے وقت کی شراکت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، جس کا اختتام 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں شہری حقوق کی تحریک میں ہوا۔ مزید برآں، جنگ کے صدمے اور اجتماعی یاد نے فن، ادب اور فلسفے کو متاثر کیا۔ جنگ کے ذریعے اٹھائے گئے وجودی سوالات نے ادب اور فنون میں نئی تحریکیں شروع کیں، جس سے بہت سے لوگوں کے تجربہ کردہ مایوسی اور معنی کی تلاش کی عکاسی ہوتی ہے۔

9.9 دوسری عالمی جنگ میں ہندوستان کا تعاون

(India's Contribution in the Second World War)

دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانوی سلطنت میں ہندوستان کی شراکت کو طویل عرصے سے نظرانداز کیا گیا ہے۔ یہ صرف حالیہ برسوں کے دوران کی گئی قربانیوں کی ہے۔

تاریخی تناظر (Historical Background)

پہلی عالمی جنگ کی طرح، دوسری جنگ عظیم میں ہندوستانی فوجیوں کو برطانیہ نے جنگی کوششوں میں مدد کے لیے بلایا تھا۔ اپنے عروج پر برطانوی ہندوستانی فوج کا حجم 2.5 ملین تک پہنچ گیا یہ دنیا کی سب سے بڑی رضاکار فوج تھی۔ تقریباً 89,000 ہندوستانی فوجی برطانوی سلطنت کے لیے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ہندوستانی فوجی اُس وقت تمام بڑی لڑائیوں میں لڑے تھے۔ ٹوبروک، مونٹی کیسینو،

کوہیما اور امپھال۔ انہوں نے تمام بڑے محاذوں پر لڑے — مشرقی اور شمالی افریقہ، اٹلی، برما، سنگاپور، جزیرہ نما ملے، گوام اور انڈو چائنا — اور جاپانیوں سے جنوب مشرقی ایشیا کو محفوظ کیا۔ تقریباً 700,000 ہندوستانی فوجی برما اور جنوب مشرقی ایشیائی تھیٹر میں لڑے۔ مورخین نے اب اس کا ریکارڈ کرنا شروع کیا ہے جنگ کے دوران ہونے والی سب سے شدید لڑائیوں میں 1944 میں کوہیما اور امپھال کی لڑائی تھی۔ کوہیما اور امپھال کی جنگ میں لگ بھگ 53,000 افراد ہلاک اور لاپتہ ہونے کے ساتھ بنیادی طور پر تباہ ہو گئے۔

جنگ کے سالوں میں پورا برصغیر پاک و ہند بدل گیا۔ برصغیر جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانیوں کے خلاف جنگ کے لیے ایک وسیع سپلائی گراؤنڈ بن گیا تھا۔ لاکھوں ہندوستانیوں نے قابل رحم حالات میں سلطنت کے لیے محنت کی۔ ہزاروں ہندوستانیوں نے بہار میں کوئلے کی کان میں کام کیا، ہندوستان سے میانمار اور چین تک سپلائی سڑکیں بنانے میں اہم رول ادا کیا، بشمول شمال مشرقی ہندوستان میں چین اور ہندوستان کے درمیان مشہور لیڈو روڈ۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ، بھارت اتحادیوں کو جنگی سامان فراہم کرنے والا بڑا ملک بن گیا۔ اس کی سینکڑوں نئی فیکٹریوں نے تمام ممالک کو ٹیکسٹائل اور دیگر جنگی مواد کی باقاعدہ سپلائی برقرار رکھی۔ سرکاری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ بندرگاہوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے ہزاروں ہندوستانی ہندوستان کی مشرقی ساحلی پٹی پر جاپانی فضائی بمباری سے ہلاک ہوئے۔ ہزاروں غیر جنگجوؤں کو انسانوں کے لیے بیرون ملک بھیجا گیا اور سپلائی لائنز اور امدادی خدمات کا انتظام کیا گیا۔ یہ وہ 'کولی' تھے جو شاہی بندرگاہوں پر سامان لادتے اور اتارتے تھے یا ایروڈرومز کے لیے زمین صاف کرتے تھے۔ لندن، کارڈف، لیورپول اور ساؤتھ شیلڈز کی بندرگاہوں کے ارد گرد رہنے والے مرچنٹ بحری جہازوں نے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کام کیا کہ برطانیہ کو سپلائی لائنیں کھلی رہیں۔ انہوں نے اپنے سفید فام ہم منصبوں سے کم تنخواہ پر ظالمانہ حالات میں بھی کام کیا۔ جنگ سے متعلق برطانوی ٹیکسوں اور محصولوں نے ہندوستان کی غربت زدہ آبادی پر مزید بوجھ ڈالا۔ ہندوستانیوں نے نہ صرف جنگ لڑی بلکہ اس کی مالی امداد بھی کی۔ مشہور فوجی مورخ سری ناتھ راگھون لکھتے ہیں کہ 43-1942 تک، ہندوستان جنگ کے لیے برطانیہ سے زیادہ قیمت ادا کر رہا تھا، جس نے برطانیہ کے ساتھ اپنے تعلقات کو ایک مقروض سے قرض دہندہ میں تبدیل کر دیا تھا- برطانیہ کے ساتھ اس کے آخر تک 1.3 بلین پاؤنڈ کا قرض تھا۔ جنگ (بھارت کی جنگ: جدید جنوبی ایشیا کی تشکیل 1939-1945)

دوسری عالمی جنگ کا ہندوستان پر بہت بڑا اثر پڑا۔ اس نے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو بہت تقویت بخشی۔ 1942 کی ہندوستان چھوڑو تحریک میں لاکھوں افراد نے حصہ لیا۔ نیتا جی سبھاس چندر بوس نے ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف لڑنے اور اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہندوستانی فوجیوں اور جاپانیوں کے جنگی قیدیوں (POWs) پر مشتمل انڈین نیشنل آرمی (INA) کو کھڑا کیا۔ نیتا جی نے اپنے مشن کے لیے جاپانی مدد طلب کی۔ آئی این اے اور جاپانی افواج نے پیش قدمی کی لیکن شمال مشرق میں امپھال اور کوہیما میں برطانوی فوج نے انہیں روک دیا۔ جنگ کے دوسرے نتائج بھی تھے۔ دوسری عالمی جنگ نے ایک پیشہ ور اور انتہائی قابل احترام ہندوستانی مسلح افواج تیار کیں۔ سیکڑوں نئی فیکٹریاں جو جنگی مواد کی تیاری اور سپلائی کے لیے لگائی گئی تھیں، نے ہندوستان کے مینوفیکچرنگ سیکٹر کی بنیاد رکھی۔ کاروباری حلقوں میں بہت سے لوگوں نے بہت زیادہ منافع کمایا اور صنعتی کاروباری بن گئے۔

9.10 دوسری عالمی جنگ کے بعد (Aftermath of the Second World War)

نئی عظیم طاقت (New Super Power)

دوسری عالمی جنگ نے ممالک اور براعظموں کی حیثیت میں تبدیلیاں لائی تھیں۔ برطانیہ اور فرانس نے عظیم طاقت کے طور پر اپنی برتری کی حیثیت کھودی اور امریکہ اور سوویت یونین نے اس کی جگہ لے لی۔

عدم نوآبادیت کا آغاز (Beginning of Decolonisation)

جنگ کے بعد برطانیہ اور فرانس کو مختلف اندرونی اور بیرونی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ دونوں اب اپنی اپنی نوآبادیوں پر قائم نہیں رہ سکتے تھے اس طرح جنگ کے بعد کی دنیا نے افریقہ اور ایشیا میں نوآبادیت کے خاتمے کا مشاہدہ کیا۔

اقوام متحدہ کی پیدائش (Birth of the United Nations Organisation)

جنگ کے اہم نتائج میں سے ایک اقوام متحدہ کی تنظیم کا قیام 24 اکتوبر 1945 کو ہوا تھا۔ اگرچہ لیگ آف نیشن اپنے کام کو انجام دینے میں ناکام رہی، لیکن بنی نوع انسان نے مکمل طور پر اس کو بنانے کی اپنی امیدوں سے محروم نہیں کیا۔ دنیا رہنے کے لیے ایک محفوظ اور خوشگوار جگہ ہو اس لیے اقوام متحدہ کو بنایا گیا۔ اقوام متحدہ کا چارٹر بنی نوع انسان کی امیدوں اور نظریات کو بیان کرتا ہے جن کی بنیاد پر ممالک پائیدار امن کو برقرار رکھنے کے لیے مل کر کام کر سکتے ہیں۔ تاہم، اقوام متحدہ کے قیام پر اتفاق ہوا، بحر اوقیانوس کے چارٹر کے تحت دوسری عالمی جنگ کے خاتمے سے بہت پہلے۔

سرد جنگ کا آغاز (Beginning of the Cold War)

جنگ کے خاتمے کے بعد جرمنی کے شہر پوٹسڈیم میں امن معاہدے طے کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ ہٹلر کے ساتھ لڑنے والے ممالک نے اپنے علاقے کھودیے اور اتحادیوں کو معاوضہ ادا کرنا پڑا۔ جرمنی اور اس کے دارالحکومت برلن کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان علاقوں کو برطانیہ، امریکہ، فرانس اور سوویت یونین کے زیر کنٹرول ہونا تھا۔ تینوں مغربی اتحادیوں اور سوویت یونین کا بہت سی باتوں پر اختلاف تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جرمنی دو الگ الگ ملکوں میں تقسیم ہو گیا: مشرقی جرمنی جس میں کمیونسٹ حکومت تھی اور مغربی جرمنی جو کہ ایک جمہوری مملکت تھی ان سب اختلافات نے سرد جنگ کی بنیاد ڈالی۔

نئی عالمی معاشی تنظیم (The New Economic World Order)

بریٹن ووڈس کانفرنس، باضابطہ طور پر اقوام متحدہ کی مالیاتی اور مالیاتی کانفرنس، بریٹن ووڈس، نیو ہیمپشائر (1-22 جولائی، 1944) میں دوسری عالمی جنگ کے دوران جرمنی اور جاپان کی متوقع شکست کے بعد جنگ کے بعد کی دنیا کے لیے مالیاتی انتظامات کرنے کے لیے اجلاس منعقد کیے گئے۔ اس نے بین الاقوامی بینک برائے تعمیر نو اور ترقی (IBRD-جواب ورلڈ بینک کے نام سے جانا جاتا ہے) کے لیے ایک پروجیکٹ تیار کیا تاکہ ایسی مملکتوں کو فوری طور پر غیر ملکی امداد کی ضرورت کے لیے طویل مدتی سرمایہ دستیاب کیا جاسکے، اور بین الاقوامی

مالیاتی فنڈ (IMF) کے لیے فنانس کے لیے ایک قلیل مدت پروجیکٹ تیار کیا جا سکے۔ شرح مبادلہ کو مستحکم کرنے کے لیے بین الاقوامی ادائیگیوں میں عدم توازن۔ نیز، امریکی ڈالر کو عالمی تجارت کے لیے ریزرو کرنسی کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔

9.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں ہم نے دوسری عالمی جنگ کیا ہے اس کو سمجھ پائے۔ دوسری عالمی جنگ کی ابتدا سے واقفت حاصل کی۔ دوسری عالمی جنگ کے اسباب کے ساتھ بھی روبرو ہو پائے۔ دوسری عالمی جنگ کے طویل مدتی نتائج کو جانا۔ دوسری عالمی جنگ کے اثرات کو سمجھا۔ اکائی کے آخر میں عالمی جنگ کی نتائج کی معلومات بھی حاصل کی۔

9.12 کلیدی الفاظ (Key Words)

اتحادی طاقت	:	مرکزی طاقتوں کے خلاف لڑنے والے فوجی اتحاد کو اتحادیوں کے نام سے جانا جاتا تھا۔
محوری طاقت	:	محوری طاقتیں، جسے اصل میں روم — برلن ایکس کہا جاتا ہے، ایک فوجی اتحاد تھا جس نے دوسری عالمی جنگ کا آغاز کیا اور اتحادیوں کے خلاف
ورسائی معاہدہ	:	ورسائی کا معاہدہ، پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر اتحادی اور متعلقہ طاقتوں اور جرمنی کے ذریعہ دستخط شدہ امن دستاویز
قوم پرستی	:	ان لوگوں کی سیاسی آزادی کی خواہش ہے جو محسوس کرتے ہیں کہ وہ تاریخی یا ثقافتی طور پر کسی ملک کے اندر ایک الگ گروہ ہی
عکسریت پسندی	:	یہ یقین کہ کسی ملک کو مضبوط فوجی صلاحیت برقرار رکھنی چاہیے اور اسے قومی مفادات کے دفاع یا فروغ کے لیے جارحانہ انداز میں استعمال کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

9.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

9.13.1 معروضی سوالات کے حامل جوابات (Objective Answer Type Questions)

1. مارشل پلان کی شروعات کب ہوئی؟

(a)1945   (b)1948   (c)1950   (d)1952

2. پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد اتحادی طاقتوں نے کس ملک کو ورسائی کے معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا؟

(a)جرمنی (b)اٹلی (c)فرانس (d) آسٹریہ۔ہنگری

3.معاہدہ ورسائی پر دستخط کب ہوا تھا؟

1919(a) 1920(b) 1921(c) (d) ان میں سے کوئی

4.کس ملک کی جانب سے ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے گئے تھے؟

(a)امریکہ (b)یواس اس آر (c)اٹلی (d)جرمنی

5.امریکہ اور برطانیہ کی بحریہ کو کمزور کرنے کے مقصد سے کس ملک نے 'پرل ہاربڑ' پر حملہ کیا تھا؟

(a)روس (b)چین (c)جاپان (d) ان میں سے کوئی نہیں

6.کس سال میں ہٹلر جرمنی کا چانسلر(PM) بنا؟

1932(a) 1933(b) 1934(c) 1935 (d)

7.دوسری عالمی جنگ کب سے کب تک چلا؟

1939-42 (a) 1939-43(b) 1939-44(c) 1939-45 (d)

8.انڈین نیشنل آرمی کو کس مجاہد آزادی نے کھڑا کیا تھا؟

(a)بھگت سنگھ (b)سبھاش چندر بوس (c)لالا لاجپت رائے (d)لالا ہردیال

9۔کس ملک کی قیادت میں NATO کا قیام عمل میں آیا؟

(a) برٹین (b)امریکہ (c)جرمنی (d) ان سے کوئی نہیں

10.وارسا پیکٹ کا قیام عمل میں لانے والے ملک تھا؟

(a) جرمنی (b)سربیا (c)روس (d) فرانس

9.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات(Short Answer Types Questions)

1. دوسری عالمی جنگ پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
2. دوسری عالمی جنگ کی ابتدا پر روشنی ڈالیے۔
3. دوسری عالمی جنگ کے سماجی اور اقتصادی اثرات کو بتایئے؟
4. دوسری عظیم جنگ کے بعد کے حالات کا جائزہ لیجئے؟
5. دوسری عالمی جنگ میں ہندوستان کے تعاون پر بحث کیجئے۔

9.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات(Long Answer Type Questions)

1. دوسری عالمی جنگ کو بتاتے ہوئے اس کی ابتدا پر غور و فکر کیجئے۔

2. دوسری عظیم جنگ کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. دوسری عالمی جنگ کے نتائج پر ایک مضمون لکھیے۔

9.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Baylis, John, Steve Smith and Patricia Owens, *The Globalisation of World Politics*, Oxford, 2011.
2. Goldstein, Joshua S., and Jon C. Pevehouse, *International Relations*, Pearson, 2016, (11th Edition).
3. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
4. Lowe, Norman., *Mastering the Modern World History*, Palgrave, Macmillan, 1982.
5. Mansbach, Richard W. and Kirsten L. Rafferty, *Introduction to Global Politics*, Routledge, 2011 (2nd Edition).
6. Nye, Joseph S., *Understanding International Conflicts*, Longman, 2007, (6th Edition).
7. Overy, R., *The Inter-War Crisis, 1919–1939*, Longman, 1994.
8. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Shimko, Keith L., *International Relations*, Houghton Mifflin Company, 2012, (4th Edition).

اکائی 10– قومی تحریکیں اور ترکِ نوآبادیات

(National Movements and Decolonisation)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 ترکِ نوآبادیات کی تعریف

10.3 ترکِ نوآبادیات کی اقسام

10.4 ترکِ نوآبادیات کے نقطۂ نظر

10.5 ترکِ نوآبادیات کی لہریں

10.6 ترکِ نوآبادیات اور قومی مملکتیں

10.7 لاطینی امریکہ میں ترکِ نوآبادیات

10.8 افریقہ میں ترکِ نوآبادیات

10.9 عالمی سیاست پر ترکِ نوآبادیات کے اثرات

10.10 سامراجیت کے خلاف لیگ

10.11 اکتسابی نتائج

10.12 کلیدی الفاظ

10.13 نمونہ امتحانی سوالات

10.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید (Introduction)

اقوام متحدہ 1945 میں اپنے قیام کے وقت 51 رکن ممالک پر مشتمل تھا۔ آج رکن ممالک کی تعداد 193 ہوگئی ہے۔ اس عرصے میں اقوام متحدہ میں شامل کیے گئے نئے ممالک کی اکثریت یورپی سامراجی حکومتوں کے خاتمے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ یہ نوآبادیاتی سلطنتوں کی دنیا سے قومی ریاستوں (Nation States) کی دنیا میں تاریخی تبدیلی کی پیداوار ہیں۔ جس ہنگامہ خیز عمل کو اس تبدیلی کو جنم دیا اسے ترکِ نوآبادیات یعنی Decolonisation کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح انیسویں صدی کے اوائل میں ایک فرانسیسی صحافی نے ایجاد تھی جس نے اپنے ملک فرانس کی الجزائر کی فتح پر اعتراض کیا تھا۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری Decolonisation کی تعریف "نوآبادیاتی طاقت کی اپنی سابقہ کالونیوں سے دستبرداری، ایسی کالونیوں کے ذریعے سیاسی یا اقتصادی آزادی کا حصول" کے طور پر کرتی ہے۔ اس تعریف میں کلیدی الفاظ "اقتدار سے دستبرداری" اور "خود مختاری اور آزادی کا حصول" ہیں، جو باہمی معاہدے کے ذریعے کیے جانے والے مالیاتی لین دین کو ظاہر کرتے ہیں۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ترکِ نوآبادیات کی تعریف اور اقسام کا مطالعہ کریں گے۔
- ترکِ نوآبادیات کے نقطۂ نظر اور لہروں کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے۔
- ترکِ نوآبادیات اور قومی مملکتوں کے تعلق کو سمجھیں گے۔
- لاطینی امریکہ میں ترکِ نوآبادیات کا مطالعہ کریں گے۔
- افریقہ میں ترکِ نوآبادیات کا مطالعہ کریں گے۔
- عالمی سیاست پر ترکِ نوآبادیات کے اثرات کو سمجھیں گے۔

10.2 ترکِ نوآبادیات کی تعریف (Meaning of Decolonisation)

ایک فرانسیسی صحافی Henri Fonfrède کو Decolonisation کی اصطلاح کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے یہ اصطلاح اپنی ہی حکومت کے خلاف استعمال کی جب انہوں نے الجزائر پر اپنا قبضہ کیا تھا۔ اس دوران یہ سیاسی لغت سے غائب ہوگیا اور تقریباً ایک صدی تک کسی کا دھیان اس اصطلاح پر نہیں گیا۔ بعد ازاں 1930 کی دہائی میں، ایک جرمن یہودی سماجی سائنسدان مورٹز جولیس بون (Moritz Julius Bonn) نے اس اصطلاح کو دوبارہ زندہ کیا اور اس کے بعد 1960 کی دہائی میں اس اصطلاح نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ قومی آزادی کی تاریخ نگاری میں یہ اصطلاح تشریح کے دو متضاد قطبوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ پہلا ایک شاہی طاقت کے ذریعے منقطع ہونے کے عمل کی تجویز کرتا ہے۔ اس موقف کو پتنگ کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جب آسمان میں کوئی پتنگ دیگر پتنگوں سے اُلجھ جاتی

ہے تو پتنگ اُڑانے والے کو پتنگ پر خطرہ محسوس ہوتا ہے اور وہ آئندہ نقصان سے بچنے کے لیے پتنگ کی ڈور واپس کھینچ لیتا ہے۔ دوسری تشریح اس فعال عمل پر روشنی ڈالتی ہے جس میں نوآبادیاتی طاقت کو ختم کیا جاتا ہے، بڑے پیمانے پر قوم پرستی کے عمل اور قومی تحریک سے اس کو ناکام کیا جاتا ہے۔ ترکِ نوآبادیات کی اصطلاح یہاں دوسرے معنوں میں استعمال کی گئی ہے، جو کہ نوآبادیاتی لوگوں کی آزادی کے حصول کی جدوجہد سے متضاد ہے۔

کچھ لوگوں کا دوسرے لوگوں کے ایک گروہ کی زمین پر قبضہ کرنا اور مقامی لوگوں پر اپنی حکمرانی اور ثقافت مسلط کرنا، نوآبادیات کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس، ترکِ نوآبادیات کا عمل مقامی لوگوں کو خود مختاری فراہم کرنا ہے۔ یہ ایک کالونی کے آزاد ہونے یا حق خود مختاری فراہم کرنے کا عمل ہے۔ ترکِ نوآبادیات مقامی لوگوں کو 'سیاسی، ثقافتی، نفسیاتی اور سماجی آزادی' فراہم کرتا ہے۔ ترکِ نوآبادیات نے پہلے سے موجود نوآبادیاتی سلطنتوں میں نئی قوموں کو جنم دیا۔ ان قومی مملکتوں میں 'عوام' کو خود مختاری کا منبع تسلیم کیا گیا۔ 20ویں صدی میں نوآبادیات ختم ہونے والے بڑے ممالک یہ ہیں:

1940s	Philippines, India and Pakistan [separated from India], Ceylon (Sri Lanka), Burma (Myanmar), Indonesia
1950s	Libya, Vietnam, Cambodia, Laos [all formerly components of French Indochina], Egypt, Morocco, Tunisia, Gold Coast (Ghana), Malaya (subsequently Federation of Malaysia when joined with Sarawak and Northern Borneo in 1963), Guinea
1960s	Senegal, Ivory Coast, Mauretania, French Sudan (Mali), Dahomey (Benin), Upper Volta (Burkina Faso) [all emerging from the French West African Federation]; Chad, Gabon, Central African Republic, Congo Republic [all emerging from the French Equatorial Federation]; Madagascar, Nigeria, Republic of Congo (later Zaire, now Democratic Republic of the Congo), Cyprus, Republic of South Africa, Sierra Leone, Tanganyika (Tanzania when united with Zanzibar in 1964), Algeria, Uganda, Trinidad and Tobago, Jamaica, Singapore (as part of the Federation of Malaysia, but a separate state since 1965), Kenya, Nyasaland (Malawi), Northern Rhodesia (Zambia), Malta, Rhodesia (Zimbabwe in 1979), Kenya, Maldives, Bechuanaland (Botswana), Barbados, British Guiana (Guyana), Swaziland, Mauritius
1970s	Fiji, Tonga, Bahamas, Grenada, Angola, Mozambique, Guinea-Bissau, Papua New Guinea, Seychelles
1980s	Belize (formerly British Honduras), Antigua and Barbuda, Brunei
1990s	Southwest Africa (Namibia), Hong Kong (handed over by British to China after ninety-nine-year lease)

Source: Raymond F. Betts, *Decolonisation: Making of the Contemporary World*, Routledge.

10.3 ترکِ نوآبادیات کی اقسام (Types of Decolonisation)

ترکِ نوآبادیات کی وسیع پیمانے پر چار اقسام ہیں:

1. سفید فام آبادکار کالونیوں کے لیے خودکار حکومت کی تشکیل جیسا کہ کینیڈا اور آسٹریلیا میں ہوا۔
2. سامراجی سلطنت کا باضابطہ خاتمہ اور آزاد حکمرانی کا آغاز جیسا کہ ہندوستان میں ہوا۔
3. رسمی سلطنت کی جگہ غیر رسمی سلطنت یا نونوآبادیاتی نظام کا قیام جیسا کہ لاطینی امریکہ میں ہوا۔
4. محض سامراجی آقاؤں کی تبدیلی-ہند-چین میں جب فرانسیسی دستبردار ہوئے تو ان کی جگہ امریکیوں نے لی۔

10.4 ترکِ نوآبادیات کے نقطہ نظر (Approaches to Decolonisation)

ترکِ نوآبادیات کا مطالعہ درج ذیل نقطہ ٔ نظر سے کیا جا سکتا ہے:

قوم پرست نقطہ نظر

بین الاقوامی سیاق وسباق کا نقطہ نظر

مقامی تحدیدات کا نقطہ نظر

1۔ قوم پرست نقطہ نظر (Nationalist Approach)

قوم پرست نقطہ نظر کے مطابق نوآبادیاتی لوگوں کی مزاحمتی تحریکوں نے ترکِ نوآبادیات کی رفتار کا تعین کیا۔ نوآبادیاتی ممالک میں حکمرانی اس وقت ناقابل عمل ہو گئی جب اس کو برقرار رکھنے والے گروہوں نے حمایت واپس لے لی۔ ایسا دو حالات میں ممکن ہو سکا، پہلے، اکثر قوم پرست تحریک کے دباؤ میں اور دوسرے، قوم پرست افراد کے اثر ورسوخ میں۔ مختصراً، یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں قومی تحریک کی مضبوط ساخت اور نوعیت نے نوآبادیاتی طاقتوں کو ترکِ نوآبادیات کے لیے مجبور کیا۔

مثال کے طور پر، ہندوستان میں 1930 کی دہائی سے برطانوی حکومت کے لیے عجب دور سامنے تھا۔ حکومت کبھی جبر سے کام لیتی تھی تو کبھی مفاہمت کی پالیسی اپناتی تھی۔ اس کے نتیجے میں سِوِل خدمات کے ان عہدیداروں کے حوصلے پست ہوئے جنہیں دونوں پالیسیوں پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ نوآبادیاتی عہدیداروں کے وہی گروپ جنہوں نے 1930 میں سول نافرمانی کی تحریک کے دوران قوم پرست رہنماؤں کو جیلوں میں ڈالا تھا، 1937 کی صوبائی وزارتوں کی تشکیل کے دوران ان کے ماتحت کام کرنے پر مجبور ہوئے۔

1942 تا 1946 کے دوران بھی سرکاری افسروں اسی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔ ان عہدیداروں کے حوصلے پست ہو گئے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ جنگ کے سالوں میں اور خاص طور پر 1942 کی بغاوت کو روکنے کے لیے جن رہنماؤں کو انہوں نے سخت سزا دی تھی، وہ جلد ہی 1946 میں صوبوں میں ان کے سیاسی آقا بن جائیں گے۔

2۔ بین الاقوامی سیاق وسباق کا نقطہ نظر (International Context Approach)

ترکِ نوآبادیات کے بین الاقوامی سیاق وسباق کو اجاگر کرنے کے نقطہ نظر کے مطابق، نوآبادیاتی سلطنتیں دوسری جنگ عظیم کے بعد نئے ورلڈ آرڈر (new world order) میں زندہ نہیں رہ سکیں۔ 20ویں صدی میں عالمی حالات میں بہت تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بدلی ہوئی بین الاقوامی آب وہوا جنگ کے دوران Allies کے جاری کردہ اٹلانٹک چارٹر میں جھلکتی تھی جس میں نوآبادیاتی لوگوں کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 1960 میں نوآبادیاتی ممالک اور لوگوں کو آزادی دینے کے اپنے اعلامیہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر حمایت کی۔ اس نے نوآبادیاتی حکمرانی کی شدید مذمت کی اور اسے اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے بنیادی انسانی حقوق سے عوام کی محرومی قرار دیا۔

یہ بین الاقوامی نقطہ نظر سلطنتوں کے خاتمے کی وجہ امریکہ اور سوویت یونین کی مخالفت کو 'پرانے طرز کی سامراجیت' سے منسوب کرتا ہے۔ اگر پرانی سامراجی طاقتیں اپنی نوآبادیاتی سلطنتوں کو قائم رکھتی تو اس سے امریکہ اور سوویت یونین کو کچھ حاصل نہیں ہونا تھا۔ اس کے برعکس اگر ترکِ نوآبادیات کے تحت ان سلطنتوں سے برطانیہ اور فرانس کو دستبردار کر دیا جاتا تو اس کے تمام فوائد امریکا اور سوویت یونین کے حاصل ہونے والے تھے۔ اس سے امریکا اور سوویت یونین کو افریقہ اور ایشیا کے غریب ممالک پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کا موقع ملا۔ مثال کے طور پر، امریکی نوآبادیاتی نظام نے فرانس کو ہند چین، جاپان میں کوریا اور برطانیہ نے پاکستان میں بدل دیا، جو کہ برطانوی ہندوستان کی دو جانشین ریاستوں میں سے ایک ہے۔ یو ایس ایس آر نے مشرقی یورپ، کیوبا اور موزمبیق کے ساتھ 'کالونیوں' سے تھوڑا زیادہ سلوک کیا۔ مغربی سرد جنگجوؤں نے اسے 'سوشلسٹ سامراجیت' کا نام دینے میں جلدی کی، بہت زیادہ عزت نفس والے سوشلسٹوں کی ناراضگی کے لیے، جن کے لیے سامراج کا لفظ ہی ناپاک تھا۔

3۔ مقامی تحدیدات کا نقطہ نظر (Domestic Constraint Approach)

میٹروپولیٹن یا گھریلو رکاوٹوں کا نقطہ نظر اس بات پر مرکوز ہے کہ کس طرح کالونی مادر وطن پر بہت بڑا بوجھ بن گئی۔ اس وضاحت میں سلطنت کے خاتمے کو ملکی مجبوریوں اور قومی مفاد کے حساب کتاب کے دباؤ میں سیاسی انتخاب کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ایک بار جب سلطنت مالی، عسکری اور بین الاقوامی تعلقات میں بہت زیادہ پریشانی کا شکار ہوگئی تو مادر وطن کی حکومت کرنے کی خواہش میں کمی آگئی۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام نے برطانیہ کو ایک شدید معاشی بحران میں پایا اور جنگ سے تنگ برطانوی عوام نے جلد سے جلد اور بغیر درد کے سلطنت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا۔ ایک اور عنصر جنگ کے بعد فلاحی ریاست کی توسیع تھی۔ جب سماجی اصلاحات ایک ترجیح بن گئی اور سلطنت کو وسائل پر ایک نالی کے طور پر سمجھا جانے لگا تو ڈی کالونائزیشن نے رفتار پکڑی۔ جو سیاست دان سلطنت سے دستبرداری کے حق میں تھے وہ دن کا ذائقہ بن گئے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں تھا کہ برطانوی عوام نے لیبر پارٹی کو دفتر کے لیے منتخب کیا۔ نئی تفہیم لیبر پارٹی کے لیے موزوں تھی۔

10.5 ترکِ نوآبادیات کی لہریں (Waves of Decolonisation)

جسے ہم عام طور پر ڈی کالونائزیشن کے طور پر بیان کرتے ہیں وہ نوآبادیاتی سلطنتوں کا خاتمہ اور نئی قومی ریاستوں کی تخلیق تھی جو دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دہائیوں میں تیسری دنیا کے طور پر مشہور ہوئی۔ اس کے باوجود یہ ہلچل شاید ہی بے مثال تھی۔ سلطنتوں کے درمیان عالمی جھڑپوں نے ڈی کالونائزیشن کی کئی سابقہ لہریں پیدا کی تھیں۔ پہلی نئی دنیا میں 1776 اور 1820 کے درمیان ہوئی، دوسری پرانی دنیا میں 1917 اور 1920 کے درمیان۔ 1989 کے بعد سوویت یونین کے انہدام نے چوتھی لہر کو جنم دیا۔

1۔ نئی دنیا میں ترکِ نوآبادیات (New World Decolonisation)

ڈی کالونائزیشن کی پہلی لہر امریکہ میں ہوئی۔ اس کا آغاز 1776 میں برطانوی حکمرانی کے خلاف شمالی امریکہ کے نوآبادکاروں کی بغاوت سے ہوا، جس کی وجہ سے ریاستہائے متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد 1791 میں سینٹ ڈومینگو کی فرانسیسی کالونی میں غلاموں کی عظیم بغاوت ہوئی، یہ ایک اذیت ناک جدوجہد تھی جس نے یورپی کنٹرول سے آزاد ہونے والے مغربی نصف کرہ کے دوسرے ملک ہیٹی کے طور پر اپنی آزادی حاصل کی۔ انیسویں صدی کے اوائل تک، آزادی کی جنگیں پورے ہسپانوی امریکہ میں پھیل رہی تھیں، جس سے نئی قومی ریاستوں کا ایک سلسلہ وجود میں آیا جو شمالی میکسیکو کے میدانی علاقوں سے لے کر پیٹا گونیا کے پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس دور نے برازیل پر پرتگال کا کنٹرول بھی ختم کر دیا، جو جنوبی امریکی علاقوں میں سب سے بڑا ہے۔

امریکی انقلاب کو بڑے پیمانے پر نقصان پہنچا کیونکہ سات سالہ جنگ (1756-63) کے دوران برطانیہ اور فرانس اور ان کے متعلقہ اتحادیوں کے درمیان عالمی سامراجی جدوجہد نے برطانوی سامراجی ریاست اور اس کے شمالی امریکہ کے درمیان تعلقات پر ناقابل برداشت اقتصادی اور سیاسی دباؤ ڈالا۔ نوآبادیات جب ان نوآبادیات نے 1776 میں بغاوت کا سہارا لیا، تو ان کی کامیابی کے امکانات مشکوک تھے، لیکن برطانیہ اور اس کے سامراجی حریفوں کے درمیان دوبارہ جنگ شروع ہوئی، جس کا آغاز 1778 میں فرانس سے ہوا، اس کے بعد 1779 میں اسپین اور 1780 میں ڈچ جمہوریہ نے اس لہر کو بدلنے میں مدد کی۔ باغیوں کی حمایت ایک ہی وقت میں، یہ خطرہ تھا کہ ایک اور سلطنت باغی کالونیوں کو کنٹرول کرنے یا ان سے الحاق کرنے کی کوشش کرے گی۔ آزادی کے اعلان کے اہم مقاصد میں سے ایک خود مختار ریاست کے طور پر امریکہ کی حیثیت پر زور دینا تھا۔ اس اعلان کی دلیل مقبول خود مختاری کا بنیادی خیال تھا، جس نے یہ خیال کیا کہ سیاسی اختیار "عوام" سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس دعوے نے قومی ریاست کے تصور کو ممکن بنایا۔

2۔ پرانی دنیا میں ترکِ نوآبادیات (Old World Decolonisation)

ڈی کالونائزیشن کی اس پہلی لہر اور ڈی کالونائزیشن کی دوسری لہر کے درمیان سو سال کا وقفہ ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں سلطنتوں کے خلاف بے شمار بغاوتیں ہوئیں۔ ان میں سے بہت سے بغاوتیں قومیت یا ریاست کے تصور کو بیان کرنے میں ناکام رہی، لیکن یہ اپنے ابتدائی مراحل میں سب سے کامیاب نئی دنیا کی بغاوتوں کے بارے میں بھی سچ تھا۔ یہاں تک کہ سب سے اہم ہلچل، جیسے کہ

1857 کی ہندوستانی بغاوت/بغاوت، کو عام طور پر اس سے پہلے ہی کچل دیا گیا کہ وہ ریاست کی تعمیر کے منصوبوں کے لیے قابل عمل ادارہ جاتی اور نظریاتی ڈھانچہ تشکیل دے سکیں۔ اس کا ایک حصہ اس ڈرامائی تکنیکی خلیج کی وجہ سے تھا جو اس عرصے میں بڑی سلطنتوں کی فوجی طاقت اور زیادہ تر باغیوں کے لیے دستیاب محدود فائر پاور کے درمیان پیدا ہوا۔

جس چیز نے نوآبادیات کی دوسری لہر کو ممکن بنایا وہ پہلی جنگ عظیم تھی۔ روسی انقلابی ولادیمیر لینن کے اندازے کے مطابق، پھر سوئٹزرلینڈ میں جلاوطنی سے جنگ کا مشاہدہ کرتے ہوئے، یہ ٹائٹینک جدوجہد، ان کے الفاظ میں، "ایک الحاق پسند، لوٹ کی شکاری جنگ" تھی۔ دنیا کی "تقسیم اور تقسیم" کے خواہاں سامراجی طاقتوں کے درمیان۔ اگرچہ اس جنگ کے وقت کی تشخیص میں بہت زیادہ قابلیت تھی، لیکن یہ خود جنگجو طاقتوں، خاص طور پر وسطی اور مشرقی یورپ پر حکمرانی کرنے والی طاقتوں پر جنگ کے اثرات کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔ ایک کے بعد ایک یوریشیائی زمینی سلطنت جنگ کے دباؤ اور اس کے نتیجے میں گرتی چلی گئی۔ 1917 میں پہلی بار روسی سلطنت کا زوال ہوا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ایسی ہی قسمت سے بچنے والی واحد یوریشین زمینی سلطنت چین تھی، جو کہ ان عظیم ریاستوں میں سب سے کمزور تھی۔

پچھلی صدی کے دوران خونی کسان بغاوتوں کے ایک سلسلے اور غیر ملکی طاقتوں کے مراعات اور غیر مساوی معاہدوں کے ناقابل تسخیر مطالبات نے چین کی طاقت اور خودمختاری کو سنجیدگی سے ختم کر دیا تھا۔ 1911 میں، کنگ خاندان کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ ایک غیر موثر جمہوری حکومت نے سنبھالی۔ ان مشکلات کے باوجود، چین نے جنگ کے سالوں سے بڑی حد تک غیر محفوظ گزرا۔ اگرچہ اس نے 1917 میں جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا، لیکن اس نے دشمنی میں کسی قسم کی شمولیت سے گریز کیا۔ نتیجے کے طور پر، اس کی علاقائی حدود بڑی حد تک برقرار رہی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد آئرلینڈ میں جو کچھ ہوا اسے عام طور پر ڈی کالونائزیشن نہیں کہا جاتا، لیکن تمام عملی مقاصد کے لیے یہ نتیجہ تھا۔ جنگ کے بعد وسطی اور مشرقی یورپ میں آنے والی سیاسی تبدیلیوں کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ سلطنتوں کے کھنڈرات سے نئے ممالک چیکوسلواکیہ، ایسٹونیا، فن لینڈ، ہنگری، لٹویا، لتھوانیا، پولینڈ اور یوگوسلاویہ وجود میں آئے۔ ان میں سے کوئی بھی، یہ سچ ہے، آزادی کے لیے طویل جدوجہد کا نتیجہ نہیں تھا۔ درحقیقت، زیادہ تر چیک، ہنگری، اور دیگر لوگ جنگ کے دوران ان پر حکمرانی کرنے والی سامراجی حکومتوں کے لیے باخبر رہے، حتیٰ کہ وفادار رہے۔ لیکن ان حکومتوں کے زوال نے انہیں آزاد قومی ریاستیں بنا کر نئے سیاسی مستقبل کا تصور کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ان کی کوششوں میں مدد کرنا فاتحوں کی طرف سے مسلط کردہ امن تصفیہ تھا، جس نے عملاً، اوپر سے ڈی کالونائزیشن کا آغاز کیا۔ اس نے قومی خودارادیت کے اصول کو اپناتے ہوئے شکست خوردہ براعظمی طاقتوں کے ٹوٹنے کا جواز پیش کیا، اس طرح آئیڈیل ازم اور حقیقی سیاست کو ملایا۔ لیگ آف نیشنز کے بعد کے قیام کے ساتھ، اس اصول کو بین الاقوامی تعلقات کے نئے معیار کے طور پر شامل کیا گیا۔

3۔ تیسری دنیا میں ترکِ نوآبادیات (Third World Decolonisation)

ڈی کالونائزیشن کی دو لہریں جو تیسری دنیا کے ڈی کالونائزیشن سے پہلے تھیں کئی بار بار چلنے والے موضوعات کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایک تو سلطنتوں کے درمیان عالمی جنگوں کی اہمیت ڈی کالونائزیشن کے اتپریرک کے طور پر ہے۔ نہ صرف ان جنگوں نے نوآبادیات کی یکے بعد

دیگرے لہروں کا دروازہ کھولا۔ انہوں نے تشدد کو بھی منتقلی کے عمل کا ایک لازمی عنصر بنایا۔ اس منتقلی کا مقصد کیا حاصل کرنا تھا اس کے متضاد تصورات کے نتیجے میں تنازعہ کا ایک اور ذریعہ پیدا ہوا۔ اگرچہ قومی ریاست سب سے اہم آپشن بن گئی، لیکن یہ شاید ہی واحد تھا، اور اس کی ساخت اور حلقہ کسی بھی صورت میں خود واضح نہیں تھا۔ نئی ریاستوں کے علاقائی طول و عرض، نسلی ساخت، اور دیگر متعین خصوصیات کا تعین کرنے کی جدوجہد اکثر خانہ جنگی، نسلی تطہیر، اور مہاجرین کی آبادی کا باعث بنی۔ نوآبادیاتی حکومتوں کے خلاف پر تشدد جدوجہد کا ابتدائی سلسلہ ایشیا میں مرکوز تھا۔ جب کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریزوں نے اپنے جنوبی ایشیائی املاک سے کچھ حد تک جلد بازی اور وقار کے ساتھ دستبرداری اختیار کر لی تھی، ڈچوں نے انڈونیشیا کے لوگوں پر اپنی حکمرانی بحال کرنے کے لیے ایک پر عزم کوشش کی، جس سے ایک خونریز تنازعہ شروع ہوا جس نے انڈونیشیا کی منتقلی کو نشان زد کیا۔ جنگ کے بعد ڈی کالونائزیشن کا پہلا سے دوسرا مرحلہ۔

فرانسیسیوں نے ویت منہ کو کچلنے کی کوشش میں ویتنام میں اتنی ہی وحشیانہ مہم چلائی۔ چونکہ یہ مخالف استعماری تنظیم واضح طور پر کمیونسٹ تھی، اس لیے تنازعہ سرد جنگ میں الجھ گیا، جس میں امریکہ نے فرانسیسیوں کی حمایت کی جبکہ سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین نے ہوچی منہ کی افواج کی مدد کی۔ اس نے جنگ کو طول دیا اور اسے شدید تباہ کن بنا دیا۔ اس تنازعہ میں مرنے والوں کی تعداد تقریباً نصف ملین تھی، ان میں سے اکثر ویت نامی یا تو فرانسیسی حکمرانی سے خود کو چھڑانے کے لیے لڑ رہے تھے یا پھر کراس فائر میں پھنسے ہوئے معصوم شہری۔ لیکن 1954 میں Dien Bien Phu میں فرانسیسی افواج کی زبردست شکست نے ویت منہ کے حق میں لہر کا رخ موڑ دیا، آخر کار فرانسیسیوں کو ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ سامراجی طاقتوں کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ ان کے قوم پرست مخالفین نے آزادی اور خودارادیت کے ان اصولوں کی پاسداری کی جن کی حمایت انہوں نے خود محوری طاقتوں کے خلاف جنگ میں کی تھی۔ اس سے لبرل سامراج کے موروثی تضاد کو سر پر لے آیا- کہ جبر کے ذرائع اور لبرل انجام ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اپنے نوآبادیاتی رعایا کے خلاف اس طرح کے انتہائی تشدد، غیر قانونی اقدامات کو اکسانے سے، یورپی سلطنتوں نے اپنی حکمرانی کے نظریاتی دیوالیہ پن کو بے نقاب کیا۔ مزید برآں، ان کے اقدامات نے بین الاقوامی میدان میں بڑھتی ہوئی جانچ اور مذمت کو اپنی طرف متوجہ کیا جس نے ان نئی آزاد قومی ریاستوں کو بے مثال آواز دی جو ابھی نوآبادیاتی محکومیت سے ابھری تھیں۔

10.6 ترکِ نوآبادیات اور قومی مملکتیں (Decolonissation and the Nation-States)

آزاد خود مختار ریاست کا تصور اکثر ویسٹ فیلین بین الاقوامی تعلقات کے نظام سے ملتا ہے جو سترہویں صدی کے وسط میں یورپ میں تیار ہوا تھا، لیکن اس کی قوم پرستی اور قومی ریاست کے ساتھ تعلق بعد میں آیا، جو اٹھارویں صدی کے مشہور تصورات سے پیدا ہوا۔ خود مختاری، جس نے ایک ایسی آبادی کا وجود تصور کیا جس میں مشترکہ مرضی یا قومی شناخت مشترک ہو اور ایک الگ اور متصل آباد ہو علاقہ وہ لوگ جو قومی ریاست کو اپنی نوآبادیاتی جدوجہد کے ترجیحی نتائج کے طور پر دیکھنے آئے تھے وہ بین الاقوامی نظیروں سے متاثر تھے اور گھریلو دباؤ سے متاثر تھے۔

قومی ریاست فتح اور نو آبادیات کا المیہ دونوں تھی۔ اس کی فتح قومی خود ارادیت کے اصول کو عالمی معیار کے طور پر ڈھالنے میں مضمر ہے جس کے ذریعے سیاسی خود مختاری اور بین الاقوامی تعلقات کو اب ماپا اور چلایا جائے گا۔ ایک ایسا عمل جس کا آغاز تقریباً دو صدیاں قبل نو آبادیات کی پہلی لہر کے ساتھ ہوا تھا جس کا اختتام لاکھوں افریقیوں، ایشیائیوں اور دیگر غیر مغربی لوگوں کو آزادی دینے پر ہوا جو اس کے بعد قومی ریاستوں کے شہری بن گئے۔ ان نئی ریاستوں کو بین الاقوامی "قوموں کے خاندان" میں داخل کیا گیا تھا جو ادارہ جاتی طور پر اقوام متحدہ کی طرف سے مجسم کیا گیا تھا. ایک ہی وقت میں، قوم سازی کے عمل کے نفاذ سے پیدا ہونے والا المیہ، جس نے اکثر مختلف نسلی، مذہبی، لسانی اور دیگر ثقافتی گروہوں کے درمیان تنازعات کو جنم دیا جو نئی قوموں کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ شناخت ان تنازعات میں لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن گئے اور دسیوں لاکھوں اپنے گھروں سے بے گھر ہو گئے، دیرپا ناراضگی اور دشمنی چھوڑ کر۔

نو آبادیاتی حکمرانی سے آزادی کی زیادہ تر مہموں کے رہنماؤں کی طرف سے مشترکہ خصوصیت ان کی کاسموپولیٹنزم تھی۔ یہ افراد ہمیشہ کثیر لسانی تھے۔ ان میں سے بہت سے بیرون ملک سفر کر چکے تھے، اکثر تعلیمی مقاصد کے لیے۔ کچھ نے ثقافتوں میں شادی کی تھی۔ ان سب کے پاس دنیاداری کا احساس تھا، دوسری زمینوں اور لوگوں کی سمجھ تھی، جس نے سلطنتوں کے خلاف ان کی جدوجہد میں ان کی خوب خدمت کی۔ برطانوی سامراجی دنیا کی چند قابل ذکر مثالوں پر غور کریں۔ موہن داس گاندھی نے لندن میں بیرسٹر کی تربیت حاصل کی تھی، جہاں انہوں نے انگریزی رسم و رواج، لباس اور خیالات کو اپنایا۔ اس کے بعد اس نے جنوبی افریقہ میں بیس سال سے زیادہ عرصہ گزارا، قانون پر عمل کیا اور سول نافرمانی کی اپنی مخصوص حکمت عملی تیار کی۔ جب وہ 1915 میں ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے اپنی مادر وطن میں ایک مجازی اجنبی محسوس کیا اور اگلے چند سال اپنے آپ کو ملک کے ساتھ دوبارہ متعارف کرانے کی کوشش میں گزارے۔

گاندھی کے انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھی، جواہر لعل نہرو نے ہیرو اور کیمبرج کے اشرافیہ کے انگریزی تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد منزلہ لندن انز آف کورٹ میں قانونی تربیت حاصل کی۔ نہرو نے اپنی زندگی بھر برطانوی اور زیادہ وسیع پیمانے پر یورپی ثقافت کے لیے ایک مضبوط تعریف برقرار رکھی۔ وہ شخص جس نے کینیا کو آزادی دلائی، جومو کینیاٹا 1929 میں انگلینڈ گیا اور 1948 تک وطن واپس نہیں آیا۔ اس دوران اس نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی، لندن یونیورسٹی سے بشریات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ماسکو کا دورہ کیا، اور فعال ہو گئے۔ پین افریقی تحریک میں۔ ایک اور شخصیت جو پین افریقن ازم کی زد میں آئی وہ ٹرینیڈاڈ اور ٹوباگو کے مستقبل کے وزیر اعظم ایرک ولیمز تھے، جو 1932 سے 1948 تک انگلینڈ میں مقیم رہے اور آکسفورڈ سے تاریخ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ Kwame Nkrumah، آزاد گھانا (گولڈ کوسٹ) کے بانی باپ، نے ایک دہائی ریاستہائے متحدہ میں گزاری، جہاں انہوں نے بیچلر اور دو ماسٹرز کی ڈگریاں حاصل کیں، اس کے بعد برطانیہ میں کئی سال رہائش اختیار کی، جہاں وہ بھی پین-افریقین کی طرف راغب ہوئے۔ حلقے ان میں سے بہت سے لوگ جنہوں نے اپنے ممالک کو فرانسیسی حکمرانی سے آزادی دلائی اسی طرح کی رفتار پر عمل کیا۔ آزاد تیونس کے پہلے وزیر اعظم حبیب بورگیبا نے فرانس میں قانون کی تعلیم حاصل کی تھی اور ایک فرانسیسی خاتون سے شادی کی تھی۔ احمد بن بیلا، انقلابی نیشنل لبریشن فرنٹ کے رہنما جو آزاد الجزائر کے پہلے صدر بنے، ایک فرانسیسی فٹ بال ٹیم کے لیے کھیلے تھے اور فرانس اور اٹلی دونوں میں لڑتے ہوئے

1936 سے 1945 تک فرانسیسی فوج میں خدمات انجام دیں۔

جہاں قوم پرست اپیلیں عوام کو متاثر کر سکتی ہیں، وہیں عوام آزادی جیتنے کی مہم کو پیچیدہ بنا سکتے ہیں۔ کسانوں، مزدوروں، بازاری خواتین اور دیگر عام لوگوں کو شامل کرنے کے لیے، کاسموپولیٹن اشرافیہ کو جنہوں نے آزادی کی تحریکوں کی قیادت کی تھی، اپنے خدشات کو ان طریقوں سے حل کرنا تھا جن کو وہ سمجھ سکتے تھے۔ نوآبادیاتی مخالف مہم چلانے والوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ زمین، مزدوری، اور ٹیکس کے مسائل سے نمٹیں جو خود نوآبادیاتی دائرے میں ہی واقع تھے۔ اور ان کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ مقامی حلقوں سے اپنے اپنے ثقافتی رجسٹروں میں اپیل کریں، ان کے لباس، بولی، رسم و رواج، مذہبی علامات، اور معنی کے دیگر طریقوں پر توجہ اور حمایت حاصل کرنے کے لیے۔

قومی ریاستوں کے قیام کی ان کوششوں میں مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے اکثر کالونیوں کے اندر الگ الگ کمیونٹیز کے درمیان علاقائی، پیشہ ورانہ، لسانی، نسلی اور دیگر اختلافات کو بڑھاوا دیا۔ اکثر نتیجہ خانہ جنگی، نسلی تطہیر اور جبری نقل مکانی کی صورت میں نکلتا تھا۔ خانہ جنگی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے خطوں میں افریقہ، ایشیا اور دیگر مقامات ہیں جو ڈی کالونائزیشن کی تیسری لہر سے گزرے ہیں۔ جب 1947 میں برصغیر پاک و ہند کو آزاد ریاستوں میں تقسیم کیا گیا تو اس نے بیسویں صدی میں نوآبادیاتی قوم کی تعمیر کے سب سے خونی اور سب سے زیادہ تکلیف دہ واقعات کو جنم دیا۔ کئی دہائیوں کے پارلیمانی کمیشنوں، حکومتی گول میزوں اور انگریزوں کے آئینی بلیو پرنٹس کے باوجود، اس قسم کی ریاست کے بارے میں کوئی اتفاق رائے نہیں ہو سکا جو راج کی جگہ لے۔ انگریزوں کے دستبرداری کے لیے تیار ہونے کے بعد متعدد گروہوں —ہندو، مسلمان، اور سکھ، بنگالی، پنجابی، اور تامل، شہزادے اور کمیونسٹ، درج فہرست ذاتیں اور قبائل اور بہت کچھ— نے پوزیشن حاصل کی۔ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ، جن کی دشمنی سیاسی منظر نامے پر حاوی تھی، نے ناقابل مصالحت مقاصد کا تعاقب کیا، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا دی جس نے برطانوی ہندوستان کو انتشار کے دہانے پر پہنچا دیا۔ تقسیم جلد ہی تعطل کا واحد حل نظر آیا۔

مسلمانوں کے لیے الگ ریاست کے قیام کے فیصلے کے بعد بھی برصغیر کے بہت سے باشندوں کو اس بات کی بہت کم سمجھ تھی کہ تقسیم کا کیا مطلب ہے۔ کچھ کو اندازہ نہیں تھا کہ نئی سرحدیں کہاں ہیں اور ان کا تعلق کس ملک سے ہے۔ ہندو اور مسلم انتہا پسندوں نے دوسری کمیونٹی کے افراد کے خلاف نسلی صفائی کی منظم مہم شروع کی۔ شاید دس لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے، دسیوں ہزار خواتین کی عصمت دری کی گئی، مسخ کیا گیا اور اغوا کیا گیا، اور ایک اندازے کے مطابق 12-20 ملین پناہ گزین اپنے گھروں سے بھاگنے پر مجبور ہوئے، مصنوعی سرحدوں کے پار غیر مانوس زمینوں میں پناہ کی تلاش میں۔ یہ انتقام کے ساتھ قوم کی تعمیر تھی۔ اس نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تلخی کا دیرپا ورثہ چھوڑا۔

کانگو میں، 1960 میں فوج کی بغاوت نے بیلجیئم کی نوآبادیاتی حکومت کے اچانک خاتمے کا سبب بنا، لیکن فوری طور پر اقتدار میں آنے والی قوم پرست حکومت کو اس وسیع وسطی افریقی ملک کے کئی حصوں میں علیحدگی پسند تحریکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دیگر قابل ذکر پوسٹ نوآبادیاتی خانہ جنگیاں نائیجیریا، انگولا اور سوڈان میں ہوئیں۔ نائجیریا کے 1960 میں برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے سات سال بعد،

طویل عرصے سے ابلتے ہوئے نسلی کشیدگی نے ملک کے جنوب مشرقی علاقے پر قبضہ کرنے والے اِگبولوگوں کی طرف سے علیحدگی پسند تحریک کو جنم دیا۔ بیافران جنگ کے نتیجے میں ایک ملین افراد ہلاک ہوئے۔ انگولا کی خانہ جنگی 1975 میں پرتگالی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی شروع ہوئی اور یہ کئی دہائیوں تک جاری رہی۔ اس نے آزادی کی دوسر کردہ تحریکوں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا، ہر ایک کو ملک کے مختلف علاقوں سے حمایت حاصل تھی جہاں مختلف نسلی گروہ غالب تھے۔ اس جنگ میں نصف ملین انگولائی مارے گئے اور لاکھوں بے گھر ہوئے۔ ہماری تیسری مثال، سوڈان، 1955 میں اپنی آزادی کے بعد سے بار بار خانہ جنگی کا شکار رہا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کی ایک بڑی لائن مسلم شمال بمقابلہ دشمن اور عیسائی جنوب ہے۔

10.7 لاطینی امریکہ میں ترکِ نوآبادیات (Decolonisation in Latin America)

لاطینی امریکہ میں، افریقی اور ایشیائی کالونیوں سے بہت پہلے ہسپانوی اور پرتگالی کالونیوں نے آزادی حاصل کی تھی۔ میکسیکو اور دیگر جگہوں کی ہسپانوی کالونیوں میں انقلابی تحریکیں شروع ہوئیں اور وینزویلا میں آزادی کی جنگیں شروع ہوئیں۔ 19 ویں صدی کے اوائل تک ارجنٹائن وغیرہ۔ 1825 تک اسپین نے کیوبا اور پورٹو ریکو کے علاوہ اپنی وسیع سلطنت کھو دی۔ انگریزوں کے خلاف شمالی امریکہ کی جدوجہد کے برعکس جس کی وجہ سے تیرہ کالونیاں ریاستہائے متحدہ بن گئیں، ہسپانوی امریکی بغاوتوں اور آزادی کی جنگوں نے سترہ الگ الگ جمہوریہ کی راہ ہموار کی۔ کیوبا اور پورٹو ریکو ہسپانوی کرپٹ حکمرانی کے تحت جاری رہے یہاں تک کہ امریکہ اسپین کے خلاف کیوبا کی تحریک میں شامل ہو گیا۔ کیوبا نے نہ صرف اسپین کے خلاف آزادی کی انقلابی جنگ لڑی بلکہ امریکی تسلط کے خلاف بھی۔ امریکہ نے 1898 میں اسپین کو کیوبا سے نکال دیا، لیکن امریکی سرمایہ کاروں نے اس کے بعد اس جزیرے میں ایک غالب پوزیشن حاصل کر لی تاکہ کیوبا اپنے معاشی وسائل پر کنٹرول کھو بیٹھا۔

فیڈل کاسترو کی قیادت میں، کیوبا نے بتستا کی آمرانہ حکومت کے خلاف گوریلا جنگ لڑی اور دسمبر 1958 میں اس کا تختہ الٹ دیا۔ بعد میں کاسترو نے امریکی املاک کو ضبط کر لیا، سوویت حمایت حاصل کی اور مارکسزم-لینن ازم سے متاثر ایک حکومت قائم کی۔ سرد جنگ کے بعد کے دور میں بھی امریکہ اور کیوبا کے درمیان نظریاتی کشمکش آج تک جاری ہے۔ اسپین اور پرتگال نے لاطینی امریکہ میں اپنی سلطنت دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ تاہم، 1823 میں، ریاستہائے متحدہ نے منرو نظریے کی نقاب کشائی کی جس نے موجودہ کالونیوں کو یورپی طاقتوں کی انحصار تسلیم کرتے ہوئے، کسی بھی یورپی طاقت کے ذریعے مستقبل میں نوآبادیات کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ درحقیقت لاطینی امریکہ میں اپنے مفادات کو فروغ دینے کے لیے برطانوی اور امریکی چالوں کا ایک حصہ تھا۔

10.8 افریقہ میں ترکِ نوآبادیات (Decolonisation in Africa)

جنوبی افریقہ اور نمیبیا میں افریقی عوام کی جدوجہد ڈی کالونائزیشن کی تاریخ میں خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ تاریخی طور پر، ڈچ سب سے پہلے 1652 میں جنوبی افریقہ میں اس جگہ پر آباد تھے جو آج کیپ ٹاؤن ہے۔ انگریزوں کے آنے اور 1806 میں کیپ ٹاؤن میں برطانوی

نو آبادیاتی حکمرانی کے قیام کے ساتھ 19 ویں صدی کے پہلے نصف میں سفید فاموں کی آباد کاری کا علاقہ زیادہ تیزی سے پھیلا، ڈچ آباد افریقی باشندوں کو کیپ چھوڑ کر شمال کی طرف جانے پر مجبور کیا گیا۔اورنج دریا-1830 کی دہائی میں بڑے پیمانے پر خروج، عظیم ٹریک پر اختتام پذیر ہوا۔اس کے نتیجے میں دو آزاد افریقی جمہوریہ، اورنج فری اسٹیٹ اور ٹرانسوال، اور نٹال کی نئی برطانوی کالونی کی تشکیل ہوئی۔ان میں سے ہر ایک میں، جیسا کہ کیپ کالونی میں، نسلی طور پر طبقاتی معاشرہ تیار ہوا جس میں گوروں نے غلبہ کی حیثیت اختیار کی اور افریقیوں کو غلامی کی حالت میں کم کر دیا گیا۔اگرچہ کیپ اور نٹال میں انگریزوں کی اعلان کردہ پالیسی امتیازی سلوک کے خلاف تھی، لیکن عملی طور پر، تاہم، جائیداد کی اہلیت نے حق رائے دہی کو زیادہ تر گوروں تک محدود کر دیا۔ڈچ افریقنر جمہوریہ میں، افریقیوں کو حق رائے دہی سے انکار کیا گیا، اورنج فری اسٹیٹ میں زمین کی ملکیت حاصل کرنے سے روک دیا گیا اور ٹرانسوال کے سفید مقبوضہ علاقوں میں پاس لے جانے کا پابند کیا گیا۔کمبرلی میں ہیروں کی دریافت اور 19 ویں صدی کے اختتام کے بعد ٹرانسوال میں سونے کے بڑے ذخائر نے ڈچ اور انگریزوں کے درمیان ان علاقوں کے کنٹرول کے لیے کشمکش کا باعث بنا، جس کے نتیجے میں بالآخر ولندیزیوں کی شکست ہوئی اور اس کے نتیجے میں 19 ویں صدی کے آخر میں 1910 میں جنوبی افریقہ کی یونین، اورنج فری اسٹیٹ، ٹرانسوال، کیپ کالونی اور نٹال کی افریقی جمہوریہ کو اکٹھا کرتی ہے۔یونین آف ساؤتھ افریقہ نے ڈومینین کا درجہ حاصل کر لیا اور بعد میں 1934 میں برطانوی سلطنت کے اندر ایک خود مختار آزاد ریاست بن گئی۔1961 میں اس نے برطانیہ کے ساتھ اپنے روابط توڑ لیے، اور دولت مشترکہ کو ایک جمہوریہ بننے کے لیے چھوڑ دیا۔نسل پرست حکومت-جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت-نے افریقیوں کے بنیادی انسانی حقوق سے بھی انکار کیا۔حکومت کو بہت سی مغربی حکومتوں کی حمایت حاصل تھی جن کا جنوبی افریقہ میں اسٹریٹجک اور اقتصادی مفاد تھا۔

چونکہ افریقی عوام کے پاس کوئی قانونی حقوق یا آزادی نہیں تھی، اس لیے حکومت کی مخالفت کو خفیہ رہنا پڑا۔جیسا کہ رنگ برنگی حکومت تیزی سے سفاک ہوتی گئی، اس کی افریقی مخالفت نے بھی عسکریت پسندی کو جنم دیا۔افریقی مزاحمت جو سفید فاموں کے خلاف ثقافتی مزاحمت کے طور پر شروع ہوئی تھی بالآخر 1923 میں افریقن نیشنل کانگریس کی شکل اختیار کر گئی اور نیلسن منڈیلا اس کے رہنما کے طور پر ابھرے۔اسے 1963 میں ریوونیا ٹریل کے بعد عمر قید کی سزا سنائی گئی۔تیسری دنیا کے ممالک اور ناوابستہ تحریک نے بین الاقوامی فورمز پر جنوبی افریقہ کے مقصد کی حمایت کی۔1980 اور 1990 کی دہائیوں میں، اقوام متحدہ کے اندر اور ترقی پذیر دنیا دونوں کے بڑھتے ہوئے بین الاقوامی دباؤ نے مغربی ممالک کو افریقی ممالک کے کچھ مطالبات ماننے پر مجبور کیا۔اس نے رنگ برنگی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ افریقی اپوزیشن کے ساتھ بات چیت پر راضی ہو۔1993 میں نیلسن منڈیلا کو جیل سے رہا کیا گیا۔طویل مذاکرات کے بعد 1994 میں انتخابات ہوئے اس طرح پارلیمانی انتخابات کے ساتھ ہی اقتدار سیاہ فام اکثریت کو منتقل ہو گیا۔

جنوبی مغربی افریقہ (نمیبیا) کی سابق جرمن کالونی جنوبی افریقہ کے مینڈیٹ کے تحت آئی۔جب اقوام متحدہ نے لیگ آف نیشنز کی کامیابی حاصل کی، تو جنوبی افریقہ نے جنوبی مغربی افریقہ پر ٹرسٹی شپ کا دعویٰ کیا، اس طرح اس علاقے میں رنگ برنگی پھیل گئی۔اقوام متحدہ نے جنوبی افریقہ کے قبضے کو غیر قانونی قرار دیا اور 1967 میں اقوام متحدہ نے علاقے کے انتظام کے لیے نمیبیا کے لیے کونسل قائم کی۔ساؤتھ

ویسٹرن افریقن پیپلز آرگنائزیشن (SWAPO) کی طرف سے طویل جدوجہد اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے نفاذ کے بعد، جنوبی مغربی افریقہ نے نمیبیا بننے کے لیے آزادی حاصل کی۔

10.9 عالمی سیاست پر ترکِ نوآبادیات کے اثرات

(Impact of Decolonisation on World Politics)

نئی آزاد قوموں، خاص طور پر ایشیا اور افریقہ میں، کا ہدف یہ تھا کہ وہ نہ صرف سیاسی طور پر خود مختار ہوں بلکہ دنیا میں اپنے طور پر ایک ہستی کے طور پر پہچانے جائیں، عالمی معاملات میں اپنی بات کہنے کے مساوی حقوق کے ساتھ۔ بہت سے ایشیائی اور افریقی ممالک کے نقطہ نظر سے، سرد جنگ کے دوران The USA اور The USSR کی طرف سے ان پر جو کنٹرول قائم کیا گیا تھا، جوہر طور پر، ان کے باضابطہ نوآبادیات کے ذریعے ان پر کیے گئے کنٹرول سے مختلف نہیں تھا۔ جہاں تک ان کا تعلق تھا، دونوں حالات بہت مختلف نہیں لگ رہے تھے۔ The USA یا The USSR کی سربراہی میں بننے والے اتحادوں میں شامل نہیں ہونا چاہتے، زیادہ تر نئی آزاد قومیں غیر جانبدار رہنے کی کوشش میں ناوابستہ تحریک میں شامل ہوئیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس طرح کے فوجی یا سیاسی اتحاد کا حصہ بننے کا مطلب یہ ہوگا کہ پہلے سے ہی قلیل وسائل سرد جنگ کے مقاصد کو برقرار رکھنے میں لگیں گے، اور زیادہ ضروری ترقیاتی کاموں میں استعمال نہیں ہوں گے۔ تاہم، ہر نئے بننے والے یا نئے آزاد ملک نے ایسا محسوس نہیں کیا: مثال کے طور پر پاکستان نے سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن یا CENTO میں شامل ہو کر باضابطہ طور پر امریکہ کے ساتھ اتحاد کیا۔

ایشیا اور افریقہ کی نوآزاد قوموں کے درمیان یکجہتی کی تعمیر کی طرف پہلا بڑا قدم 1955 کی بنڈونگ کانفرنس تھی۔ اس کے بعد 1961 میں ناوابستہ تحریک شروع ہوئی، جس نے تیسری دنیا کی یکجہتی کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ ایک ایسی دنیا جو تیزی سے USA اور USSR کے درمیان تقسیم ہوتی جارہی تھی۔ NAM کا مقصد کسی بھی سپر پاور سے منسلک نہ ہو کر تیسرا پاور بلاک بننا ہے۔

ڈی کالونائزیشن کے عمل کی ایک بہت اہم وراثت ریاستوں کے درمیان بین الاقوامی سرحدوں کی از سر نو تشکیل یا نئی ریاستوں کا قیام ہے، جیسے پاکستان اور اسرائیل۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سیاسی جھٹکا اکثر پیچیدہ تنازعات یا پائیدار دشمنیوں کا باعث بنتا ہے جو علاقائی یا عالمی سیاست کی مستقل خصوصیت بن جاتی ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر پائیدار دشمنیاں اکثر علاقے کے سوال پر پیدا ہوتی ہیں۔ کسی قوم کے لیے اس کی سلامتی یا وقار کے لحاظ سے علاقے کی وضاحت کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، یہ تنازعات طویل مدت میں حل کرنا بہت مشکل ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں کام پر دو مسائل ہیں جو اکثر ایک دوسرے کو ختم کرتے ہیں۔

سب سے پہلے، ایشیا اور افریقہ میں بہت سی سرحدیں یورپی طاقتوں نے اپنی حکومت کے دوران کھینچی تھیں۔ ان حدود کو کھینچنے کی دلیل کا یورپ میں طاقت کے توازن سے زیادہ تعلق تھا، اور زمینی مذہبی یا نسلی حقائق سے کم تعلق تھا۔ یہ وہ حدود ہیں جو یورپی قوم کے کالونی چھوڑنے کے بعد بھی قائم رہیں۔ دوسری بات یہ کہ سرحدیں صرف اس وقت تک برقرار رہیں جب تک کہ یورپی نوآبادکار زمین پر اپنی مادی

طاقت استعمال کرتے رہے۔ تاہم، ان کے جاتے ہی بڑے پیمانے پر مذہبی یا نسلی تشدد اکثر پھوٹ پڑا۔ بہت سے معاملات میں، اس کی وجہ سے سیاسی نقشے کو دوبارہ ترتیب دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اکثر نہیں، ایک طویل عرصے سے جاری سرحدی تنازعہ ڈی کالونائزیشن کی میراث تھی۔ بہت سے معاملات میں، یہ نوزائیدہ سرحدی تنازعات سرد جنگ کی پیچیدگیوں میں الجھ گئے، جس نے انہیں مزید پیچیدہ بنا دیا۔ عرب-اسرائیل تنازعہ اور ہند-پاک تنازعہ جیسی نمایاں مثالیں - خاص طور پر کشمیر پر - کو پائیدار دشمنیوں کے طور پر درجہ بندی کیا جاتا ہے، اور یہ عالمی سیاست کی ایک پائیدار خصوصیت رہی ہیں۔

10.10 سامراجیت مخالف لیگ (League against Imperialism)

سامراجیات مخالف لیگ اور نوآبادیاتی جبر جنگ کے دور میں ایک بین الاقوامی سامراج مخالف تنظیم تھی۔ اسے مظلوم لوگوں کی لیگ اور عالمی سامراج مخالف لیگ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، یا غلط نام کے تحت سامراج مخالف لیگ۔

یہ 10 فروری 1927 کو بیلجیئم کے برسلز کے ایگمونٹ پیلس میں دنیا بھر کے 175 مندوبین کی موجودگی میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ اہم تھا کیونکہ اس نے کمیونسٹ دنیا کے نمائندوں اور تنظیموں کو، اور نوآبادیاتی دنیا سے نوآبادیاتی مخالف تنظیموں اور کارکنوں کو اکٹھا کیا۔ 175 مندوبین میں سے 107 کا تعلق نوآبادیاتی دور میں 37 ممالک سے تھا۔ کانگریس کا مقصد عالمی سطح پر "سامراج مخالف بڑے پیمانے پر تحریک" بنانا تھا۔ یہ تنظیم کمیونسٹ انٹرنیشنل (کومینٹرن) کے تعاون سے قائم کی گئی تھی۔ ہندوستانی مارکسی مورخ وجے پرشاد کے مطابق، تنظیم کے نام میں لفظ "لیگ" کا شامل ہونا لیگ آف نیشنز پر براہ راست حملہ تھا، جس نے مینڈیٹ کے نظام کے ذریعے استعمار کو دوام بخشا۔ نہرو تقریباً 3259 دن جیل میں رہے اور انہیں بالترتیب 12 دن اور 1041 دن کی مختصر ترین اور طویل ترین مدت کے ساتھ نو مرتبہ قید کیا گیا۔

خوش قسمتی سے، وہ 5 اکتوبر 1923 سے 13 اپریل 1930 تک جیل سے باہر رہے۔ اس نے انہیں بین الاقوامی سیاست کے افق کو تلاش کرنے کا موقع فراہم کیا جب وہ اپنی بیٹی پریہ درشنی اور بیوی کملا نہرو کے ساتھ مارچ 1926 میں یورپ کا دورہ کیا۔ مؤخر الذکر کا علاج. اپنے سفر کے دوران، اس نے برلن کا دورہ کیا اور اسے معلوم ہوا کہ سامراج کے ہاتھوں مظلوم قومیتوں کی ایک کانگریس شروع ہونے والی ہے۔ برسلز کانگریس—جیسا کہ یہ مقبول ہوئی—کو 1927 میں لیگ نے سامراجیت اور نوآبادیاتی جبر کے خلاف منظم کیا تھا۔ نہرو نے برسلز میں انڈین نیشنل کانگریس (INC) کی نمائندگی کی اور یہ نہرو کی سیاسی ترقی میں ایک عظیم سنگ میل ثابت ہوا۔ اس نے نہ صرف نہرو کی شخصیت کو بلکہ INC کو بھی ایک بین الاقوامی نقطہ نظر فراہم کیا، کیونکہ ہندوستان کی قوم پرست جدوجہد کو پہلی بار بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا اور اسے عالمی پلیٹ فارم پر ایک غیر متنازعہ جواز حاصل ہوا۔

برسلز کانگریس کے موقع پر، نہرو نے عالمی برادری کے سامنے ایک تقریر کی جس میں برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان کی جدوجہد کی تین جہتی حکمت عملی پیش کی گئی۔ نہرو نے اپنی تقریر میں (1) برطانوی راج سے ہندوستان کی آزادی کا سبب پیش کیا۔ جو نہرو کے مطابق (2) قوم پرستانہ خواہش تھی اور اس کی بنیاد قوم پرستی تھی۔ مہاتما گاندھی کا حوالہ دیتے ہوئے، نہرو نے کانگریس کو مطلع کیا کہ (3)

ہندوستان کی قوم پرستی انتہائی شدید بین الاقوامیت پر مبنی ہے۔ برسلز کانگریس نے مظلوم ممالک کی حالت زار کا جائزہ لیا اور اس کے لیے سوشلسٹ حل تجویز کیا۔ نہرو نے دلیل دی کہ دنیا کے مظلوم ممالک میں قوم پرستی دوسرے احساسات کے مقابلے میں بنیادی احساس بن گئی ہے۔ انہوں نے سوشلسٹ تھیوری آف سٹیٹ کو قبول کیا لیکن کافی سمجھداری سے یہ شک پیدا کیا کہ ہندوستان میں اس عقیدے کو اپنائے گی۔ برسلز کانگریس کا انعقاد دنیا بھر میں مظلوم اقوام کی جاری آزادی کی تحریکوں کے درمیان تعاون کے روابط قائم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ کانگریس میں، نہرو نے ہندوستان میں قوم پرست جدوجہد کے محرکات کو عوام کی سیاسی اور معاشی آزادی پر روشنی ڈالی اور کانگریس کو دنیا کے دیگر حصوں میں جاری تحریکوں کے ساتھ ہندوستان کی طرف سے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ نہرو کی کوششوں کے نتیجے میں برسلز کانگریس نے اپنی قرارداد میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا اور اعلان کیا کہ ہندوستان کی بیرونی تسلط سے آزادی مظلوم دنیا کی مکمل آزادی کے لیے ایک ضروری قدم ہے۔ قرارداد میں یہ بھی کہا گیا کہ ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کی آزادی ظلم سے حقیقی آزادی کے لیے ایک لازمی امر ہے۔

10.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عزیز طلبا، اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو ترکِ نوآبادیات کی مختلف جہتوں کا علم ہوا۔ ترکِ نوآبادیات ایک پر تشدد عمل تھا جس نے سامراجی حکمرانوں کو نوآبادیاتی عوام کے خلاف کھڑا کیا۔ اس نے استعمار مخالف قوم پرستوں کو بھی ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کیا۔ جن دو فریق ممالک کے نمائندوں نے خود مختاری کی رسمی منتقلی کا انعقاد کیا، دونوں کے پاس ترکِ نوآبادیات کے بعد ہونے والے ہنگامے اور صدمے کو کم کرنے کی وجوہات تھیں۔ سامراجی ریاستیں نوآبادیاتی محکوم عوام کو اپنے کنٹرول میں رکھنے سے قاصر تھیں، اس لیے انہوں نے اس دستبرداری کو فراخ دلی کے طور پر پیش کیا۔ انہوں نے دستبرداری میں تاخیر کا جواز اس طرح پیش کیا کہ وہ تو مقامی عوام کو خود کار حکمرانی کی تربیت دے رہے تھے۔ اگر وہ پہلے ہی ترکِ نوآبادیات پر عمل کر لیتے تو کالونیوں میں تشدد عام ہو جاتا اور قانون کا نام و نشان نہ بچتا!

جب اقتدار کی منتقلی سے پہلے ہونے والے تشدد اور انتشار نے سامراجی حکام کو نیک نیتی کا دعویٰ کرنے اور خوش اسلوبی ظاہر کرنے کے لائق نہیں چھوڑا تو انہوں نے دستاویزات کی تباہی اور دانستہ طور پر بھول جانے کی کارروائیوں کے ذریعے عوامی یادداشت سے اس طرح کی ناخوشگواری کو مٹانے کی پوری کوشش کی۔

10.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

ترکِ نوآبادیات

امریکی نوآبادیات

سفید فام آبادکاری

قومی تحریک ہند

قوم پرست نقطۂ نظر

مقامی تحدیدات کا نقطۂ نظر

بین الاقوامی سیاق وسباق کا نقطۂ نظر

10.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اقوام متحدہ میں کتنے رکن ممبر ہیں؟
2. Decolonisation کی اصطلاح کا بانی کون ہے؟
3. ترکِ نوآبادیات کے کتنی اقسام ہیں؟
4. ترکِ نوآبادیات کا قوم پرست نقطۂ نظر کیا ہے؟
5. قومی مملکتوں کا عروج کیسے ہوا؟
6. اقوام متحدہ کب قائم کیا گیا؟
7. لیگ آف نیشنز کب بنا؟
8. CENTO کیا ہے؟
9. SWAPO کیا ہے؟
10. برسلز کانگریس کب منعقد کی گئی؟

10.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ترکِ نوآبادیات کے معنی ومفہوم کو بیان کیجیے۔
2. ترکِ نوآبادیات کی اقسام پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. ترکِ نوآبادیات کی مختلف لہروں پر ایک مضمون لکھیے۔
4. ترکِ نوآبادیات اور قومی مملکتوں کے عروج پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. عالمی سیاست پر ترکِ نوآبادیات کے اثرات کو بیان کیجیے۔

10.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ترکِ نوآبادیات کے معنی ومفہوم کو بیان کیجیے۔ ترکِ نوآبادیات کی اقسام کی وضاحت کیجیے۔
2. لاطینی امریکہ اور افریقہ میں ترکِ نوآبادیات کی وضاحت کیجیے۔

3. سامراجیت مخالف لیگ کیا تھی؟ اس کے اغراض و مقاصد پر ایک نوٹ لکھیے۔

10.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Chamberlain, M.E., *Decolonisation*, 1985.
2. Fieldhouse, D.K., *Colonialism: An Introduction*, 1981.
3. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
4. Kennedy, Dane, *Decolonization: A Very Short Introduction*, 2016.
5. Kulke, H., and D. Rothermund, *A History of India*, 2004.
6. Lenin, Vladimir, *Imperialism: The Highest Stage of Capitalism*, Penguin, UK, 2010.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Piketty, Thomas, *Capital and Ideology*, The Belknap Press of Harvard University Press, Cambridge, 2020.
9. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
10. Rothermund, Dietmar, *The Routledge Companion to Decolonization*, 2006.

اکائی 11۔ چین کا کمیونسٹ انقلاب اور اس کے اثرات

(Chinese Communist Revolution and Its Impact)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 ایشیائی ملکوں میں نو آبادیاتی نظام اور سامراجیت کا قیام

11.3 مغربی ممالک اور چین کا تعلق

11.4 پہلی عالمی جنگ کے بعد چین میں قومی حکومت کا قیام

11.5 چین میں قومی تحریک کا آغاز اور اس کی سرگرمیاں

11.6 چین میں کمیونسٹ انقلاب اور کمیونزم کا قیام

11.7 قومی زندگی پر چینی انقلاب کے اثرات

11.8 چینی انقلاب کا بین الاقوامی رشتوں پر اثر

11.9 اکتسابی نتائج

11.10 کلیدی الفاظ

11.11 نمونہ امتحانی سوالات

11.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

11.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

11.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

11.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید (Introduction)

ایشیااور افریقہ میں مغربی ملکوں کی نو آبادیات قائم کرنے کی تگ ودونے چین کو بھی ایک نو آبادیاتی ملک بنادیا۔ چین صدیوں سے ایک نایاب ملک تھا۔اس کی سیاست علیحدہ تھی اروہاں روایتی شہنشاہیت قائم تھی جو علیحد گی کو پسند کرتی تھی۔دوسری تہذیبوں سے ان کا بس روایتی انداز کارشتہ تھا۔ان کی سیاست، معیشت، سماج، ثقافت، تہذیب علیحد گی پسندی کا شکار تھی۔ لیکن نو آبادیات کی تلاش می مغربی ممالک وہاں پہنچ گئے اورانہوں نے اپنی علیحدہ علیحدہ حکومت قائم کرلی۔ چین کے حکمراں اپنے ملک کی سیاست میں دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذاانہوں نے غیر ملکیوں کو سرحدی علاقوں پر اپنی نو آبادیاتی بستیاں قائم کرنے اور محدودانتظامی اختیارات دے کر تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں مغربی ممالک سرمایہ داری نظام کے زیراثر زیادہ منافع کمانے کی بھوک میں گرفتار تھے۔ لہٰذا محدود تجارت کے بجائے بڑے پیمانے پر تجارت، قدرتی وسائل کااستحصال اور سیاسی دخل اندازی کرنے لگے۔اس کو چین کے حکمراں طبقہ نے پسند نہیں کیااور وقتاًفوقتاًتنبیہہ بھی کرتے رہے جس کا کوئی خاص اثر مغربی ممالک پر نہیں پڑا۔انہوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

منافع خوری میں مغربی ممالک کی دلچسپی اس حدتک بڑھ گئی کہ انہوں نے چین میں افیم کی تجارت شروع کردی۔وہاں کے لوگوں کو نشہ کی عادت ڈال دی اورافیم ہندوستان سے برآمد کر کے منافع کماتے رہے۔اس کا چین کے حکمرانوں نے مخالفت کی جس کے نتیجے میں دوافیم کی جنگیں ہوئیں۔انگریزوں نے اپنی طاقت کے زور پر چینی حکمرانوں کو معاہدہ پر دستخط کروائے۔ شرم اور ندامت کابدلہ لینے کے لئے چین کی عوام نے بغاوت بھی کی۔ تھائپنگ اور بوکسر کی بغاوت اس کی مثالیں ہیں۔ مغربی ممالک کی جارحیت اور توسیع پسندانہ پالیسی جاری رہی۔ سُن یات سین نے 1011ءکاانقلاب لاکر قوم پرستوں کی حکومت کی داغ بیل ڈالی پھر چیانگ کائی شیک نے اس حکومت کی قیادت کی لیکن چین میں کسانوں، مزدوروں اور عوام کااستحصال جاری رہا۔ قومی نظریہ کی حاملِ قیادت اوران کی حکومت کودوسری عالمی جنگ کے دوران کمیونزم کے حامی سیاستدانوں نے چیلنج کیااوروہ قوم پرستوں کی تنقیداوران کی ناکامی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔1949ءمیں ماوتسے تنگ کی قیادت میں کمیونسٹوں نے قوم پرست حکومت کاخاتمہ کرکے کمیونسٹ حکومت کاقیام کیااوراس کی قیادت میں سیاسی، سماجی اور معاشی اصلاحات کرکے عوام کوان کے حقوق عطا کئے۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعدآپ

- اس بات کا جائزہ لے سکیں گے کہ چین میں نو آبادیاتی نظام اور سامراجیت کے قیام میں کون سے عوامل کارفرما تھے۔
- مغربی ممالک اور چین کے تجارتی تعلقات کو جان سکیں گے۔
- اس بات کا تنقیدی اور تفصیلی جائزہ لے سکیں گے کہ چین میں کیوں اور کیسے قومی حکومت کے قیام عمل میں آیااس کے علاوہ چین کی قومی تحریک کی ابتدااور سرگرمیوں پر تبصرہ کرسکیں گے۔

- چین میں کمیونسٹ انقلاب اور کمیونزم کے قیام کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- اس بات کا تجزیہ کر سکیں گے کس طرح انقلاب نے چین کی سیاست، معیشت اور سماج کو اثرانداز کیا اسی کے ساتھ انقلاب کا بین الاقوامی رشتوں پر اثرات کا تفصیلی جائزہ لے سکیں گے۔

11.2 ایشیائی ملکوں میں نوآبادیاتی نظام اور سامراجیت کا قیام

(Foundation of Colonialism and Imperialism in the Asian Countries)

19ویں صدی میں یورپ کے ترقی یافتہ ممالک ایشیا اور افریقہ میں نوآبادیات قائم کرنے کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ اوّل: نوآبادیاتی ملک کو اپنی صنعتی مصنوعات کے لئے بطور بازار اور ان کے معدنیات اور خام مال کو اپنے ملکوں کو برآمد کر کے استعمال کرنا۔ دوئم: امریکہ، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ میں مغربی ممالک کے باشندوں کو بھیج کر مغربی تہذیب کو بیسوح واشاعت تھی۔ ایشیائی ممالک میں چین اگرچہ آزاد ملک تھا مگر اس پر کئی یورپی ممالک کا تہذیبی غلبہ تھا۔ اگرچہ یورپی ممالک فرانس، پرتگال اور ہالینڈ کی بھی نوآبادیات تھیں، ہندوستان برطانیہ کے زیر تسلّط تھا۔

سامراجی طاقتوں نے مختلف حربہ اپنا کر ایشیا اور افریقہ میں اپنی نوآبادیات قائم کر کے سیاسی غلبہ قائم کر لیا۔ تجارت ان کا سب سے کامیاب اور آزمودہ ہتھیار تھا۔ پہلے بحیثیت تاجر ان ملکوں میں جاتے پھر سیاسی اقتدار کے حصول میں مشغول ہو جاتے۔ نئی سرزمین کی تلاش کے بعد ان سامراجی طاقتوں کو ان پر اپنا سیاسی تسلط قائم کرنے کا موقع مل جاتا پھر اس کو نوآبادیاتی ملک میں تبدیل کر دیئے۔ نوآبادیاتی ملک چونکہ قدرتی وسائل سے مالامال تھے اس لئے ان کو برائے استحصال اور بطور بازار استعمال کر کے دولت کمانے کا اچھا ذریعہ بنالیا۔ صنعتی انقلاب نے نوآبادیات قائم کرنے کے عمل کو بہت تیز کر دیا۔ کیونکہ صنعتی ممالک کو اپنی پیداوار کے لئے بازار چاہیئے تھا اور فیکٹریاں چلانے کے لئے خام مال اور مزدوروں کو کھلانے کے لئے غذائی اشیاء کی ضرورت تھی اور یہ سب کچھ نوآبادیاتی ملکوں پر سیاسی اقتدار کے قیام کے بعد بہت آسانی سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ دولت اکٹھا کرنے، اپنی اضافہ آبادی کو بسانے، مذہب کی تبلیغ واشاعت، غیر مہذب یافتہ ملکوں کو تہذیب یافتہ بنانے کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے نوآبادیات کی ضرورت تھی پر قبضہ ضروری تھا۔

1498ء میں واسکوڈی گاما کے ہندوستان پہنچنے کے بعد ایشیا میں نوآبادیاتی نظام کے قیام کا عمل شروع ہوا۔ انگلینڈ، فرانس، اسپین، پرتگال، ہالینڈ نے مختلف ممالک میں اپنی نوآبادیات قائم کر لیں۔ انگریزوں نے چین سے ہانگ کانگ لیکر اس پر اپنا تسلط جمالیا۔ پھر فرانس نے چین کے کئی علاقوں میں اپنا سیاسی تسلّط قائم کر لیا اس طرح چین کے کئی حصہ یورپی ممالک کے نوآبادیات بن گئے۔ چین مسلسل غیر ملکی غلبہ کی مخالفت کرتا رہا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جاپان نے منچوریا پر قبضہ جمالیا۔ پہلی جنگ کے بعد سامراجی طاقتوں کو اس وقت شدید جھٹکا لگا جب دنیا بھر میں نوآبادیاتی ملکوں میں قومیت کا جذبہ بیدار ہونے لگا اور کئی ایشیائی ملکوں میں آزادی کی جنگ زور پکڑنے لگی۔ آزادی کے لئے قومی تحریکوں نے سامراجیت کے استحکام کو چیلنج کر دیا۔ سامراجی طاقتوں نے اپنی نوآبادیات میں ترقی کے پیشِ نظر جدید تعلیم، جدید صحافت اور

جمہوری اداروں کو فروغ دیا۔ غیر ارادی طور پر ان اداروں کی حوصلہ افزائی ایک دن خود انگریزی کی حکومت کے لئے چیلنج بن کر سامنے آ گیا اور قومیت کے جذبہ کو فروغ دے کر آزادی کی تحریک کو تقویت بخشی۔

11.3 مغربی ممالک سے چین کا تعلق (China's Relationship with the Western Countries)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں سامراجیت ایک نظریہ ہے۔ جس کا مقصد پسماندہ ملکوں پر قبضہ کر کے انکا استحصال کرنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں سامراجیت کا مقصد اپنی طاقت اور اثر ورسوخ کا استعمال کر کے غیر ترقی یافتہ ممالک پر قبضہ کر کے تجارت اور سرمایہ کاری کے ذریعہ دولت اکٹھا کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہں نے دور دراز علاقوں سے تجارت کرنا شروع کیا اور پھر اپنی نو آبادیات قائم کر لیں۔ پر تگالی 16ویں صدی میں تجارتی مقاصد Canton پہنچے اس کے بعد برطانوی تاجروں نے بھی چین سے محدود تجارت شروع کی۔ چین ایک ایسا ملک تھا جس کو اپنی تہذیب، زبان، روایت، ثقافت پر فخر تھا، کے دنیا سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ چین نے غیر ملکیوں کو ملک کے سرحد سے محدود پیمانے پر تجارت کرنے کی اجازت دی تھی۔ کسی بھی غیر ملک سے چین سیاسی تعلق استوار نہیں کرتا تھا۔ چین میں بادشاہت تھی۔ وہاں کا شہنشاہ مطلق العنان تھا۔ وہاں کے لوگ فارغ البال اور خود کفیل تھے۔ وہ غیر ملکی تجارت کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ پر تگالی اور برطانوی تاجروں نے اپنی دلچسپی تہذیبی اثر ورسوخ قائم کرنے کے بجائے تجارت کی طرف مبذول کر دیا کیونکہ چین سے تجارتی تعلقات کے نتیجے میں منافع کمانا ان کا مقصد تھا۔

انگریزوں نے چین کے شہنشاہ کے یہاں اپنا سفیر بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ زیادہ سے زیادہ تجارتی رعایت حاصل کی جا سکے۔ لہٰذا 1792ء میں انہوں نے لارڈ میکارتھنی کی قیادت میں ایک وفد بھیجا لیکن اس کی آزاد تجارت کی گذارش کو چینی شہنشاہ نے مسترد کر دیا۔ نسلی اعتبار سے اپنے آپ کو ممتاز سمجھنے والے انگریزوں کے لئے یہ شرم کی بات تھی۔ لہٰذا تنازعہ پیدا ہونا طے تھا۔ 1833ء کے چارٹر ایکٹ نے چین سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی بالادستی کو ختم کر دیا۔ جس کی وجہ سے رشتہ مزید پیچیدہ ہو گیا۔ لیکن برطانوی تاجر افیم کی تجارت پر اپنی بالادستی رکھتے ہوئے اس کی تجارت کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ چین دواؤں کے استعمال کے لئے افیم ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ منگاتا تھا۔ ضرورت کے لحاظ سے چینی حکمراں نے صرف محدود مقدار کی اجازت دے رکھی تھی۔ جبکہ کمپنی زیادہ سے زیادہ افیم چین بھیجنا چاہتی تھی۔ کیونکہ چین کی نوجوان نسل افیم استعمال کرنے کے عادی بن چکے تھے۔ ایک اعداد و شمار کے مطابق 1750ء میں چین نے 400 بیگ (Chests) در آمد کیا جو حیر تناک طور پر بڑھ کر 1839 میں 40 ہزار تک پہنچ گیا۔ اس کے استعمال سے ایک طرف چینی معاشرہ میں سماجی برائی پھیل رہی تھی وہیں چینی معیشت پر اس کا بوجھ بھی بڑھ رہا تھا۔ 19ویں صدی میں چین کی در آمدات اس کے بر آمدات سے بڑھنے کی وجہ سے زر مبادلہ کے طور پر چین کی دولت باہر جانے لگی جو چین کے حکمراں طبقے کے لئے باعث تشویش تھی۔ ایسی صورت حال صرف افیم کی بڑھتی مانگ اور در آمد کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ لہٰذا حکومت نے افیم کی در آمد پر تجارت پر عائد پابندی کر دی۔ افیم کی تجارت اور در آمد پر عائد پابندی کی نگرانی کے لئے شہنشاہ تائی کوانگ (Tao Kaung) نے لن زوشو (Lin-Tsu-Hsu) کو کینٹن کا شاہی کمشنر بنا دیا۔ امپیریل کمشنر بننے کے بعد غیر ملکی تاجروں اور بچولیوں کو لن زوشو نے سخت ہدایت جاری کیں۔ ممنوعہ افیم کی کی بھی در آمد پر شاہی پابندی کی خلاف ورزی

قابل سزا قرار دیا۔ انگریزوں نے افیم کی تمام پیٹیاں Lin کے حوالے کر دیا۔ اس کو چینی حکام نے سمندر میں پھینک دیا۔ انگریز اس منافع بخش تجارت کو ترک کرنے کے لئے ہر گز تیار نہیں تھے۔ برطانوی حکومت نے ایک فوج کینٹن کے لئے روانہ کر دی۔ چین کے شہنشاہ نے بھی اپنی فوج روانہ کر دی جس کے نتیجے میں پہلی اوپیئم /اینگلو۔ چائنیز جنگ (1839-42) ہوئی۔ چین کی فوج انگریزوں کی فوجی صلاحیت اعلیٰ اور معیاری اسلحوں سے لیس فوج کے سامنے پست ہوگئی اور بالآخر 1842 میں 'Treaty of Nanking' پر دستخط کر دیا۔ چین نے ہانگ کانگ برطانیہ کے حوالہ کر دیا۔ زرتاوان کے طور پر چین نے 21 ملین سلور ڈالر ادا کیا۔ نینکنگ کا معاہدہ چین کی حکومت اور عوام دونوں کے لئے باعث شرم تھا۔ اس معاہدہ کے بعد مغربی ممالک نے چین سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ پھر امریکہ، فرانس، بیلجیئم، سویڈن، پرتگال وغیرہ نے چین سے معاہدہ کر کے تجارتی رعایت اور دوسری مراعات حاصل کر لیں۔ غیر ملکیوں کی بڑھتی رعایتی مانگ سے چین اور وہاں کے باشندوں میں ان ممالک کے خلاف ناراضگی بڑھنے لگی۔ دوسری طرف مغربی ممالک کا تجارتی مراعات حاصل کرنے کی ضد کے نتیجے میں دوسری اوپیئم /افیم /اینگلو۔ چائنیز جنگ (1856-1860) ہوئی۔ برطانیہ اور فرانس نے بیجنگ پر قبضہ کر لیا اور چین کو تیان جن (Tianjin) معاہدہ پر دستخط کے لئے مجبور کیا۔ اس کے بعد غیر ملکیوں نے چین کی سیاست میں مداخلت کے ساتھ تجارت پر بھی کنٹرول قائم کر لیا۔

مغربی ممالک کی دخل اندازی کے سبب مانچو خاندان کے اختیارات اور شہرت میں کمی آئی۔ مغربی ممالک کے خلاف بڑھتی نفرت نے چین میں شدّت اختیار کر لی۔ پھر مانچو خاندان کے خلاف ایک مقامی بغاوت 'Taiping Rebellion' ہوئی جس کے دوران مغربی ممالک نے مانچو کا ساتھ دیکر اس بغاوت کو ناکام بنا دیا۔ لیکن اس کے عوض انہوں نے بہت سی مراعات بھی حاصل کر لیں۔ 19 ویں صدی کے آخری دور میں مغربی ممالک نے چین کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ کیونکہ جاپان صنعتی طور پر ترقی کر چکا تھا اور اس نے سامراجیت پسندانہ توسیع کی کوششیں تیز کر دی تھیں۔ وہ 1894ء میں چین سے جنگ میں فاتح بن کر اُبھرا اور وہاں اپنی نوآبادیات قائم کرنے کے بعد دیگر اور ایشیائی ممالک میں اپنی نوآبادیات قائم کرنے کے منصوبہ پر عمل پیرا تھا۔ چین پر جاپان کی فتح سے مغربی طاقتوں کے عزائم بلند ہوگئے اور چین میں اپنی حصّہ داری کا دعویٰ پیش کرنے لگے۔ انگلینڈ، جرمنی، فرانس، جاپان اور روس نے اپنی سیاسی اور تجارتی اثر ورسوخ چین میں بڑھا لیا۔ امریکہ کی کھلے دروازہ پالیسی ('Open Door Policy') کی وجہ سے امریکی اثر ورسوخ بھی چین میں بڑھنے لگا۔ اس پالیسی نے سبھی یورپی ممالک کو یکساں تجارتی موقع فراہم تو کر دیا لیکن اسی کے ساتھ چین کے علاقائی سالمیت کو منقسم ہونے سے بچا لیا اور امریکہ کی اس پالیسی کے بدولت یورپی ممالک کا چین کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔

بوکسر کی بغاوت (Boxer Rebellion)

یورپی ممالک کی چین میں جارحانہ اور توسیع پسندانہ پالیسی کی وجہ سے لوگوں میں غم وغصہ بڑھ رہا تھا۔ چین کی حکومت پر ان ممالک نے ظالمانہ اور شرمناک معاہدہ لاگو کیا جس سے وہاں کے لوگ سامراجی ملکوں سے ناراض تھے۔ اور اس کی وجہ سے 1899 بوکسر کی بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت کے لئے چین کی ایک خفیہ سوسائٹی (Patriotic Order of the Fist) ذمہ دار تھی۔ مغربی ملکوں نے

مشترکہ طور پر مل کر اس بغاوت کو کچل دیا۔ایک معاہدہ کے بعد سرمایہ دار ملکوں نےچین کی حکومت سے 330 ملین پاؤنڈ کا زرتاوان بھی وصول کیا۔ بوکسر کی بغاوت سے بات واضح ہوگئی۔ اوّل چین کو تقسیم کرنا آسان نہیں ۔ دوئم چین کی قیادت کو یہ احساس ہوگیا کہ چین میں سیاسی اور معاشی اصلاح کی ضرورت ہے تبھی چین قائم ودائم رہ سکتا ہے اور بحیثیت ایک آزاد ملک کے اپنی خود مختاری اور سالمیت برقرار رکھ سکتا ہے۔ مغربی ممالک نے معاشی طور پر خستہ حال چین کو سرمایہ فراہم کرنا شروع کردیا۔اس کے ذریعہ انہوں نے وہاں کی مقامی ریاستوں سے سیاسی اور تجارتی مراعات حاصل کرلیں ۔ اگرچہ چین کی قیادت اپنے ملک کی آزادی کے عوض کسی قسم کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لیکن معیشت کو مستحکم کرنے کے لئے قرض لینا بھی ضروری تھا۔ مغربی ممالک نے مل کر ایک Consortium بنایا تاکہ چین کو قرض کی ادائیگی منظم طریقے سے ہوسکے لیکن امریکی صدر ولسن نے اس کو ختم کردیا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد امریکہ نے ایک دوسرا Consortium بناکر چین کو قرض فراہم کرنے کا راستہ ہموار کیا۔ لیکن مغربی ممالک قرض کی فراہمی کے ذریعہ اپنی تجارتی مفاد کو تحفظ فراہم کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا یورپی ممالک نے ریلوے تعمیر کے منصوبہ کے ذریعہ اس مقصد/ہدف کو پانے کی کوشش جاری رکھیں۔

11.4 پہلی عالمی جنگ کے بعد چین میں قومی حکومت کا قیام

(Establishment of a National Government in China after the First World War)

پہلی عالمی جنگ کے بعد چین نے اپنی خود مختاری کو مستحکم کرنے کے لئے کئی اہم اقدام اٹھائے۔ چین غیر ملکی تسلط سے اپنی مکمل آزادی چاہتا تھا۔عالمی طاقتوں کے کنٹرول سے نکل کر اپنے ملک کی علاقائی سلامتی اور سیاسی انتظامیہ پر اپنا کنٹرول قائم کرنا چاہتا تھا اور اپنی خود مختاری میں کسی بھی باہری تجاوزات برداشت کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ 1921 میں منعقدہ واشنگٹن کانفرنس میں اس نے علاقائی سالمیت کے تحفظ کی اپیل بھی کی۔ چین نے یہ بھی مانگ کی کہ چین سے متعلق کوئی بھی معاہدہ چین کے موجودگی کے بغیر نہیں ہونا چاہیئے۔ مغربی ممالک نے چین کی مانگ کو مسترد کردیا۔ لیکن علاقائی سالمیت، آزادی اور خود مختاری کا وعدہ کیا۔ واشنگٹن کانفرنس کے بعد بھی چین کچھ تجارتی آزادی اور محصول سے متعلق رعایت کی مانگ کرتا رہا۔ اسی دوران چین پر غیر ملکی یورپی ممالک کے غلبہ کے خلاف چینی عوام میں مغرب مخالف جذبہ پروان چڑھنے لگا۔ ''The Shantung Settlement'' کے ذریعہ چین جاپان سے کئی رعایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔30، مئی 1925 کا ''شنگھائی حادثہ''۔ جس میں ایک انگریز افسر کے عوامی بھیڑ پر گولی چلانے سے کئی لوگ جاں بحق ہوگئے۔ اس کے نتیجے میں انگریز مخالف جذبات بھڑک اٹھے۔ چین کے کئی صوبوں میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ غیر ملکیوں بالخصوص انگریزوں سے ملک سے نکالنے کی مانگ اٹھنے لگی۔

چین میں اسی اثنا میں ایک قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ یہ غیر ملکیوں کی بے جا رعایت کے حق میں نہیں تھی۔ چین کے ایک طبقہ کی قیادت چیان کائی شیک کر رہے تھے اور وہ اس عوامی غیر ملکی مخالف تحریک کا فائدہ اٹھا کر غیر ملکیوں پر سفارتی دباؤ بنانا چاہتے تھے تاکہ ان سے کچھ رعایت حاصل کی جاسکے۔ چند سالوں میں چین نے Tariff Autonomy حاصل کرلیا لیکن ''Extra Territoriality'' کو ختم کرنے کی گذارش کامیاب نہیں ہوسکی۔ امریکہ اور یورپی ممالک اسی مانگ کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں

تھے۔ چین ایک طرف اپنے آپ کو غیر ملکیوں کے قبضہ سے آزاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اسی وقت جاپان نے 1931ء میں چین پر حملہ کر دیا کیونکہ جاپان چین کے قدرتی وسائل پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ چین میں جاپان کے خلاف عوامی غم وغصہ کو پیش نظر کومنتانگ پارٹی (‘Kuomintang Party’) نے جاپان کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ جاپانی دراندازی اور اس کی سیاسی اثر ورسوخ کے خاتمہ کے لئے کومنتانگ پارٹی اور کمیونسٹ ایک دوسرے کے قریب آئے اور ان میں اتحاد قائم ہوا اور ایک دوسرے سے تعاون کا وعدہ کیا۔ جاپان نے چین پر 1937 میں حملہ کر دیا۔ فوجی کاروائی کر کے کئی اہم علاقوں کو فتح بھی کر لیا۔ مثلاً نانکنک وغیرہ۔ چیان کائی شیک اپنی قومی فوج سے جاپانیوں کی پیش رفت کے خلاف لڑ رہا تھا وہیں کمیونسٹ گوریلا جنگ سے جاپانیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دوسری عالمی جنگ اور امریکہ جارحیت کی وجہ سے جاپان نے ہتھیار ڈال دیا اور چین غیر ملکی قبضہ سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوا۔

11.5 چین میں قومی تحریک کا آغاز اور اس کی سرگرمیاں

(Beginning of the National Movement in China and Its Activities)

چین میں قومی تحریک کی ابتدا در اصل غیر ملکی سرمایہ داری نظام کی تجارتی اور سیاسی پالیسیوں کا نتیجہ تھی۔ چین تنہا پسند ملک تھا۔ جس کی اپنی تہذیبی روایات، تجارتی دلچسپی اور سیاسی نظام تھا لیکن چین وسائل سے بھرپور اور تجارتی لحاظ سے بہت اہم تھا جس کی وجہ سے یورپ کے ممالک نے جب ایشیائی ممالک مثلاً ہندوستان پر قبضہ شروع کیا تو چین بھی ان کی ترجیہات میں شامل ہو گیا اور تجارت کے بہانے سے چین میں مداخلت شروع ہوئی پھر سیاسی قبضہ اور وہاں کی سیاست میں مسلسل دخل اندازی نے چینی عوام میں انگریز مخالف جذبہ کو فروغ دیا۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب تھے:

چین کے علاقائی سالمیت پر حملہ :

19 ویں صدی میں چین پر مانچو خاندان کی حکمرانی تھی۔ مانچو شہنشاہوں کی حکومت پر گرفت کمزور تھی۔ وہاں کی ریاستیں آزاد اور خود مختار تھیں۔ آپس میں اتحاد نہیں تھا جس کا فائدہ اٹھا کر مغربی طاقتوں نے چین کی میعشت پر قبضہ اور سیاست میں دخل اندازی شروع کر دی اپنے اثر ورسوخ کو بہت بڑھالیا۔ کیونکہ چین کے حکمراں کمزور تھے۔ فوج ناتواں تھی چین کے باشندے مغربی ملکی لوگوں سے نفرت کرتے تھے حکومت اگرچہ ان کی تجارتی سرگرمیوں کو کینٹن تک محدود کر دیا تھا۔ مگر فوجی اور دفاعی قوت کمزور ہونے کی وجہ سے انگریزوں کی دراندازی کو نہیں روک پائے۔ سی جے ہیز لکھتے ہیں کہ چین کی فوجی قوت کمزور تھی یعنی فوجی اور دفاعی طور پر کمزور ہونے کے بدولت یورپی ممالک کو اپنے بندرگاہوں تک رسائی اور ان کے استعمال سے روک نہیں پائی۔ عیسائی مشینریوں کو ان کی تبلیغ واشاعت سے بھی باز نہیں رکھ سکے۔ اس طرح یورپی تاجروں کا حوصلہ بڑھتا گیا۔ اس طرح یورپی تاجر کسی بھی قسم کی چین کی حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کی مخالفت کرتے تھے اور اپنی سیاسی اور تجارتی مقاصد کے حصول کے لئے ان پابندیوں کی خلاف ورزی بھی کرتے تھے بالخصوص برطانیہ کی چین سے تجارت اور قدرتی وسائل میں دلچسپی تھی جس کی وجہ سے وہ فوجی قوت استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

چین کسی بھی مغربی ممالک کی رہائش کی مخالفت کرتا تھا دوسری افیم کی جنگ اور چین کی شکست کے نتیجے میں نینکنگ (Nanking) کے معاہدہ کی روسے چین نے ہانگ کانگ برطانیہ کے حوالے کردیا۔اس کے بعد مغربی ممالک کی دخل اندازی اور چینی وسائل کے استحصال بہت بڑھ گیا۔ چینی عوام کا غصہ بڑھنے کے ساتھ غیر ملکی مخالفت تحریکوں کا آغاز ہوا۔ چین کے کئی علاقوں میں غیر ملکیوں کے خلاف بغاوت بھڑک اٹھی۔ چین نے اپنی سالمیت اور خود مختاری پر حملہ کی شدید مخالفت کی۔ چینی عوام اپنے ملک کے سرزمین کھونے اور خود مختاری پر حملہ کی پُرزور مخالفت کررہے تھے۔

چین کی سرزمین پر مغربی ملکوں کی بستیوں کا قیام :

چینی عوام میں غیر ملکیوں کے خلاف غم وغصہ اور مغرب مخالف جذبہ کے لئے دوسری اہم وجہ غیر ملکی بستیوں کا قیام تھا۔پہلے چینی حکومت نے غیر ملکیوں کی چین میں دخل اندازی کو روکنے کے لئے ملک کی سرحد پر ان کے لئے نئی بستیوں کے قیام کا انتظام کیا۔ یہ بستیاں کچھ وقت گذرنے کے بعد غیر ملکی حکومت اور سیاسی انتظامیہ کے زیر اثر آگئیں۔ان بستیوں کا انتظام وانصرام، انتظامیہ، پولس، صحت عامہ، اسپتال، اسکول، سڑکیں اور محصولات بھی غیر ملکیوں کے دائرہ اختیار میں آگیا۔انگلینڈ نے چینی بندرگاہوں پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔ پہلی اور دوسری افیم کی جنگ سے غیر ملکی تاجروں نے خوب مراعات حاصل کرلیں۔عیسائیت کی تبلیغ کی اجازت اور انگریزوں کی پشت پناہی کی وجہ سے عیسائی مشنری سرعام تبلیغ واشاعت کرنے لگے۔ مذہبی پروٹیکٹوریٹ قائم کرلیا۔افیم کی تجارت کے لئے قانونی جواز فراہم کرلیا۔ چین کی حکومت کو قرض فراہم کرکے ان کو اپنی شرائط ماننے پر مجبور کیا۔ مثلاً جاپان انگلینڈ، فرانس اور روس چین کو قرض دے کر اپنا سیاسی اثر ورسوخ بھی قائم کرنے لگے۔ سب سے افسوسناک پہلو ان بستیوں میں رہنے والے چینی لوگوں کی تھی۔ ان کو ان بستیوں میں اجنبی مانا جاتا اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں غیر ملکیوں کے خلاف باغیانہ اور مخالفانہ تحریکوں نے جنم لیا۔

بوکسر بغاوت اور نئی پابندیاں :

جیسا کہ ہم جانتے ہیں صنعتی انقلاب کے بعد یورپی ممالک نوآبادیات کے حصول کے لئے دور دراز علاقوں میں جاکر تجارت کرنا شروع کیا۔ چین میں یورپی ممالک کے باشندے تجارتی مقصد کے لئے گئے۔ انہوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ سیاسی دخل اندازی اور مذہبی تبلیغ کے ذریعہ اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانا شروع کیا۔اپنی بستیاں قائم کرلیں۔اپنی دفاع کے لئے فوجی اور دفاعی سہولیات حاصل کیں۔ چین پر قبضہ کی منصوبہ بندی شروع کردی۔ معاشی بحران سے دوچار چینی حکومت کو قرض دے کر اپنے زیر اثر لائے، ریلوے اور سڑکوں کی تعمیر کو چین کی ترقی کا پیش خیمہ بتایا لیکن اس کا مقصد بازار اور قدرتی وسائل کا استعمال کرنا تھا۔ ٹیلی گراف نیٹ ورک قائم کر چین میں اپنی معاشی سرگرمیوں کو تیز کیا جائے۔ سوتی کپڑوں کی صنعت قائم کی۔ چینی مزدوروں کا استحصال کرکے معدنیات کے کھدائی اور اس پر قبضہ کرکے خوب منافع کمایا جس سے چینی عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔کسی بھی ممکنہ مخالفت کو بزور طاقت کنٹرول کرنے کے لئے فوج بھی رکھ لی۔ یورپی ممالک کی بڑھتی ہوئی مانگ اور چینی حکومت پر دباؤ بنا کر مراعات حاصل کرنے کے طور طریقے سے چینی عوام میں مغربی مخالف نظریہ کی وجہ سے 1899 میں بوکسر کی بغاوت ہوئی۔اس کے بعد چین کی خود مختاری پر مزید پابندیاں عائد کردی گئیں۔اس بغاوت کے بعد مغربی

ممالک نے خوب مراعات حاصل کر لیں۔ عیسائیت کی تبلیغ سر عام کرنے لگے۔ مذہبی پروٹیکٹوریٹ قائم کر لیا۔ افیم کی تجارت کے لئے قانونی جواز فراہم کر لیا۔ چین کی حکومت کو قرض فراہم کر کے ان کو اپنی شرائط ماننے پر مجبور کرنے لگے۔ مثلاً جاپان انگلینڈ، فرانس اور روس چین کو قرض دے کر اپنا سیاسی اثر ورسوخ قائم کرنے لگے۔ سب سے افسوسناک پہلواں بستیوں میں رہنے والے چینی لوگوں کی تھی۔ ان کو ان بستیوں میں بطور اجنبی مانا جاتا اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں غیر ملکیوں کے خلاف باغیانہ اور مخالفانہ تحریکوں نے جنم لیا۔

غیر ملکی فوج کی آزادانہ آمدورفت :

مغربی طاقتوں نے چین سے کئی معاہدے کئے ان معاہدوں کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ چین کے حکمراں یورپی فوجی ٹکڑیوں کو اپنے ملک کے کسی بھی خطہ سے گذرنے کی اجازت ہوگی۔ مزید یہ کہ ان کو رائفل بھی رکھنے کی اجازت ہوگی۔ چینی علاقوں سے معدنیات کی کھدائی اور چین کے حکمراں کے خود مختاری پر حملہ اور کٹوتی سے عوام انگریزوں سے نفرت کرنے لگے تھے اور چین میں مغربی طاقتوں کی بڑھتی دراندازی، تجارتی مراعات اور خود مختاری پر حملہ نے قومی تحریک کو جنم دیا۔ غیر ملکیوں سے غم وغصہ اور مخالفت ابتدا میں بہت محدود تھی، مگر رفتہ رفتہ غیر ملکیوں کے بڑھتے مظالم، وسائل کے استحصال اور چین کے عوام کے حقوق کی پامالی نے لوگوں میں مغربی مخالف تحریک کو مزید متحرک کر دیا۔ 1498ء میں جاپان کا حملہ اور چین کی شکست نے چینی حکمرانوں کی کمزوریوں کو عیاں کر دیا اور عوامی غصہ بھڑک اٹھا۔ بوکسر کی سورش اور چینی عوام پر فائرنگ نے چینی عوام کو قومی جذبہ سے سرشار کر دیا۔ لیکن سن یات سین کی قیادت میں کومنٹانگ کے قیام کے بعد سامراجیت مخالف تمام گروپ متحد ہو گئے۔ روس پر جاپان کی 1904 میں فتح نے چینی عوام کو ایک نیا حوصلہ دیا اور چینی قیادت کو بھی جاپان کی فتح سے مغربی طاقتوں سے نجات پانے کا حوصلہ بلند ہوا۔ چینی قومیت مستقبل کی جدوجہد آزادی کے لئے اب مکمل طور پر تیار تھی۔

پہلی عالمی جنگ کے دوران چین نے اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ اس نے مغربی ممالک سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اہم قدم اٹھائے۔ روسی انقلاب کے بعد روس سے بھی اپنے آپ کو چین نے آزاد کر لیا۔ امریکی صدر ولسن نے ترقی یافتہ ملکوں سے وعدہ کیا کہ ہم ان کو 'خوداختیاری' کا حق دیں گے۔ چین نے اسی کے تحت اپنے نمائندوں کو 1921ء میں واشنگٹن میں منعقدہ کانفرنس میں شرکت کے لئے بھیجا۔ چین نے بہت پرزور انداز سے اپنی خود مختاری کے بحالی کی بات کہی۔ متحد اتحاد نے اس پر کوئی وعدہ نہیں کیا لیکن مزید دراندازی نہ کرنے کی ضمانت ضرور لی۔ نو طاقت معاہدے (Nine-Power Treaty) کے تحت چین کو اگرچہ بہت سی مراعات مغربی طاقتوں نے دینے کا وعدہ کیا۔ چین کے دائرہ اثر (Extra-territoriality) کے خاتمہ کی مانگ پر مغربی ممالک ایک کمیشن کی تقرری پر راضی ہو گئے تاکہ اس مسئلہ پر کوئی لائحہ عمل تیار کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ چین نے کسی بھی معاہدہ کی تجدید سے انکار کر دیا۔ واشنگٹن کانفرنس میں چینی وفد نے شانٹنگ بندوبست ('The Shantung Settlement') کو حل کرنے کی بات کی لیکن کسی ملک نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ بالآخر چین نے براہ راست جاپان سے گفت وشنید کر کے سانٹنگ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر چین اپنے سفارتی کوششوں میں

کامیاب ہوا اور جاپان نے شانٹنگ کو چین کے حوالے کر دیا۔

چین میں شنگھائی فائرنگ کے بعد یورپی مخالف تحریک نے زور پکڑ لیا کیونکہ کئی صوبوں میں یورپی ممالک کے خلاف بغاوت ہو گئی ان کو چین سے نکلنے کا انتباہ بھی دے دیا چین کی قومی حکومت نے غیر ملکی سرمایہ داروں /تاجروں کو خصوصی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ جب چین کی قومی حکومت اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعادہ کر رہی تھی۔ ٹھیک اسی دوران جاپان نے اس کی آزادی کو چیلنج کرتے ہوئے منچوریا پر قبضہ کر لیا۔ چین کے سیاسی رہنماؤں اور پارٹیوں نے جاپان کو چینی عوام اور حکومت کے نظریہ سے واقف کراتے ہوئے جاپان کو اپنی جارحانہ جنگ اور فتوحات سے باز آنے کی دھمکی دے ڈالی۔ لیکن جاپان کی جارحیت جاری رہی اور چین میں نیشنلسٹ اور کمیونسٹ ان کی مخالفت کرتے رہے اور جاپانیوں کی جنگی پیش قدمی کو روکنے کے لئے جنگ بھی کی۔ لیکن جنگ سے متعلق امور پر نیشنلسٹ اور کمیونسٹ کے درمیان اختلاف رائے اور محاذ آرائی بھی ابھر کر سامنے آئی۔ 1945 میں اختلاف مزید گہرا ہو گیا۔ اکتوبر 1945 میں دونوں مخالف گروپوں میں اتفاق رائے پیدا کرنے کے لئے مصالحت کی کوشش ہوئی۔ امریکہ نے بھی مصالحت کی کوشش کی مگر مصالحت کی ساری کوششیں ناکام رہیں اور دونوں گروپ الگ الگ جاپان سے لڑتے رہے۔ نیشنلسٹ اور کمیونسٹ کی بڑھتی آپسی مخالفت کے دوران چیان کائی شیک کی قیادت میں قومی حکومت کی ساخ گرنے لگی۔ لوگوں نے حکومت مخالف مظاہر شروع کر دیا۔ قومی حکومت نے بطور قوت اس بغاوت اور حکومت مخالف مظاہرین کو کچلنے کے لئے فوج کا استعمال کیا جس سے قومی حکومت اور اس کی قیادت کے خلاف لوگوں میں غصہ پھیل گیا۔ دوسری طرف ماؤ زیڈانگ (Mao-Tse-Tsung) کی قیادت میں کمیونسٹ ایک منظم منصوبہ بندی کے ذریعہ ملک کے اندرونی انتشار اور غیر ملکیوں کی جارحیت کو ختم کر کے ملک میں استحکام کے قیام کی کوشش کر رہے تھے۔

11.6 چین میں کمیونسٹ انقلاب اور کمیونزم کا قیام

(Communist Revolution and the Establishment of Communism in China)

مورخین نے چین میں کمیونزم کی ابتدا اور اس کی ترقی کے کئی وجوہات بتائے ہیں۔ کمیونسٹ نظریہ کا قیام سب سے پہلے روس میں بولشیوک انقلاب کے بعد ہوا۔ بولشیوک انقلاب کو عام طور پر روسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ چین میں کمیونزم کی ارتقا کو عام طور پر روسی انقلاب کے نتائج کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ چین کے دانشور بھی دو حصّوں میں منقسم تھے۔ پہلا مغربی جمہوری خیالات کے قیام کا حامی تھا۔ دوسری طرف روسی انقلاب سے متاثر ہو کر دوسرا گروپ چین میں کمیونزم کے قائم کرنے کے حق میں تھا۔ روسی رہنما لینن نے بھی چین میں کمیونسٹ خیالات اور نظریات کی چین میں اشاعت و تبلیغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ چین کے دانشوروں نے بھی کمیونزم کو مقبول عام بنانے میں اہم کردار تھا۔ دانشوروں اور سیاسی مفکروں نے سرمایہ داری اور سامراجیت کو چین کی سیاسی انتشار، معاشی استحصال اور سماجی پستی کے لئے ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے بڑی کامیابی کے ساتھ عوام کو باور کرایا۔ انہوں نے یہ بات بھی عوام کو بتائی کہ کمیونسٹ ہی چین کی جدید کاری اور آزادی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ کمیونسٹ نظریات کے حامی دانشور، مفکر اور صحافیوں عوام کو سمجھانے میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے کہ چین کی ترقی کمیونزم اور کمیونسٹ حکومت کے قیام سے وابستہ ہے۔ 1919 میں کمیونسٹ نظریہ کو مزید مقبولیت اور تحریک اس وقت

ملی جب طلبہ نے سرمایہ داری کے خلاف اور کمیونزم کی حمایت میں مظاہرہ کیا۔

چین میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام :

1921 میں روسی انقلاب کے رونما ہونے کے چار سال بعد چین میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام شنگھائی میں ہوا۔ چین کی تاریخ میں یہ بہت اہمیت کا حامل تھا۔ 1922ء میں کینٹن (Canton) میں اس کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ہم عصر سیاسی قیادت اور دانشوں میں اتفاق رائے نہیں تھی کہ چین میں کمیونزم کس حد تک کامیاب ہوگا۔ کیونکہ روس کے مقابلہ میں چین کی سیاست اور سیاسی مفادات مختلف تھے۔ تہذیبی اور ثقافتی روایتیں مختلف نوعیت کی تھیں۔ معاشی حالات بھی یکسر مختلف تھے۔ لیکن روسی انقلاب کے بعد روسی اور روسی عوام کی ہمدردی چینی عوام کے ساتھ تھی اور وہ چین کی آزادی کے خواہاں تھے کیونکہ چین کو مغرب کی سرمایہ داری نظام کی غلامی سے نجات دلانے کی ان کے ہمدردانہ جذبہ کو چین کے عوام نے نہ صرف پسند کیا بلکہ اس نظریہ کی مکمل حمایت اور تائید بھی کی۔ مغربی ممالک کے سرمایہ داروں نے چین میں فیکٹریاں قائم کیں۔ جس سے وہ بے پناہ منافع کماتے تھے۔ لیکن فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت اچھی نہیں تھی ان کا معاوضہ بہت کم تھا۔ کام کا دورانیہ بہت زیادہ تھا کوئی معیار زندگی نہیں تھی۔ لہٰذا Chen He Hsin کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی نے مزدوروں کی ایک تنظیم بنائی تاکہ ان کے مفاد کی حفاظت ہو، دوسرے کمیونزم کو عوامی سطح تک پہنچایا جاسکے۔ مزدوروں کی بھلائی کی خاطر کمیونسٹ پارٹی Kuomintang Party سے بھی مفاہمت اور تعاون کے لئے تیار تھی۔ مزدوروں کی بھلائی کے لئے لائحہ عمل بھی تیار کیا گیا۔

سُن یات سین کی قیادت :

سُن یات سین (Sun Yat Sen) چین کی قومی پارٹی کومنٹانگ (Kuomintang) کے لیڈر تھے اور ان کی چین کے لئے خدمات کی وجہ سے 'بابائے جدید چین' کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ چین کو مضبوط اور طاقتور ملک بنانے کے لئے سیاسی اور معاشی اصلاحات پر زور دیا۔ 1894ء میں وہ ہوائی چلے گئے اور وہاں 'Revive China Society' قائم کیا جو بعد میں ایک خفیہ انقلابی تحریک / تنظیم بن گئی جس کی قیادت خود سنبھالی۔

95-1894 چین۔ جاپان جنگ میں چین کی شکست اور چین میں سیاسی بحران کی وجہ سے انہوں نے 1895 میں کینٹن میں ایک بغاوت کی قیادت کی۔ 1896 میں قید کرکے ان کو لندن بھیج دیا گیا۔ قید سے رہائی کے بعد ان کو خوب شہرت ملی۔ وہ طلبہ تحریک میں متحرک رہے اور ان کی تحریک سے وابستگی نے ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ کردیا اور مارچ انقلاب کی قیادت بھی کی۔ انہوں نے کمیونسٹوں سے مصالحت کرکے ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوشش کی۔ 1923ء میں ان کی قیادت میں جس حکومت کی تشکیل ہوئی اس میں کئی کمیونسٹ بھی شامل ہوئے۔

ان کی سیاسی زندگی میں 1924 بہت اہم تھا کیونکہ اسی سال انہوں نے First National Congress of Kuomintangمنعقد کی اس کو KMT اور National People's Party بھی کہا جاتا تھا۔ کمیونسٹ سیاسی رہنما ماؤ تسے تنگ بھی اس کانگریس میں شریک ہوئے۔ اس کانگریس کی سب سے اہم خصوصیت یہ رہی کہ قوم پرست اور کمیونسٹ دونوں نے شرکت کی اور سامراجیت مخالف قرارداد منظور کر کے مغربی ممالک کو چین چھوڑنے کا انتباہ بھی دے دیا۔ یہ نعرہ "چین چینیوں کے لئے" اور Land to the Peasantبہت مقبول ہوا۔ سُن یات سین کے انتقال کے بعد کے ایم ٹی کی قیادت چیانگ کائی شیک (Chiang Kai Shek) نے سنبھالی اور کمیونزم مخالف نظریات کی وجہ سے انہوں نے کمیونسٹوں کو دبانے کی کوشش کی۔ پارٹی اور حکومت میں اپنے تمام معاونین کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اس طرح Kuomintang ایک Conservativeپارٹی کے طور پر منظر عام پر آئی لیکن کمیونسٹوں نے بھی ہار نہیں مانی اور اپنی نئی تحریک شروع کر دی۔

1911 میں چین کا انقلاب :

سُن یات سین کی قیادت میں 1911ء کا چین کا انقلاب بہت ہی اہمیت کا حامل تھا۔ اس انقلاب کو Hsinhai انقلاب بھی کہا جاتا ہے اس انقلاب کی چین کی تاریخ میں اہمیت اس لئے بھی ہے کہ چین پر صدیوں سے حکومت کر رہے Qing dynasty کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بدولت ریپبلک آف چائنا Republic of Chinaکا قیام عمل میں آیا۔ Qing خاندان کی بادشاہت کا خاتمہ ایک طویل جنگ، احتجاج اور بغاوتوں کے نتیجہ میں ہوا۔ 10؍ اکتوبر 1911 میں وُچنگ بغاوت سے اس خاندان کے خلاف بڑے پیمانے پر بغاوتوں کا سلسلہ پھوٹ پڑا بالآخر سُن یات سین کی قیادت میں نیشنل اسمبلی نے Republic of China کے قیام کا اعلان کر دیا۔ چین کے عوام نے سُن یات سین کو Father of the Nation/Father of People's Republic of Chinaتسلیم کر لیا۔ سُن یات سین کی ابتدائی کامیابیوں کو 1949ء کے انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا گیا۔ جب کمیونسٹوں نے حقیقی معنوں میں اپنی آزاد اور جمہوری حکومت قائم کی۔ غیر ملکیوں کو چین سے باہر کا راستہ دکھا اور چین کو ایک صنعتی اور ملیٹری ریاست کے طور پر ترقی دی۔

اس انقلاب نے چین کے عوام کو صدیوں پرانی شہنشاہیت سے آزاد کر کے ان کو ایک آزاد اور جمہوریت نواز حکومت دی۔ غیر ملکیوں نے چین کے قدرتی وسائل پر قبضہ کر کے اس کو خوب استحصال کیا اور چینی عام کو بطور مزدور مل اور معدنیات کی کھدائی میں استعمال کیا۔ چین کے عوام غربت اور افلاس میں جینے کے لئے مجبور تھے۔ ان کے ساتھ ہر قسم کا امتیاز برتا جاتا تھا۔ لہٰذا انقلاب کے بعد معاشی سرگرمیوں کو از سرِ نو نئی جہت دے کر چین کے عوام کے حق میں اصلاحات کئے گئے تاکہ عوام تک معاشی ترقی کا فائدہ پہنچ سکے۔ اس کی وجہ سے صدیوں سے غربت اور افلاس کا شکار چین کے عوام کی معیار زندگی تبدیل ہو گئی۔ ان کی معیار زندگی بہتر ہو گئی چین کا انقلاب ترقی کے راستے پر گامزن رہتے ہوئے 1949ء کے کمیونسٹ انقلاب کے لئے راستہ ہموار کیا جس نے چین کو مزید ترقی اور طاقتور ملک بننے میں اہم کردار ادا کیا۔

ماوتسے تنگ اور کسانوں کی تحریک :

چین میں کسانوں کا استحصال ایک عام بات تھی۔ ان کے دِلوں میں غیر ملکیوں کے ساتھ چینی زمینداروں کے خلاف بھی غم و غصہ تھا۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ماوتسے تنگ نے کسانوں کو زمینداروں اور قومی بالادستی کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسایا۔ کے ایم ٹی میں چونکہ بہت سے زمیندار بھی شامل تھے اس لئے ماسکو اور قوم پرست رہنماؤں نے ایسی کسی بھی کاوش/ تحریک کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ روس چاہتا تھا کہ Kuomintang کو ہی کمیونسٹوں کو عوامی پارٹی People's Party بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ Kuomintang نے اسی دوران کئی اعلیٰ کمیونسٹ لیڈر کو پارٹی سے برخواست کر دیا جس کے بدولت ماؤتسے تنگ ان کی مدد اور حمایت سے ایک عظیم لیڈر بن کر اُبھرے۔ قومی حکومت اور کمیونسٹوں کے مابین اقتدار کی جنگ 1927ء سے لے کر 1937ء تک چلتی رہی۔ چین کے کئی صوبوں میں کمیونسٹ حکومت قائم بھی ہوگئی۔ نومبر 1931ء میں کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں نے پہلی جنرل اسمبلی بلائی وہیں انہوں نے چائنیز سویت ریپبلک کے قیام کا اعلان کیا۔ انہوں نے نئے آئین اور جمہوری آمریت کے قیام کا بھی اعلان کیا۔ چیانگ کائی شیک کمیونسٹوں کے بڑھتے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لئے کوشش کرتا رہا مگر اسے کامیابی نہیں ملی۔ جاپان نے چین پر حملہ کر دیا۔ اس وقت ماتسے تنگ نے چیانگ کائی شیک سے خانہ جنگی ختم کرنے اور تعاون کی اپیل کی۔ مگر چیانگ کائی شیک نے اس کی درخواست کو نامنظور کر دیا۔ کیونکہ اس کی نظر میں کمیونسٹ جاپان کے مقابلہ زیادہ خطرناک اور لائق اعتبار نہیں تھے۔ کمیونسٹوں کے خلاف کاروائی کی وجہ سے جیانگ کائی شیک کو قید کر لیا گیا مگر کمیونسٹ حکومت نے اس کو خانہ جنگی ختم کرنے اور جاپان سے متحد ہو کر لڑنے کی شرط پر رہا کر دیا۔

جاپان اور چین کی جنگ 1937ء :

جولائی 1937 میں ایک معمولی واقعہ کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔ چینی سپاہیوں نے جاپان کے ایک فوجی افسر کو مارکوپولوپل پر گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ مارکوپولوبل کے حادثہ کی وجہ سے جاپانی حملہ آور ہوگئے۔ چیانگ کائی شیک اور کمیونسٹوں نے متحدہ محاذ قائم کر کے چینی حملہ کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ جنگ کے دوران مصالحت کی کوشش ناکام ہوگئی اور جنگ چلتی رہی۔ دوسری عالمی جنگ شروع ہونے کے بعد یہ جنگ بھی عالمی جنگ کا حصہ بن گئی۔ اس دوران بھی چیانگ کائی شیک کمیونسٹ حکومت کے خلاف لڑتا رہا تاکہ اس کے وجود کو ختم کیا جاسکے۔

چین میں خانہ جنگی :

جاپان نے 1945ء میں خود سپردگی کر دی۔ جاپانی قبضہ والے علاقے چین کو دے دیئے گئے۔ چیانگ کائی شیک کے ایم ٹی کا قبضہ چاہتا تھا جبکہ کمیونسٹوں نے اپنے اختیار کا دعویٰ کر دیا اور امریکی مصالحت کی سبھی کوششیں ناکام ہوگئیں اور خانہ جنگی کی صورت حال پیدا ہوگئی امریکہ کی وساطت سے قیام امن کی کوششیں تیز ہوگئیں اور ایک قومی حکومت کے قیام کے لئے فارمولہ بنایا گیا لیکن KMT ایک صدر کی ماتحتی میں ایک مرکزی حکومت کے قیام کی حمایت کر رہے تھے تو کمیونسٹ صوبائی آزادی کے ساتھ غیر مرکزیت والی حکومت کی مانگ کر

رہے تھے۔ منچوریا کی آزادی کے سوال پر اپریل 1946ء میں کمیونسٹوں نے قومی حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ جنگ کے دوران نومبر 1946 میں چیانگ کائی شیک نانکنگ میں نیشنل اسمبلی کی میٹنگ بلائی۔ کمیونسٹوں نے شریک ہونے سے انکار کر دیا مگر جنرل اسمبلی نے 25، دسمبر 1946ء کو ایک آئین کو تسلیم کر لیا۔

قوم پرستوں کی ناکامی اور اس کے وجوہات :

قوم پرستوں کو دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے مندرجہ ذیل وجوہات تھیں ۔ قوم پرست KMT/ میں داخلی نااتفاقی اور اہم مسئلوں پر قیادت میں اختلاف رائے کی وجہ سے انہوں نے کمیونسٹوں کو کبھی بھی متحد ہو کر مقابلہ نہیں کیا۔ چیانگ کائی شیک جو سُن سیات سین کے انتقال کے بعد قوم پرست پارٹی کے رہنما بنے تھے ان میں قائدانہ صلاحت کی کمی تھی۔ وہ سب کو جوڑ کر چلتے، اور باہمی رائے اور میل جول سے ملک کی قیادت کرنے میں ناکام رہے۔ کمیونسٹوں سے مصالحت کو انہوں نے کبھی بھی ترجیح نہیں دی جو وقت کی ضرورت کی چیانگ کائی شیک نے زمینداروں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ملک میں پرانے نظام حکومت کو قائم کرنا چاہتے تھے جس کو عوام قبول کرنے کے لئے کسی بھی حال میں تیار نہیں تھے دوسری طرف کمیونسٹوں نے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں عوامی فلاح و بہبود کے پیش نظر اصلاحی اقدام کئے۔ انہوں نے بڑی بڑی زمینداریوں کو ختم کر دیا۔ جس کو کسانوں نے پسند کیا جس کی وجہ سے انہوں نےکمیونسٹوں کا ساتھ دیا۔ اقتصادی امور بالخصوص محصولات میں اصلاحات کر کے تاجروں کو بھی ہم نوا بنالیا جو کمیونسٹوں کی بڑی کامیابی تصور کیا جاتا تھا۔

عالمی جنگوں اور کساد بازاری کی وجہ سے چین کی معیشت بھی متاثر ہوئی۔ جس کی وجہ سے ملک میں مہنگائی بہت بڑھ گئی۔ عوام قومی حکومت سے مہنگائی پر کنٹرول کرنے کی توقع کر رہی تھی مگر قومی حکومت نے کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا۔ ان کی کرنسی نظام میں اصلاحات کی کوشش بھی ناکام ہوگئی۔ مہنگائی پر قابو پانے پر ناکامی کی وجہ سے قومی حکومت کی مقبولیت اس حد تک کم ہوگئی کہ وہ حکومت کے علاوہ کسی بھی حکومت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے۔ لٰہذا عوام نے کمیونسٹوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ کمیونسٹوں کا مارکس کے نظریہ اور اس کے فلسفہ میں اعتماد اور یقین تھا اس کی وجہ سے ان کا حوصلہ بلند تھا۔ اس نظریہ میں ان کی ٹریننگ نے موجودہ حکومت سے لڑنے کے جذبہ کو پروان چڑھایا جس کے بدولت کمیونسٹ KMT کے خلاف کامیاب ہو سکے۔ پرانی حکومت میں لوگوں کا اعتماد ختم ہو گیا تھا۔ ملک کی سالمیت اور معاشی اصلاحات کے پیشِ نظر چینی عوام نے پرانی حکومت کے برخلاف کمیونسٹوں کا ساتھ دے کر تختہ الٹنے کا عزم کر لیا تھا۔ اس طرح کمیونسٹ قیادت نے رفتہ رفتہ چین میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا کر قومی حکومت کو ختم کر کے تمام صوبوں پر اپنا قبضہ جمالیا۔ 1950 تک کمیونسٹ عملی طور پر چین پر قابض ہوگئے اور نیشنلسٹ فارموسا تک سمٹ کر رہ گئے۔

کمیونسٹ حکومت کا قیام :

یکم اکتوبر 1949ء کو کمیونسٹوں نے قومی حکومت کی تشکیل کا اعلان کیا۔ انہوں نے پیکنگ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ انہوں نے عوام اور

سیاسی رہنماؤں سے تعاون کی درخواست کی۔ کمیونسٹوں نے اقتدار اعلیٰ اپنے ہاتھوں میں مرکوز رکھا۔ صوبائی حکومت کو ایک یونٹ کے طور پر انتظامیہ چلانے کی اجازت بھی دے دی۔ روس اور دوسری مغربی ملکوں نے چین کی کمیونسٹ حکومت کو تسلیم کرلیا۔ امریکہ بہر صورت نئی کمیونسٹ حکومت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتا رہا۔ کیونکہ وہ چیانگ کائی شیک کے قائم کردہ حکومت کو تسلیم کرتا تھا۔ چین کی تاریخ میں چین کا انقلاب ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ چین صدیوں سے غیر ملکی زیر تسلّط میں آزادی سے نہ صرف محروم تھا بلکہ محکومیت کا شکار تھا۔ عوام مفلوک الحالی اور استحصال کا شکار تھے۔ نیز قومی حکومت بھی عوام کو غیر ملکی ظلم و جبر سے آزادی دلانے میں ناکام ثابت ہو چکی تھی۔ انقلاب کے بعد ماؤتسے تنگ کی قیادت میں چین ایک طاقتور، متحد اور منصوبہ بند ملک کی حیثیت سے ابھر کر عالمی سطح پر آیا۔

11.7 قومی زندگی پر چینی انقلاب کے اثرات

(Effects of the Revolution on Chinese National Life)

1949 کے انقلاب نے چین کی سماجی زندگی کا ڈھانچہ بھی بدل دیا۔ انقلابی تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ چین جیسا کہ ہم جانتے ہیں صدیوں سے شہنشاہیت اور ان کی حکومت نے سماجی نامساوات کو جنم دیا۔ چین کا معاشرہ روایتوں پر قائم تھا۔ کنفیوشش کے خیالات، تعلیمات اور نظریات کو بالادستی حاصل تھی۔ لوگ اس کی اتباع کرتے تھے۔ لوگ شہنشاہیت کی عظمت اور وقار کا احترام بطور فریضہ قبول کرتے تھے امرا کا طبقہ اور امیر لوگ پر تعیش زندگی گذارتے تھے۔ لوگوں کی محرومی، غربت، افلاس اور لاچاری سے حکمراں طبقہ کو کوئی غرض نہیں تھی۔ عام لوگوں کی زندگی غیر معیاری تھی۔ انقلاب کے بعد یہ قدریں پامال ہو گئیں۔ لوگوں نے ان کو چیلنج کرنا شروع کردیا۔ عوام اور مزدوروں کا وقار، حمیّت اور ان کی عزت کا اعتراف ہونے لگا۔ حکومت رفاہی منصوبوں کے ذریعہ ان کی معیار زندگی بدلنے کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے لگی۔ یقیناً اس انقلاب نے چین کے بے بس عوام کو باوقار زندگی گذارنے کا موقع فراہم کیا۔ انقلاب نے لوگوں کی معمول کی زندگی کو تبدیل کردیا کیونکہ انقلاب سے قبل چین کی حیثیت خراب ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی زندگی غریبی اور تنگ دستی میں گذر رہی تھی۔ قدرتی آفت مثلاً قحط سالی نے کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کو مزید ابتر بنادیا تھا۔ لوگوں کے پاس کھانے کو نہیں تھا۔ وبائی امراض مثلاً کالرا، طاعون وغیرہ نے بھی لوگوں کو مفلوک الحال بنادیا تھا۔ انقلاب کے بعد حکومت نے لوگوں کی بھلائی کے پیشِ نظر کھانے کی چیزوں کی راشنگ کردی اور لوگوں کو زندگی گذارنے کے لئے ضروری اشیا مہیا کرانے کی عملی کوشش کی۔ خورد و نوش کی کمی کو پورا کرنے کے لئے چین نے غیر ملکوں سے اناج درآمد کیا تاکہ لوگوں کو دو وقت کا کھانا دستیاب ہوسکے۔ مہنگائی سے نپٹنے کے لئے سرکار نے کئی احتیاطی تدابیر کیں مثلاً قیمتوں کے کنڑول پر سرکار کے اختیارات کو مستحکم کیا۔ قدرتی آفات اور وبائی امراض کے پھیلاؤ کو روکنے میں سرکاری سطح پر کوشش کے ساتھ اس کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش بھی قابل ستائش تھی۔ ایک منظم اور ایماندار انتظامیہ قائم کرکے ملک میں سیاسی، معاشی اور اقتصادی استحکام لانے کی کوشش کمیونسٹوں کا معاشرہ کے لئے ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اس تبدیلی کی ایک اہم خصوصیت عورتوں کی حکومت میں شراکت اور ان کو روزگار کے مواقع مہیا ہونا تھا۔ 1949ء کا انقلاب کسانوں کی زندگی میں خوش آئند تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ انقلاب سے پہلے کسانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ محنت مزدوری کے بعد بھی کسان بھوک مری کا اکثر شکار ہو جاتے۔ زراعت پرانے روایتی طرز پر ہوتی تھی۔ جس کی

وجہ سے پیداوار کم ہوتی تھی۔ مالگذاری/دیگر محصولات کی وجہ سے بچت بالکل نہیں تھی، لہٰذا سرمایہ کاری کی گنجائش کم ہی تھی۔ اس کی وجہ سے کسانوں کی زندگی اور معیار زندگی ناقابل بیان ہے، زمینداروں کے ہاتھوں استحصال کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ لیکن انقلاب نے ان کو طاقتور اور بااختیار بنادیا۔ بڑے زمینداروں سے زمینیں لے کر بے زمین کسانوں میں تقسیم کردیا جو کمیونسٹ انقلاب کی ایک بہت بڑی دین تھی۔ اس انقلاب نے جس طرح کسانوں، مزدوروں اور کمزور طبقوں کے لوگوں کو بااختیار بنایا ٹھیک اسی طرح عورتوں کو برابری کا حق دے کر ان کی عزت افزائی کی۔ ان کو بااختیار بنایا ان کو روزگار کا یکساں موقع فراہم کیا گیا۔ ان کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا گیا۔ طوائف خانہ بند کرواکر سرکار نے ان کو از سرِ نو بسانے اور قابل عزت بنا کر ان کو دوسری عورتوں کی طرح جینے کا حق دیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انقلاب نے چین کی سیاست، معیشت اور سماج کے سبھی شعبوں میں اہم تبدیلیاں کرکے چین کو بین الاقوامی شناخت دلوائی اور ین انقلاب کے بعد بہت مضبوط، مستحکم، سیاسی قوّت بن کر عالمی سطح پر اُبھرا۔

امریکی اثر ورسوخ کا خاتمہ :

1949 کے چین کے انقلاب کا عالمی تناظر میں بہت اہم اثرات مرتب ہوئے۔ اس انقلاب نے کمیونسٹوں کی قیادت میں People's Republic of China قائم کردیا۔ چین میں 1911ء کے انقلاب کے بعد خانہ جنگی کو 1949 کے انقلاب نے ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔ کیونکہ قوم پرست رہنما جن کو امریکی حمایت حاصل تھی اس انقلاب نے ان کے ہاتھ سے اقتدار اعلیٰ چھین کر کمیونسٹ نظریات کے حامی قیادت کو تفویض کردیا۔ کیونکہ کمیونسٹوں میں قوم پرستوں کے مقابلہ میں ڈسپلن اور عوام میں مقبولیت تھی۔ اس لئے امریکہ نے کئی سالوں تک کمیونسٹ حکومت کو قبول نہیں کیا اور ان سے کوئی سفارتی تعلق بھی قائم نہیں کیا۔ عوامی جمہوریہ چین (People's Republic of China) کی قیادت مغربی ممالک اور کمیونسٹ ملکوں کی طرف سیاسی طور پر مائل تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد چین بھی سیاسی، فوجی اور معاشی طاقت بن کر ابھرنے لگا اور مورخین نے عالمی جنگ کے بعد سویت یونین کی چین میں کمیونسٹ حکومت کے قیام کو پہلی جیت سے تعبیر کیا ہے جبکہ اس کو امریکی شکست بتایا ہے۔

11.8 چینی انقلاب کا بین الاقوامی رشتوں پر اثر

ایشیا اور افریقہ میں تحریک آزادی کی حوصلہ افزائی :

دانشوروں کا ماننا ہے کہ 1949ء کا انقلاب اور کمیونسٹ حکومت کا قیام نہ صرف چین کے لئے بلکہ ایشیا اور افریقی نو آبادیات کے لئے جشن آزادی کا پیغام لے کر آیا۔ کیسونکہ اس انقلاب نے ایشیا اور افریقہ میں چل رہی آزادی کی تحریک اور قومی رہنماؤں کی حوصلہ افزائی کرکے ان کو آزادی کے حصول تک لڑنے کا پیغام دیا۔ کمیونسٹ حکومت کا قیام اور اس کی قیادت جنگ آزادی کی تحریکوں کو اپنا بھرپور تعاون دینے کا بھی وعدہ کیا۔

چین کی نظریاتی فتح: چین میں PRC کا قیام کا مطلب تھا کمیونزم کی جیت۔ کیونکہ چین میں قوم پرست حکومت اور قوم پرستوں کی

رہنمائی امریکہ کر رہا تھا۔ امریکہ سرمایہ داری نظام کی بالادستی اور اس کی مقبولیت کے لئے کام کر رہا تھا۔ جبکہ کمیونسٹ چین کو بدعنوان قوم پرست حکومت کا خاتمہ کر کے کمیونسٹ نظریات کے حامل حکومت کا قیام چاہتا تھا تاکہ کمزور طبقات مثلاً کسانوں اور مزدوروں کی استحصال اور سرمایہ داری نظام کے جبر و استبداد سے بچا کر ان کی حکومت قائم کی جا سکے۔ چین میں حکومت کے قیام اور ایشیا میں کمیونزم کے عروج کا راستہ ہموار ہوا۔ اس انقلاب نے چین میں معاشی ترقی کی نئی تاریخ رقم کی۔ جواب تک جاری ہے۔ چین نے انقلاب، اشتراکیت، ماوازم اور عالمی تبدیلیوں بالخصوص سویت یونین کے زوال اور اس کے تقسیم کے بعد چین کو سماجی اور معاشی انتشار سے بچانے کے لئے معاشی اصلاحات کئے۔ چین کو ایک عالمی طاقت بننے میں چین کی قیادت کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

11.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغربی ممالک نے چین میں اپنی نوآبادیات قائم کرلیں۔ سامراجیت رفتہ رفتہ چین میں اپنا پر پھیلانے لگی۔ اس نظام کی سب سے بڑی خامی نوآبادیات کی استحصال تھی۔ چین کے حکمراں سرمایہ دار مغربی ممالک کی جارحانہ اور استحصال پر مبنی پالیسیوں کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے چین کی سیاست میں دخل اندازی اور قدرتی وسائل کے استعمال کی پالیسی کو ترک نہیں کیا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد چین میں قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ انہوں نے مغربی ممالک کو اپنے شرائط پر تجارت کرنے کے لئے مجبور کیا۔ جس کو مغربی ممالک کے تاجروں نے سرے سے خارج کر کے اپنی استحصال کی پالسیسی جاری رکھی۔ جس کے نتیجہ میں کئی جنگیں اور بغاوتیں ہوئیں۔ چونکہ چین کی فوج جدید اسلحہ سے لیس اور طاقتور بھی نہیں تھی۔ لہٰذا شکست کھاتی رہی۔ بالآخر دوسری عالمی جنگ کے دوران کمیونسٹوں نے ان ممالک کی مخالفت شروع کردی اور 1949ء میں ماؤتسے تنگ کی قیادت میں انقلاب آیا اور People's Republic of China کا قیام عمل میں آیا۔ چین میں کمیونسٹوں کی قیادت میں مستحکم حکومت ہوئی اور بالآخر غیر ملکیوں کی بالادستی ختم ہوئی۔

11.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

سامراجیت	سرمایہ داری	استحصال
مطلق العنان	زرمبادلہ	خود مختاری

11.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. پہلی اوپئیم/افیم جنگ کب ہوئی؟
2. 1842ء کی 'Treaty of Nanking' کس کے بیچ میں ہوئی تھی؟
3. دوسری اوپئیم/افیم جنگ کب ہوئی تہی؟

4. تائپنگ بغاوت کہاں ہوئی تھی؟
5. 'Open Door Policy' سے کیا مراد ہے؟
6. 'Boxer Rebellion' کیوں ہوئی تھی؟
7. 'Shantung Settlement' کیا تھا؟
8. شنگھائی حادثہ سے مختصر نوٹ لکھیے۔
9. چیانگ کائی شیک کون تھا؟
10. Washington Conference کب ہوئی تھی؟

11.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. چین میں خانہ جنگی کے وجوہات اور نتائج پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. 'Kuomintang' سے کیا مراد ہے اس کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
3. چین کے ثقافتی انقلاب کی اہمیت اور وجوہات پر تبصرہ کیجیے۔
4. پہلی اور دوسری افیم کی جنگ کے وجوہات اور نتائج کا تجزیہ کیجیے۔
5. 'Shantung Settlement' پر نوٹ لکھیے۔

11.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سُن یات سین کی قیادت میں 1911ء کے ثقافتی انقلاب پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. چین میں کمیونزم اور کمیونسٹ قیادت کے عروج کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
3. چین میں کمیونسٹ حکومت کے قیام کی اہمیت وافادیت پر مفصل نوٹ لکھیے۔

11.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
2. Keay, John, *China*: *A History*.
3. Liberthal, Kennth, *Governing China: From Revolution Through Reform*, 2004.
4. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
5. Schwartz, Benjamin, *Chinese Communism 1951 and the Rise of Mao*, New York.
6. Space, Joharhan, D., *The Search for Modern China*, 1999.
7. Wilber, C. Martin, The Nationalist Revolution in China, 1923–28, Cambridge, 1983.
8. Yuang Benjamin, *From Revolution to Politics: Chinese Communist on the Long March*, 1990.

اکائی 12۔ سرد جنگ کی نظریاتی اور سیاسی بنیاد

(Ideological and Political Basis of Cold War)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 سرد جنگ کی ابتداء

12.3 سرد جنگ کیا ہے؟

12.4 سرد جنگ کا مفہوم

12.5 سرد جنگ کی وجوہات

12.6 سرد جنگ کی نظریاتی بنیادیں

12.7 سرد جنگ کا نتیجہ

12.8 اکتسابی نتائج

12.9 کلیدی الفاظ

12.10 نمونہ امتحانی سوالات

12.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

12.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

12.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

12.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید (Introduction)

دوسری عالمی جنگ کے بعد، امریکہ اور یو ایس ایس آر دو عظیم طاقت بن کر اُبھرے۔ ایک قوم نے دوسرے کی طاقت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ بالواسطہ عظیم طاقتوں کے مابین مقابلہ سرد جنگ کا باعث بنی۔ پھر امریکہ نے تمام سرمایہ دارانہ ممالک کی قیادت اختیار حاصل کی۔ سوویت روس نے تمام کمیونسٹ ممالک کی قیادت حاصل کی۔ جس کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے کے حریفوں کی حیثیت سے کھڑے تھے۔ ہارٹ مین کی گرافک زبان میں، "سرد جنگ ان ممالک کے مابین تناؤ کی حالت ہے جس میں اس کی طرف سے پالیسیوں کو اپنایا گیا ہے جو اس کو مضبوط بنانے کے لئے بنائی گئی ہے اور دوسرے کو کمزور کرنے کے لئے دوسرے کو کمزور کردے"۔ درحقیقت، سرد جنگ ایک قسم کی زبانی جنگ ہے جو اخبارات، رسالوں، ریڈیو اور دیگر پروپیگنڈوں کے طریقوں کے ذریعے لڑی جاتی ہے۔ یہ ایک پروپیگنڈا ہے جس میں ایک عظیم طاقت دوسرے طاقت کے خلاف ریسورٹ کرتی ہے۔ یہ ایک طرح کی سفارتی جنگ بھی ہے۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سرد جنگ کیا ہے؟ اس کا مطالعہ کریں گے۔
- سرد جنگ کے معنی و مفہوم سمجھیں گے۔
- سرد جنگ کے وجوہات اور مختلف مراحل کو سمجھیں گے۔
- سرد جنگ کے سیاسی اور نظریاتی بنیاد کا جائزہ لیں گے۔
- سرد جنگ کے اہم واقعات کا مطالعہ کریں گے۔
- سرد جنگ کے نتائج کا جائزہ لیں گے۔

12.2 سرد جنگ کی ابتداء (Origin of Cold War)

1941 میں سرد جنگ کی ابتدا کے بارے میں اسکالرز میں کوئی اتفاق رائے نہیں ہے جب ہٹلر نے روس پر حملہ کیا تو، امریکہ کے صدر روزویلٹ نے روس کو اسلحہ بھیجے۔ یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ روزویلٹ اور اسٹالن کے مابین تعلقات بہت اچھے تھے۔ لیکن جرمنی کی شکست کے بعد، جب اسٹالن پولینڈ، ہنگری، بلغاریہ اور رومانیہ میں کمیونسٹ نظریہ کو نافذ کرنا چاہتے تھے تو اس وقت انگلینڈ اور امریکہ نے اسٹالن کو شک کے نظریے سے دیکھا۔ 5 مارچ 1946 کو اپنی ''فلٹن تقریر'' میں انگلینڈ کے وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے کہا کہ سوویت روس کو لوہے کے پردے (Iron Curtain) سے احاطہ کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے اسٹالن کو گہری سوچنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں سوویت روس اور مغربی ممالک کے مابین شک وشبہ مجید وسیع ہو گیا اور اس طرح سرد جنگ نے جنم لیا۔

12.3 سرد جنگ کیا ہے؟ (What is Cold War?)

جوں جوں دوسری عالمی جنگ اپنے اختتام کو پہنچی، وہ ہم آہنگی جو USSR اور USA اور برطانوی سلطنت کے درمیان موجود تھی ختم ہونے لگی اور پرانے شبہات پھر سے کھلنے لگے۔ سوویت روس اور مغرب کے درمیان تعلقات جلد ہی اتنے مشکل ہو گئے کہ اگرچہ دو مخالف کیمپوں کے درمیان براہ راست کوئی حقیقی مسلح تصادم نہیں ہوا، 1945 کے بعد کی دہائی میں سردی کا پہلا مرحلہ دیکھنے میں آیا۔ جنگ جو 1980 کی دہائی میں کئی 'تھاؤز' کے باوجود جاری رہی۔ سرد جنگ کا مطلب یہ تھا کہ مسلح تصادم میں اپنی باہمی دشمنی کو ظاہر کرنے کی بجائے دونوں فریقوں نے ایک دوسرے پر پروپیگنڈے اور معاشی اقدامات اور عدم تعاون کی عمومی پالیسی کے ساتھ حملہ کیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، اس کے نیٹو اتحادیوں اور کچھ دیگر پر مشتمل مغربی بلاک کے درمیان فوجی اور سیاسی تناؤ کی حالت اور دوسری عالمی جنگ کے بعد 'وارسا معاہدے' سے اس کے اتحادیوں کے ساتھ سوویت یونین پر مشتمل مشرقی بلاک کی طاقتوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سرد جنگ۔ "سرد" کی اصطلاح بڑی علاقائی جنگوں کے باوجود دونوں مخالفین کے درمیان براہ راست بڑے پیمانے پر لڑائی کی عدم موجودگی کو ظاہر کرتی ہے، جسے 'پراکسی وار' کہا جاتا ہے، جسے دونوں فریقوں کی حمایت حاصل ہے۔ سرد جنگ کے نتیجے میں یو ایس ایس آر اور یو ایس اے دو عظیم طاقت کے طور پر رہ گئے تھے جو کہ سیاسی اور معاشی اختلافات کے باعث نازی جرمنی کے خلاف جنگ کے وقت کے عارضی اتحاد کو الگ کر دیتے تھے۔

سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان ہونے والی سرد جنگ کئی دہائیوں تک جاری رہی 53-1948 کے عرصے میں سرد جنگ اپنے عروج پر تھی۔ 1953 سے 1957 کے درمیان جنگی تناؤ میں کچھ نرمی آئی۔ وارسا معاہدہ، جو ایک متحد فوجی تنظیم، سال 1955 میں قائم کی گئی تھی۔ 1958-1962، کے دوران سرد جنگ پھر سے شدید ہو گئی۔ بین البراعظمی ایک بیلسٹک میزائل تھے۔ جس کو سوویت یونین کے ساتھ ساتھ امریکہ نے بنایا ہے۔ سوویت کا آغاز ہوا۔ خفیہ طور پر کیوبا میں اپنے میزائل نصب کر رہے ہیں اور ان کو جوہری داغنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کے شہروں پر حملے سرد جنگ کے پورے دور میں، سوویت یونین اور امریکہ نے یورپ میں براہ راست فوجی تصادم سے گریز کیا۔

12.4 سرد جنگ کا مفہوم (Meaning of Cold War)

'سرد جنگ' کی اصطلاح پہلی بار ایک امریکی سیاستدان برنارڈ بارچ نے استعمال کی تھی اور اسے فوراً پروفیسر لپ مین نے اس صورت حال کو بیان کرنے کے لیے اٹھایا تھا جو 1947 کے موسم بہار تک مغربی طاقتوں اور سوویت یونین کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔ اس ترقی کا پہلا اشارہ ونسٹن چرچل نے اپنی فلٹن تقریر میں دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں، "اگر مغربی جمہوریتیں اقوام متحدہ کے چارٹر کے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا رہیں تو ان اصولوں کو آگے بڑھانے کے لیے ان کا اثر و رسوخ بہت زیادہ ہوگا اور کوئی بھی ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا امکان نہیں رکھتا۔ تاہم، اگر وہ تقسیم ہو جائیں یا اپنے فرض میں کوتاہی کریں اور اگر ان تمام اہم سالوں کو ضائع ہونے دیا جائے، تو یقیناً تباہی ہم سب پر غالب آ سکتی ہے۔" انہوں نے روسی بربریت کے خلاف جنگ کے بعد کی جدوجہد کے ناگزیر ہونے کی پیشین گوئی کی تھی۔

سرد جنگ دوسری عالمی جنگ کا نتیجہ ہے۔ لیکن سرد جنگ کوئی نئی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے بھی موجود تھا۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد ہی اس نے وسیع جہت اختیار کی۔ سرد جنگ کی تعریف کرتے ہوئے، ہارٹ مین نے لکھا ہے، "سرد جنگ ممالک کے درمیان تناؤ کی ایک ایسی حالت ہے جس میں ہر فریق اپنے آپ کو مضبوط کرنے اور دوسرے کو حقیقی جنگ سے محروم کر کے کمزور کرنے کے لیے بنائی گئی پالیسیاں اپناتا ہے۔" فلیمنگ نے سرد جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "یہ ایک ایسا جنگ ہے جو میدان جنگ میں نہیں بلکہ مردوں کے ذہنوں میں لڑی جاتی ہے۔"اور ایک دوسرے کے دماغ پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔

سرد جنگ میں کبھی جنگ کا اعلان نہیں کیا جاتا تھا اور ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات برقرار رہتے تھے۔ سرد جنگ میں کچھ فوجی تصادم اور جانی نقصان شامل تھا، لیکن یہ ایک نفسیاتی جنگ بھی تھی جس کا مقصد دشمن کے اثر ورسوخ کے علاقے کو کم کرنا اور اپنے کیمپ کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ کرنا تھا۔ سرد جنگ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان دو قطبی تصادم تھی لیکن اس میں دو عظیم پاورز کے اتحادی یا سیٹلائٹ بھی شامل تھے۔ سرد جنگ کو دو نظریات اور دو کے درمیان تصادم کے طور پر بھی سمجھا جاتا ہے۔

12.5 سرد جنگ کی وجوہات (Reasons for Cold War)

سرد جنگ کے پھیلنے کے لئے مختلف وجوہات ذمہ دار ہیں۔ پہلے تو، سوویت روس اور امریکہ کے درمیان فرق سرد جنگ کا باعث بنی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ سوویت روس کے کمیونسٹ نظریہ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو وہیں دوسری طرف، روس دوسرے یورپی ممالک پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے غلبے کو قبول نہیں کر سکا۔ دوم، دونوں عظیم طاقتوں کے مابین اسلحہ کی دوڑ نے سرد جنگ کی ایک اور وجہ پیش کی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد، سوویت روس نے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کیا تھا جو مغربی ممالک کے لئے خطرہ تھا۔ چنانچہ امریکہ نے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور دیگر مہلک ہتھیاروں کی تیاری شروع کردی۔ دوسرے یورپی ممالک نے بھی اس دوڑ میں حصہ لیا۔ لہذا، پوری دنیا دو طاقت گروہ میں تقسیم ہو کر سرد جنگ کی راہ ہموار کی۔ تیسرا، نظریاتی فرق سرد جنگ کی ایک اور وجہ تھی۔ جب سوویت روس نے کمیونزم کو پھیلایا تو، اس وقت امریکہ نے سرمایہ داری کو فروغ دیا۔ اس پروپیگنڈے نے بالآخر سرد جنگ میں تیزی لائی۔ چہارم، روسی اعلامیہ نے سرد جنگ کی ایک اور وجہ بنائی۔ سوویت روس نے ماس میڈیا میں کمیونزم پر روشنی ڈالی اور مزدور انقلاب کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسری طرف، امریکہ نے کمیونزم کے خلاف سرمایہ داروں کی مدد کی۔ تو اس نے سرد جنگ کی ترقی میں مدد کی۔ پانچویں، امریکہ کا جوہری پروگرام سرد جنگ کے ایک اور مقصد کے لئے ذمہ دار تھا۔ امریکہ نے 9 اور 6 اگست 1945 کو جاپان کے ہیروشیما اور ناگاساکی کے اُوپر بمباری کے بعد سوویت یونین اپنے وجود کو لیکر کافی خوفزدہ ہوگئے۔ لہذا، اس نے امریکہ کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی اسی راستے پر عمل کیا۔ جس کی وجہ سے سرد جنگ میں اضافہ ہوا۔ آخر میں، مغربی ممالک کے خلاف سوویت روس کا ویٹو کے استعمال نے اُنہیں روس سے نفرت بڑھانے کا کا کیا۔ جب مغربی ممالک نے یو این او کی سلامتی کونسل میں کوئی نظریہ پیش کیا تو سوویت روس نے فوراً ہی ویٹو کے ذریعے اُس کی مخالفت کی۔ چنانچہ مغربی ممالک سوویت روس کے اس قدم سے ناراض ہوگئے جس نے سرد جنگ کو عروج دینے کا کام کیا۔

12.6 سرد جنگ کی نظریاتی اور سیاسی بنیادیں

(Ideological and Political Foundations of Cold war)

سرد جنگ کو بنیادی طور پر دو غالب عالمی نظریات کے درمیان سخت نظریاتی تقسیم نے تشکیل دیا تھا: سرمایہ داری، جس کی نمائندگی امریکہ کرتا ہے، اور کمیونزم، جس کی قیادت سوویت یونین نے کیا۔ اس نظریاتی کشمکش نے اس دور میں نہ صرف سیاسی حکمت عملیوں اور بین الاقوامی تعلقات کو متاثر کیا بلکہ دونوں عظیم طاقتوں کی قومی شناخت اور ملکی پالیسیوں کو بھی متعین کیا۔ سرد جنگ، سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان جغرافیائی سیاسی تناؤ کا دور، ان کے متعلقہ اتحادیوں کے ساتھ، 1945 میں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے سے لے کر 1991 میں سوویت یونین کے ٹوٹنے تک جاری رہی۔ جب کہ سرد جنگ بنیادی طور پر نظریاتی تصادم، فوجی دشمنی، اور سیاسی چالبازیوں کی خصوصیت، اس کی نظریاتی بنیادیں اور سیاسی بنیادیں اس عالمی تصادم کی پائیدار نوعیت کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں۔ سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان نظریاتی تقسیم سرد جنگ کا مرکز تھی، جو عظیم طاقتوں کی پالیسیوں اور عالمی سیاسی منظر نامے دونوں کو متاثر کرتی تھی۔

سرد جنگ کی نظریاتی بنیادیں (Ideological Basis of Cold War)

سرد جنگ بنیادی طور پر دو متضاد عالمی نظریات سے چلتی تھی: لبرل سرمایہ داری، جس کی حمایت امریکہ نے کی، اور مارکسسٹ-لیننسٹ اشتراکیت، جسے سوویت یونین نے فروغ دیا۔ ان نظریات نے نہ صرف عظیم طاقتوں کی اندرونی پالیسیوں کو تشکیل دیا بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں ان کی خارجہ پالیسیوں، اتحادوں اور مداخلتوں کو بھی تشکیل دیا۔

1. سرمایہ داری اور لبرل جمہوریت (امریکہ) (Capitalism and Liberal Democracy)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دوسری عالمی جنگ سے ایک سرکردہ سرمایہ دارانہ قوم کے طور پر ابھرا، جس کا معاشی اور سیاسی نظام نجی ملکیت، آزاد منڈیوں، انفرادی حقوق اور نمائندہ جمہوریت پر مبنی ہے۔ آزاد خیالی کے اصولوں سے جڑے ہوئے، امریکہ نے پوری دنیا میں جمہوری حکمرانی، مارکیٹ کی معیشتوں اور انفرادی آزادیوں کے تحفظ کو فروغ دے کر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش کی۔

سرد جنگ کے دوران امریکی پالیسی کی نظریاتی بنیاد کئی کلیدی عقائد کے ذریعے بیان کی گئی تھی:

ٹرومین نظریہ (1947): (The Truman Doctrine) ٹرومین نظریے نے اعلان کیا کہ امریکہ کمیونزم سے خطرے میں پڑنے والی کسی بھی قوم کی حمایت کرے گا، جس کا مقصد سوویت اثر و رسوخ کے پھیلاؤ کو روکنا ہے، خاص طور پر یورپ اور بعد میں ایشیا میں۔ روک تھام کی یہ پالیسی سرد جنگ کے دوران امریکی خارجہ پالیسی کا سنگ بنیاد بن گئی، جس میں کمیونزم کو نئے خطوں میں پھیلنے سے روکنے پر توجہ دی گئی۔

مارشل پلان (1948): (The Marshall Plan) امریکہ نے اقتصادی امداد کے ذریعے جنگ زدہ یورپ کو دوبارہ تعمیر کرنے کی

کوشش کی، اس طرح ان اقوام کو مستحکم کیا اور انہیں کمیونسٹ کنٹرول میں آنے سے روکا۔ یہ نہ صرف ایک معاشی اقدام تھا بلکہ سرمایہ داری کو غالب معاشی نظام کے طور پر فروغ دینے کے لیے ایک حکمت عملی بھی تھا۔

جمہوریت کا فروغ: (Promotion of Democracy) اقتصادی امداد کے علاوہ، امریکہ نے دنیا بھر میں جمہوری اداروں کے قیام کی بھی حمایت کی۔ عقیدہ یہ تھا کہ جمہوری حکومتوں کے کمیونسٹ اثر ورسوخ میں آنے کے امکانات کم ہوں گے اور معاشی ترقی اور سیاسی استحکام کو فروغ ملے گا، جس کے نتیجے میں امریکی مفادات کو فائدہ پہنچے گا۔ امریکہ کے لیے، سرد جنگ سوویت یونین کی طرف سے نمائندگی کرنے والے مطلق العنانیت کے سمجھے جانے والے خطرے کے خلاف "آزاد دنیا" کے تحفظ اور توسیع کی لڑائی تھی۔

2. مارکسزم-لیننزم اور کمیونزم (سوویت یونین) (Marxism, Leninism, and Communism)

دوسری طرف، جوزف سٹالن اور بعد میں دوسرے کمیونسٹ لیڈروں کی قیادت میں جو کہ سوویت یونین، مارکسزم-لیننزم کے نظریے پر مبنی تھا۔ کارل مارکس اور ولادیمیر لینن کے نظریات کی بنیاد پر، مارکسزم-لیننزم نے سرمایہ دارانہ نظام کا تختہ الٹنے، نجی ملکیت کے خاتمے، اور پرولتاریہ (محنت کش طبقے) کی آمریت کے قیام کی وکالت کی، جو بالآخر بے وطن ہونے کا باعث بنے گی۔ طبقاتی معاشرہ۔ سوویت یونین کے لیے سرد جنگ کو نہ صرف ایک جغرافیائی سیاسی جدوجہد کے طور پر دیکھا گیا بلکہ عالمی طبقاتی جدوجہد کے تسلسل کے طور پر بھی دیکھا گیا۔ سوویت یونین نے کمیونزم کو دنیا بھر میں پھیلانے کی کوشش کی، خاص طور پر ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ترقی پذیر ممالک میں، جہاں نوآبادیت مخالف تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔

بالشویک انقلاب (1917): (The Bolshevik Revolution) بالشویک انقلاب اور اس کے نتیجے میں سوویت یونین کا قیام سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف پرولتاری انقلاب کے خیال پر مبنی تھا۔ سوویت یونین میں کمیونزم کی کامیابی نے دنیا بھر میں بائیں بازو کی تحریکوں کو متاثر کیا اور اشتراکیت کے حصول کے لیے ایک نمونہ فراہم کیا۔

کومن فارم اور انقلاب کا پھیلاؤ: (Cominform and the Spread of Revolution) سوویت یونین نے کمیونسٹ انفارمیشن بیورو (Cominform) کے ذریعے کمیونزم کی رسائی کو وسعت دینے کی کوشش کی، جو کہ 1947 میں پورے یورپ اور اس سے باہر کی کمیونسٹ پارٹیوں کو مربوط کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ یو ایس ایس آر خود کو محنت کش طبقے کا محافظ اور بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے رہنما کے طور پر دیکھتا تھا۔

وارسا معاہدہ (1955): (Warsaw Pact) نیٹو کی تشکیل کے جواب میں، سوویت یونین نے اپنا ایک فوجی اتحاد بنایا، وارسا معاہدہ، جس نے یو ایس ایس آر کو مشرقی یورپ کی کمیونسٹ ریاستوں سے جوڑ دیا۔ اس فوجی بلاک نے نہ صرف مغربی جارحیت کو روکنے بلکہ مشرقی بلاک کی سیٹلائٹ ریاستوں کو کنٹرول کرنے کے ایک ذریعہ کے طور پر بھی کام کیا۔ سرد جنگ کے دوران سوویت کے اقدامات کا نظریاتی جواز اس عقیدے میں جڑا ہوا تھا کہ کمیونزم انسانی سیاسی اور معاشی ترقی کا آخری مرحلہ تھا، اور یہ کہ سوویت یونین کا فرض تھا کہ وہ دنیا کی اس

صورت حال کی طرف رہنمائی کرے۔

سرد جنگ کی سیاسی بنیاد (Political Basis of Cold War)

سرد جنگ محض نظریات کا تصادم نہیں تھی بلکہ عالمی تسلط کے لیے سیاسی اور تزویراتی جدوجہد بھی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے سیاسی تناظر نے سپر پاورز کے درمیان نظریاتی تصادم کا پس منظر فراہم کیا۔

1. یورپ کی تقسیم اور سرد جنگ کی ابتدا (The Division of Europe and the Origins of the Cold War)

دوسری عالمی جنگ کے فوراً بعد یورپ کو امریکہ اور سوویت یونین کے زیر کنٹرول علاقوں میں تقسیم کیا گیا۔ سوویت یونین نے مشرقی یورپ میں کمیونسٹ حکومتیں نافذ کرنے کی کوشش کی، جب کہ امریکہ نے مغربی یورپ میں سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کے استحکام کو یقینی بنانے کی کوشش کی۔

یالٹا کانفرنس (1945): (Yalta Conference) یالٹا میں اتحادی طاقتیں (امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین) نے جرمنی کو چار قبضے والے علاقوں میں تقسیم کرنے پر اتفاق کیا، لیکن یورپ کے مستقبل کے سیاسی نظام پر تیزی سے تناؤ پیدا ہو گیا۔ سوویت یونین، جنگ کے دوران بے پناہ جانی نقصان اٹھانے کے بعد، مشرقی یورپ میں سوویت نواز حکومتیں قائم کر کے تحفظ کی کوشش کی، جبکہ امریکہ اور برطانیہ نے ان ممالک میں آزادانہ انتخابات اور جمہوری حکومتوں کے لیے زور دیا۔

لوہے کا پردہ اور برلن کی ناکہ بندی (49-1948) (The Iron Curtain and the Berlin Blockade (1948-49) : 1946 میں، ونسٹن چرچل نے مشہور طور پر اعلان کیا کہ ایک "آئرن پردہ" پورے یورپ میں اترا ہے، جس نے کمیونسٹ مشرقی یورپ کو جمہوری مغربی یورپ سے الگ کیا۔ برلن ناکہ بندی (49-1948)، جس میں سوویت یونین نے اتحادیوں کو شہر سے باہر نکالنے کی کوشش میں مغربی برلن تک رسائی منقطع کر دی، سرد جنگ کے پہلے براہ راست تصادم میں سے ایک ہے۔

1 جرمنی کی تقسیم: (The Division of Germany) مشرق اور مغرب میں جرمنی کی تقسیم نے نظریاتی تقسیم کو مستحکم کیا۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی (مغربی جرمنی) کی تشکیل نے امریکہ اور اس کے نیٹو اتحادیوں کے ساتھ اتحاد کیا، جب کہ جرمن جمہوری جمہوریہ (مشرقی جرمنی) سوویت سیٹلائٹ ریاست بن گئی۔

2. ہتھیاروں کی دوڑ اور فوجی اتحاد (The Arms Race and Military Alliances)

امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سیاسی اور فوجی دشمنی پوری سرد جنگ کے دوران بڑھ گئی، دونوں فریق اتحاد اور فوجی تعمیر کے ذریعے طاقت کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن (The North Atlantic Treaty Organization (NATO) 1949 میں،

ریاستہائے متحدہ اور اس کے مغربی یورپی اتحادیوں نے نیٹو تشکیل دیا، یہ ایک فوجی اتحاد ہے جو سوویت توسیع کا مقابلہ کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ نیٹو کی اجتماعی دفاعی شق، جس میں کہا گیا تھا کہ ایک رکن پر حملہ سب پر حملہ تصور کیا جائے گا، سرد جنگ کے دوران امریکی سیکورٹی پالیسی کا ایک مرکزی اصول تھا۔

سوویت رد عمل اور وارسا معاہدہ: (The Soviet Response and the Warsaw Pact) جواب میں، سوویت یونین نے وارسا معاہدہ بنایا، جو مشرقی یورپ میں کمیونسٹ ریاستوں کا ایک فوجی اتحاد ہے۔ ان دو فوجی بلاکس کی تشکیل نے عالمی ہتھیاروں کی دوڑ کا آغاز کیا، کیونکہ دونوں سپر پاورز نے جوہری ہتھیاروں کی ترقی سمیت فوجی ٹیکنالوجی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی۔

نیوکلیئر ڈیٹرنس اور ایم اے ڈی (باہمی یقینی تباہی): (Nuclear Deterrence and MAD [Mutually Assured Destruction]) امریکہ اور یو ایس ایس آر دونوں کی طرف سے جوہری ہتھیاروں کی ترقی نے سرد جنگ کو ایک تناؤ میں بدل دیا، جہاں ایٹمی جنگ سے مکمل تباہی کے خوف نے دونوں فریقوں کو براہ راست فوجی تصادم سے روک دیا۔ Mutually Assured Destruction (MAD) کے نظریے کا مطلب یہ تھا کہ ایک سپر پاور کی طرف سے کسی بھی ایٹمی حملے کے نتیجے میں دوسری طرف سے تباہ کن جوابی کارروائی ہو گی، جس سے مکمل جنگ کا امکان ناقابل تصور ہو گا۔

3. پراکسی جنگیں اور عالمی اثر و رسوخ (Proxy Wars and Global Influence)

سرد جنگ کے دوران، امریکہ اور سوویت یونین دونوں پراکسی جنگوں میں مصروف رہے- فریق ثالث کے ممالک میں تنازعات جہاں دونوں فریقوں نے مخالف دھڑوں کی حمایت کی۔ کوریا، ویت نام، افغانستان اور افریقہ اور لاطینی امریکہ کے متعدد ممالک میں ہونے والی ان جنگوں نے سپر پاورز کو براہ راست تصادم کے بغیر اثر و رسوخ استعمال کرنے کی اجازت دی۔

کوریائی جنگ (1950-1953): (The Korean War): کوریائی جنگ سرد جنگ کے پراکسی تنازعہ کی ایک اہم مثال تھی۔ امریکہ نے جنوبی کوریا کی حمایت کی جبکہ سوویت یونین اور چین نے شمالی کوریا کی حمایت کی۔ جنگ ایک تعطل میں ختم ہوئی، لیکن اس نے کوریا کی دو الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کو مستحکم کیا اور سرد جنگ کے تنازعہ کی عالمی نوعیت کو اجاگر کیا۔

ویت نام کی جنگ (1955-1975): (The Vietnam War) ایک اور اہم پراکسی جنگ ویتنام کی جنگ تھی، جہاں امریکہ نے جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے مداخلت کی، جب کہ سوویت یونین اور چین نے شمالی ویتنام کی حمایت کی۔ جنگ 1975 میں سائگون کے زوال اور کمیونسٹ حکمرانی کے تحت ویتنام کے متحد ہونے کے ساتھ ختم ہوئی، جس نے امریکی مداخلت کے سامنے کمیونسٹ تحریکوں کی لچک کا مظاہرہ کیا۔

لاطینی امریکہ اور افریقہ: (Latin America and Africa) دونوں سپر پاورز نے لاطینی امریکہ اور افریقہ میں سیاسی حمایت،

اقتصادی امداد اور بعض صورتوں میں فوجی مداخلت کے ذریعے اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کی۔ امریکہ نے کمیونسٹ مخالف حکومتوں کی حمایت کی، جبکہ سوویت یونین نے انقلابی تحریکوں کی حمایت کی۔

12.7 سرد جنگ کے مختلف مراحل (Various Phases of Cold War)

سرد جنگ کی شروعات ایک دن میں نہیں ہوئی بلکہ یہ کئی مراحل سے گزرا۔

پہلا مرحلہ (The First Phase) (1946-1949)

اس مرحلے میں امریکہ اور سوویت روس نے ایک دوسرے کو انکار کردیا۔ امریکہ نے ہمیشہ روس میں ریڈ حکومت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سوویت روس نے پولینڈ، بلغاریہ، رومانیہ، ہنگری، یوگوسلاویہ اور دیگر مشرقی یورپی ممالک میں جمہوریت کو ختم کرکے کمیونزم قائم کیا۔ روس کے تسلط کو کم کرنے کے لئے ، امریکہ نے 12 مارچ 1947 کو نافذ ہونے والے ٹرومین نظریے(Truman Doctrine) کی پیروی کرتے ہوئے یونان اور ترکی کی مدد کی۔ 'مارشل پلان' کے مطابق، جس کا اعلان 5 جون 1947 کو کیا گیا تھا، امریکہ نے مغربی یورپی ممالک کو مالی مدد فراہم کی۔ اس مرحلے میں، سوویت روس کے ذریعہ ایران سے فوج کی واپسی، برلن بلوکیڈ وغیرہ نے سردی کی وجہ سے زیادہ غص. تھا۔ 1949 میں نیٹوں North Atlantic Treaty Organization کی تشکیل کے بعد، سرد جنگ میں کچھ روک لگی۔

دوسرا مرحلہ(The Second Phase) (1949-1953)

اس مرحلے میں ستمبر، 1951 میں آسٹریلیا، نیوزیلینڈ اور امریکہ کے مابین ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے جو 'انزوس ٹریٹی' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ امریکہ نے بھی 8 ستمبر 1951 کو جاپان کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ اس وقت روس اور چین کی آرمی سے اسلحہ لے کر، شمالی کوریا نے جنوبی کوریا کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ پھر یواین او کی مدد سے، امریکہ نے جنوبی کوریا کو فوجی امداد بھیجی۔ تاہم، شمالی کوریا اور جنوبی کوریا دونوں نے 1953 میں ایک امن معاہدے پر دستخط کیے جس سے جنگ کا خاتمہ ہوا۔ سوویت کمیونزم کے اثرات کو کم کرنے کے لئے، امریکہ نے کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈے میں ڈالر کی ایک بہت بڑی رقم خرچ کی۔ دوسری طرف، سوویت روس نے ایٹم بم کی ٹیسٹ کرکے امریکہ کے برابر میں رہنے کی کوشش کی۔

تیسرا مرحلہ(The Third Phase) (1953-1957)

اس مرحلہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے سوویت روس کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لئے 1954 میں سیٹو (SEATO) تشکیل دیا۔ 1955 میں امریکہ نے مشرق وسطی میں میڈو تشکیل دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں، امریکہ نے 43 ممالک کو فوجی امداد دی اور سوویت روس کے آس پاس 3300 فوجی اڈے تشکیل دیئے۔ اور اس وقت، ویتنامی جنگ کا آغاز 1955 میں ہوا۔ امریکی اقتدار کو کم کرنے کے لئے، روس نے بھی 1955 میں وارسا معاہدے پر دستخط کیے۔ روس نے بھی 12 ممالک کے ساتھ دفاعی معاہدے پر

دستخط کیے۔ جرمنی کو وفاقی جمہوریہ جرمنی میں تقسیم کیا گیا تھا جو امریکی کنٹرول میں تھا جہاں جرمن جمہوری جمہوریہ سوویت روس کے تحت تھا۔ 1957 میں سوویت روس نے اپنے دفاعی پروگرام میں اسفوتنک کو شامل کیا۔ 1953 میں اسٹالن کا انتقال ہو گیا اور خروش شیف روس کے صدر بنے۔ 1956 میں امریکہ اور روس کے مابین سوئز بحران کے بارے میں ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ امریکہ نے انگلینڈ اور فرانس جیسے اپنے اتحادیوں کی مدد نہ کرنے پر اتفاق کیا۔ درحقیقت مغربی ایشیاء کو ایک بہت بڑا خطرہ سے بچایا گیا تھا۔

چوتھا مرحلہ: (The Fourth Phase) (1957-1962)

1959 میں روسی صدر خروش شیف ایک تاریخی دورے پر امریکہ گئے۔ دونوں ممالک U-2 حادثے اور برلن کے بحران سے ناراض تھے۔ 13 اگست 1961 میں، سوویت روس نے مشرقی برلن سے مغربی برلن تک امیگریشن کی جانچ پڑتال کے لئے 25 کلو میٹر کی ایک برلن دیوار بنائی۔ 1962 میں، کیوبا کے میزائل بحران نے سرد جنگ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس واقعے نے امریکی صدر کینیڈی اور روسی صدر خروش شیف کے مابین گفتگو کا ماحول پیدا کیا۔ امریکہ نے روس کو یقین دلایا کہ وہ کیوبا پر حملہ نہیں کرے گی اور اس کے عوض روس نے بھی کیوبا سے میزائل اسٹیشن واپس لینے کا اعلان کیا۔

پانچواں مرحلہ (The Fifth Phase) (1962-1969)

پانچواں مرحلہ جو 1962 سے شروع ہوا تھا اس نے بھی امریکہ اور یو ایس ایس آر کے مابین باہمی شبہ کا نشانہ بنایا۔ جوہری ہتھیاروں پر پابندی کا مطالبہ کرنے والی دنیا بھر میں ایک تشویش تھی۔ اس عرصے میں وائٹ ہاؤس اور کریملن کے مابین ہاٹ لائن قائم کی گئی تھی۔ اس سے دونوں فریقوں کو ایٹمی جنگ سے باز رہنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے باوجود ویتنام کے مسئلے اور جرمنی میں ہونے والے مسئلے نے حقیقت میں امریکہ اور یو ایس ایس آر کے مابین سرد جنگ کو برقرار رکھا۔

چھٹا مرحلہ (The Sixth Phase) (1969-1978)

1969 سے شروع ہونے والے اس مرحلے کو امریکہ اور یو ایس ایس آر کے مابین ڈیٹینٹ نے نشان زد کیا - امریکی صدر نکسن اور روسی صدر بریزنیف نے سرد جنگ کو ختم کرنے کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ 1972 کا نمک، 1975 کی سلامتی سے متعلق سمٹ کانفرنس ہیلسنکی اور 1978 کی بیلگریڈ کانفرنس میں امریکہ اور روس ایک دوسرے کے قریب آئے۔ 1971 میں، امریکی سکریٹری خارجہ ہنری کسنجر نے چین کے ساتھ ریپروچمنٹ کے امکانات کو تلاش کرنے کے لئے چین کا خفیہ دورہ کیا۔ ڈیاگو گارسیا کو فوجی اڈے میں تبدیل کرنے کے لئے امریکی اقدام بنیادی طور پر بحر ہند میں سوویت کی موجودگی کی جائزہ لینے کے لئے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ 1971 کے بنگلہ دیش کے بحران اور 1973 کی مصر اسرائیل جنگ کے دوران، دو عظیم پاورز نے مخالف فریقوں کی حمایت میں توسیع کی۔

آخری مرحلہ (The Last phase) (1979-1987)

اس مرحلے میں سرد جنگ میں کچھ تبدیلیاں دیکھی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین اس مرحلے کو 'نئی سرد جنگ' کہتے ہیں۔ 1979

میں، امریکی صدر کارٹر اور روسی صدر بریزنیف نے سالٹ II پر دستخط کیے۔ لیکن 1979 میں سرد جنگ کو کم کرنے کے امکانات افغانستان میں اچانک ترقی کی وجہ سے متاثر ہوئے۔ ویتنام (1975)، انگولا (1976)، ایتھوپیا (1972) اور افغانستان (1979) کے امور روس کو کامیابی کے لئے سامنے لائے جو امریکہ کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ امریکی صدر کارٹر کے انسانی حقوق اور کھلی سفارت کاری پر روس نے تنقید کی۔ امریکی سینیٹ کے ذریعہ نمک II کی توثیق نہیں کی گئی تھی۔ 1980 میں امریکہ نے ماسکو میں منعقدہ اولمپک کا بائیکاٹ کیا۔ 1983 میں، روس امریکہ کے ساتھ میزائل پر ایک گفتگو سے دستبردار ہو گیا۔ 1984 میں روس نے لاس اینجلس میں منعقدہ اولمپک کھیل کا بائیکاٹ کیا۔ امریکی صدر رونالڈ ریگن کی اسٹار وار نے روس کو ناراض کیا۔ اس طرح سے امریکہ اور روس کے مابین "نئی سرد جنگ" 1987 تک جاری رہی۔

12.8 سرد جنگ کے اہم واقعات (Important Events of the Cold War)

سرد جنگ کے دور میں ہونے والی چند اہم پیش رفت ذیل میں دی گئی ہیں:

کوریائی جنگ (The Korean War)

دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد پہلی بڑی لڑائی میں، جزیرہ نما کوریا میں ایک بحران پیدا ہوا جب کمیونسٹ شمالی کوریا نے جمہوری جنوبی کوریا پر حملہ کیا۔ دونوں کے درمیان کشیدگی کو روکنے کے لیے نو تشکیل شدہ اقوام متحدہ کے لیے یہ پہلا امتحان تھا۔ سپر پاور جوان کے لیے لڑنے کے لیے اپنی پراکسی کا استعمال کر رہی تھیں۔ امریکی جنرل ڈگلس میک آرتھر کی سربراہی میں اقوام متحدہ کی فوج نے انچون کی فیصلہ کن جنگ کے بعد شمالی کوریا کو پیچھے دھکیل دیا۔ تاہم، شمالی کوریا اور چین میں دھکیلنے سے معاملات بڑھنے کی دھمکی دی گئی جب سوویت یونین نے "سرمایہ دارانہ ظلم کے خلاف "لڑائی کے طور پر اپنے اتحادیوں کی حمایت کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ جنگ 25 جون 1950 کو شروع ہوئی اور 27 جولائی 1953 کو کوریا کے غیر فوجی زون کے قیام کے ساتھ ختم ہوئی۔ سوویت یونین کے زوال کے کئی دہائیوں بعد شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان کشیدگی آج بھی برقرار ہے۔

کیوبا میزائل بحران (The Cuban Missile Crisis)

یو ایس ایس آر نے کیوبا میں جوہری میزائل نصب کیے جو کہ امریکہ کے شہروں پر مار کرنے کے لیے تیار تھے۔ امریکہ نے کیوبا کی بحری ناکہ بندی کے ساتھ جواب دیا اور دونوں عظیم طاقت جنگ کے دہانے آ کھڑے ہوئے۔ یہ تعطل 13 دن کے بعد ختم ہوا جب سوویت یونین نے میزائلوں کو واپس لے لیا۔ ویتنام جنگ میں امریکہ نے 1965 میں کمیونسٹ شمالی ویتنام کے خلاف جنگ میں جنوبی ویتنام کی مدد کے لیے فوج بھیج کر ویتنام کے بحران میں مداخلت کی۔ شمالی ویتنام کو سوویت یونین اور چین کی حمایت حاصل تھی۔

ویتنام کی جنگ (The Vietnam War)

ویتنام جنگ جو کہ 30 اپریل 1975 کو ختم ہوئی یہ امریکہ کے لیے بہت مہنگی ثابت ہوئی جہاں وہ تقریباً 58000 آدمیوں سے

محروم ہوئے۔ اپنے ہی لوگوں کے نقصانات اور جنگ مخالف جذبات نے امریکہ کو ویتنام سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر مجبور کیا۔ 1975 میں، ویتنام کی جنگ جنوبی ویتنام کی حکومت کے دارالحکومت سائگون کے خاتمے کے ساتھ، کمیونسٹوں کی فیصلہ کن فتح کے ساتھ ختم ہوئی۔

پراگ اسپرنگ (The Prague Spring)

یہ 1968 میں پیش آیا۔ چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ حکومت نے کثیر جماعتی جمہوریت اور میڈیا کے لیے مزید آزادی جیسی اصلاحات لانے کی کوشش کی۔ اس نے ماسکو میں موجود طاقتوں کو گھبرایا۔ انہیں خدشہ تھا کہ اس سے مشرقی یوروپ میں ڈومینو اثر پڑے گا جس میں ہر دوسری قوم مزید رعایتوں کا مطالبہ کرے گی اگر چیکوسلواک حکومت کو اپنا موجودہ راستہ جاری رکھنے کی اجازت دی گئی۔ USSR نے امن بحال کرنے کے بہانے فوج بھیجی، جس کے نتیجے میں پراگ اسپرنگ کو فوجیوں کی مداخلت کر USSR نے اسے ناکام بنادیا۔

خلائی دوڑ (The Space Race)

خلائی دوڑ تکنیکی ترقیوں کا ایک سلسلہ تھا جو خلائی پرواز میں برتری کا مظہر تھا، ہر قوم دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خلائی دوڑ کی ابتداء دوسری عالمی جنگ کے بعد دونوں عظیم ممالک کے درمیان جوہری ہتھیاروں کی دوڑ میں ہے جب بیلسٹک میزائل تیار کیے جا رہے تھے۔ 4 اکتوبر 1957 کو سوویت یونین نے دنیا کا پہلا سیٹلائٹ سپوتنک کو مدار میں چھوڑا۔ وہیں اپالو 11 خلائی مشن کی بدولت 20 جولائی 1969 کو امریکہ اپنی کامیابی کے ساتھ چاند پر اترا۔

افغان حملہ (Invasion of Afghanistan)

ستر کی دہائی میں امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان کشیدگی ختم ہو رہی تھی۔ لیکن اسی دوران افغانستان کے حالات نے اس رجحان کو الٹ دیا۔ افغانستان کا بحران اس وقت مزید بڑھ گیا جب سوویت فوج نے افغانستان پر حملہ کیا تاکہ وہاں کی کمیونسٹ حکومت کو مجاہدین کہلانے والے باغیوں سے لڑنے میں مدد مل سکے۔ امریکہ نے اس کا جواب وہاں دس سال تک جاری رہنے والی جنگ میں مجاہدین عناصر کی حمایت سے دیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں طالبان براہ راست ابھرے۔ امریکہ نے پاکستان کی آئی ایس آئی کے ذریعے مجاہدین کی مالی امداد کی۔ افغان جنگ 1989 میں ختم ہوئی جب سوویت فوجیں وہاں سے نکل گئیں۔ اس کے جنوبی ایشیا کے لیے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ افغان سوویت جنگ کے جنگجوؤں کو کشمیر میں داخل کیا گیا، جس سے ریاست میں شورش میں اضافہ ہوا۔

میخائل گورباچوف (Michael Gorbachev)

1985 میں میخائل گورباچوف سوویت یونین کے رہنما بن گئے۔ اس نے سرمایہ دارانہ اصلاحات کا آغاز کیا جسے Perestroika اور glasnost کہا جاتا ہے۔ اس نے 30 اکتوبر 1989 کو دیوار برلن کو بھی گرادیا۔ آخرکار 1991 میں سوویت یونین ٹوٹ گیا اور نئے ممالک روس اور دیگر آزاد قوموں کے طور پر ابھرے۔ مشرقی یورپ کے بیشتر ممالک میں کمیونسٹ حکومتوں کے خلاف عوامی بغاوتیں ہوئی۔

ناوابستہ تحریک (The Non-Aligned Movement)

سرد جنگ کا ایک اور نتیجہ نان الائنڈ موومنٹ(NAM) تھا۔ جب سرد جنگ شروع ہوئی تو ایشیا اور افریقہ کے براعظموں میں بہت سے نئے آزاد ملک تھے۔ ہندوستان سمیت ان میں سے زیادہ تر امریکہ یا سوویت یونین کے ساتھ اتحاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ سے NAM کی ممبر شپ میں ترقی ہوئی جس نے سرد جنگ کے پھیلاؤ کو روکنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا تاکہ پوری دنیا کو چھا جائے۔ NAM نیٹو جیسے فوجی بلاکس کے خلاف تھی۔ NAM ممالک کے جن بڑے لیڈروں نے اس میں اہم کردار ادا کیا ان میں ہندوستان کے جواہر لال نہرو، انڈونیشیا کے سوکارنو، مصر کے جمال عبدالناصر اور یوگوسلاویہ کے صدر ٹیٹو شامل تھے۔

12.9 سرد جنگ کا نتیجہ (Consequence of the Cold War)

سرد جنگ کے بین الاقوامی معاملات میں دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ سب سے پہلے، اس نے خوف کی نفسیات کو جنم دیا جس کے نتیجے میں مزید جدید ترین ہتھیاروں کی تیاری کے لیے دیوانہ وار دوڑ شروع ہوئی۔ نیٹو، سیٹو، وارسا پیکٹ، سینٹو، اینزس وغیرہ جیسے مختلف اتحاد صرف عالمی کشیدگی بڑھانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ دوم، سرد جنگ نے یواین او کو غیر موثر کر دیا کیونکہ دونوں عظیم طاقتوں نے مخالف کی طرف سے تجویز کردہ اقدامات کی مخالفت کرنے کی کوشش کی۔ کوریائی بحران، کیوبا میزائل بحران، ویت نام کی جنگ وغیرہ اس سمت میں روشن مثالیں تھیں۔ تیسرا یہ کہ سرد جنگ کی وجہ سے تیسری دنیا بنی۔ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کی بڑی تعداد نے دو عظیم طاقتوں کے فوجی اتحاد سے دور رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہ غیر جانبدار رہنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ناوابسطہ تحریک (Non-Aligned Movements) سرد جنگ کا براہ راست نتیجہ بن گئی۔ چوتھی بات، سرد جنگ بنی نوع انسان کے خلاف ڈیزائن کی گئی تھی۔ اسلحے کی پیداوار میں غیر ضروری اخراجات نے دنیا کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کی اور ایک ملک کو بُری طرح متاثر کیا اور لوگوں کے معیار زندگی میں بہتری کو روک دیا۔ پانچویں، 'پوری دنیا بطور خاندان' کا اصول، سرد جنگ کی وجہ سے مایوسی کی چٹان پر بکھر گیا۔ اس نے دنیا کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جو بنی نوع انسان کے لیے صحت مند علامت نہیں تھی۔ چھٹا، سرد جنگ نے ملکوں میں بے اعتمادی کی فضا پیدا کی۔ انہوں نے آپس میں سوال کیا کہ وہ روس یا امریکہ کے ماتحت کتنے غیر محفوظ ہیں۔ آخرکار سرد جنگ نے عالمی امن کو درہم برہم کر دیا۔ اتحاد اور جوابی اتحاد نے ایک پریشان کن ماحول پیدا کیا۔ یہ دنیا کے لیے ایک لعنت تھی۔ روس اور امریکہ عظیم طاقت ہونے کے باوجود بین الاقوامی بحران کے حل کے لیے آگے آئے لیکن پھر بھی وہ دنیا میں دائمی امن قائم نہ کر سکے۔

12.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عزیز طلبا، اس اکائی کے گزشتہ صفحات پر آپ نے:

سرد جنگ کیا ہے؟ اس کا مطالعہ کیا۔ سرد جنگ کے معنی و مفہوم کو سمجھا۔ سرد جنگ کے وجوہات اور مختلف مراحل کو سمجھا۔ سرد جنگ کے اہم واقعات کا مطالعہ کیا۔ سرد جنگ کے نتائج کا جائزہ لیا۔ سرد جنگ کے نظریاتی اور سیاسی بنیاد کو جانا

12.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

عظیم طاقت : عظیم طاقت ایک ایسی مملکت ہوتی ہے جس کی ایک غالب پوزیشن ہوتی ہے جس کی خصوصیت عالمی سطح پر اثر ورسوخ یا پروجیکٹ پاور بنانے کی وسیع صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ اقتصادی، فوجی، تکنیکی، سیاسی اور ثقافتی طاقت کے ساتھ ساتھ سفارتی اور نرم طاقت کے اثر ورسوخ کے مشترکہ ذرائع سے کیا جاتا ہے۔

پراکسی جنگ :دو ریاستوں یا غیر ریاستی اداکاروں کے درمیان مسلح تصادم ہے، جن میں سے ایک یا دونوں اکسانے پر یا دوسرے فریقوں کی جانب سے کام کرتے ہیں جو براہ راست دشمنی میں ملوث نہیں ہیں۔

اتحادی طاقت :دوسری عالمی جنگ کے دوران امریکہ کے قیادت میں یکجا ہوئے مملکت کا ایک گروہ۔

ڈالر سماجیت : یہ وہ اصطلاح ہے جو معاشی امداد کے ذریعے دور دراز ممالک پر غلبہ حاصل کرنے اور برقرار رکھنے میں امریکہ کی پالیسی کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

دوسری عالمی جنگ :دوسری عالمی جنگ کو دوسری عالمی جنگ بھی کہا جاتا ہے یہ ایک عالمی جنگ تھی جو 1939 سے 1945 تک جاری رہی۔اس میں دنیا کے ممالک کی اکثریت کے ساتھ دو بڑی طاقتیں اتحادی اور محور بھی شامل تھی۔

12.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1۔ لفظ سرد جنگ کا استعمال پہلی بار کس نے کیا تھا؟

(a) ونسٹن چرچل (b) میخائل گورباچوو (c) برنارڈ بارچ (d) ان میں سے کوئی نہیں

2۔ ان میں سے کون سا ملک دوسری عالمی جنگ کے دوران اتحادی طاقتوں میں شامل نہیں تھا؟

(a) امریکہ (b) روس (c) جاپان (d) فرانس

3۔2۔ امریکہ نے ماشل پلان کا اعلان کس سال کیا تھا؟

1945(a) 1946(b) 1947(c) 1948(d)

4۔ مورخین سرد جنگ کے کس مرحلہ کو 'نئی سرد جنگ' کہتے ہیں؟

(a) پہلا (b) دوسرا (c) تیسرا (d) آخری

5۔سویت یونین کس سال میں ٹوٹ تھا؟

1989 (a) 1990 (b) 1991(c) 1992 (d)

6۔ڈالر سامراجیت کس ملک سے متعلق ہے؟

(a)روس (b)امریکہ (c)جاپان (d)جرمنی

7۔کیوبا میزائل بحران کب ہوا تھا؟

1960 (a) 1962 (b) 1964 (c) (d)ان میں سے کوئی ہے

8۔ 'وارسا معاہدہ' پر کس ملک نے دستخط کیا تھا؟

(a)فرانس (b)امریکہ (c)جاپان (d)سویت روس

9۔NAMکا پورا نام کیا ہے؟

Non-aligned Movement(a)

Non Alternate Movement (b)

New Aligned Movement (c)

(d)ان میں سے کوئی نہیں

10۔ویتنام کی جنگ میں کس عظیم ملک کو شکست ملا؟۔

(a)امریکہ (b)انگریزی (c)جرمنی (d)سویت روس

12.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سرد جنگ کے وجوہات پر غور و فکر کیجیے۔
2. سرد جنگ کے معنی اور مفہوم کو بتایئے؟
3. سرد جنگ کیا ہے؟روشنی ڈالیئے۔
4. 'سرد جنگ دو عظیم طاقت کے درمیان جنگ تھی'۔ سمجھایئے۔
5. سرد جنگ کے سیاسی بنیادوں کو بتائے۔

12.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سرد جنگ کیا ہے؟اس کے نتیجہ پر روشنی ڈالیئے۔

2. سرد جنگ کے مختلف مراحل کا جائزہ لیجئے۔
3. سرد جنگ کے نظریاتی اور سیاسی بنیاد پر غور وفکر کیجئے۔

12.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Baylis, John, Steve Smith and Patricia Owens, *The Globalisation of World Politics*, Oxford, 2011.
2. Goldstein, Joshua S., and Jon C. Pevehouse, *International Relations*, Pearson, 2016, (11th Edition).
3. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
4. Lowe, Norman., *Mastering the Modern World History*, Palgrave, Macmillan, 1982.
5. Mansbach, Richard W. and Kirsten L. Rafferty, *Introduction to Global Politics*, Routledge, 2011 (2nd Edition).
6. Nye, Joseph S., *Understanding International Conflicts*, Longman, 2007, (6th Edition).
7. Overy, R., *The Inter-War Crisis, 1919–1939*, Longman, 1994.
8. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
9. Rao, B.V., *World History*, Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
10. Shimko, Keith L., *International Relations*, Houghton Mifflin Company, 2012, (4th Edition).

اکائی 13۔ ناوابستہ تحریک اور تیسری دنیا

(Non-Aligned Movement and the Third World)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 تاریخی پس منظر
13.3 نظریہ 'ناوابستگی'
13.4 ناوابستہ تحریک کا ارتقاء
13.5 رکنیت کے شرائط
13.6 ناوابستہ تحریک میں شامل ہونے کے محرک عوامل
13.7 تیسری دنیا
13.8 تیسری دنیا کی خصوصیات
13.9 تیسری دنیا کی اہم سرگرمیاں
13.10 کوآرڈینیشن بیورو کا قیام اور ناوابستہ تحریک کے اجلاسوں کا انعقاد
13.10.1 پہلا اجلاس (بلغراد) 1 سے 6 ستمبر، 1961
13.10.2 دوسرا اجلاس (قاہرہ) 1964
13.10.3 تیسرا اجلاس (لوساکا) 1970
13.10.4 چوتھا اجلاس (الجیئرز) 1973
13.10.5 پانچواں اجلاس (کولمبو) 1976
13.10.6 چھٹا اجلاس (ہوانا) 1979
13.10.7 ساتواں اجلاس (نئی دہلی) 1983
13.10.8 آٹھواں اجلاس (ہرارے) 1986

13.10.9 نواں اجلاس (بلغراد)1989
13.10.10 دسواں اجلاس (جکارتہ)1992
13.11 ناوابستہ تحریک کے مقاصد اور کامیابیاں
13.12 ناوابستہ تحریک کی کمزوریاں یاناکامیاں
13.13 سرد جنگ کے بعد ناوابستہ تحریک کی مطابقت
13.14 اکتسابی نتائج
13.15 کلیدی الفاظ
13.16 نمونہ امتحانی سوالات
13.17 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید(Introduction)

'ناوابستگی' کی اصطلاح ان ممالک کی خارجہ پالیسی کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جنہوں نے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دو عظیم طاقتوں (ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سویت روس) کے ساتھ اتحاد کرنے سے انکار کیا، اور اس کے بجائے ایک آزادانہ طریقِ کار اختیار کرنے کا انتخاب کیا۔ بین الاقوامی سیاست میں ناوابستہ تحریک اس وقت ابھر گئی جب انفرادی ناوابستہ ممالک اکٹھے ہوئے اور ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اپنی کوششوں کو مربوط اور مضبوط کیا۔ اس نے نئے آزاد اور ترقی پذیر ممالک کو عالمی معاملات میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل بنا کر بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت بدل دی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد بین الاقوامی سیاست میں ناوابستہ تحریک کے ابھرنے کی اپنی ایک خاص اہمیت تھی۔ اس تصور کی ابتدا اچانک نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ ایک سوچے سمجھے خیال کا نتیجہ تھا۔ اس کا مقصد نئے ابھرنے والے ملکوں کی آزادی کو برقرار رکھنا اور تیسری عالمی جنگ کے امکانات کو روکنا تھا۔ نوآبادیاتی اور سامراجی طاقتوں کے تسلط سے آزاد ہو کر ان ملکوں نے جنگ کے بعد وجود میں آنے والے دونوں اتحادی طاقتوں سے الگ رہ کر اپنی آزادی کی حفاظت کی تدبیر پر عمل کی۔ 1961 میں، تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ناوابستہ ممالک کی تعداد 25 تھی، اور یہ ستمبر 1992 میں جکارتہ کے اجلاس میں بڑھ کر 108 ہو چکی تھی۔

13.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

قارئین ناوابستہ تحریک اور تیسری دنیا کے درج ذیل پہلوؤں کے بارے میں جان جائیں گے :

- ناوابستگی اور تیسری دنیا کی اصطلاحات کی وضاحت۔

- ناوابستہ تحریک سے متعلق ان عوامل کا تجزیہ جو اس کے ظہور کا باعث بنے تھے۔
- ناوابستہ تحریک کا ارتقاء اور اس کی سرگرمیاں۔
- تیسری دنیا کی اہم خصوصیات اور سرگرمیاں
- سوویت روس کے انتشار اور سرد جنگ کے اختتام کے بعد کی دنیا میں ناوابستگی اور ناوابستہ تحریک کی مطابقت۔

13.2 تاریخی پس منظر (The Historical Background)

ناوابستگی دو بیک وقت ہونے والی عالمی پیشرفتوں کے تناظر میں ظاہر ہوگئی:

- براعظمِ افریقہ اور ایشیا کی حیات نو۔
- دو قطبی عالمی سیاست۔

افریقہ اور ایشیا کے ممالک کی حیاتِ نو نے ان میں نوآبادیاتی حکمرانی سے آزادی کی خواہش کو جنم دیا، اور اپنی تقدیر کو خود ہی تشکیل دینے کا عزم پیدا کیا۔ اس نے قومی اور بین الاقوامی مفادات کے اپنے نقطہ نظر کی بنیاد پر عالمی معاملات میں فعال اور آزاد شمولیت کے ایک الگ خیال کو فروغ دیا۔ اس سے نئے ابھرنے والے ملکوں کے درمیان قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ایک آزاد موقف تیار ہوا۔ یہ افریقی اور ایشیائی بحالی ایک ایسے وقت میں ہوئی جب دنیا دو مخالف کیمپوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ یہ دونوں کیمپ مختلف نظریات، مختلف سماجی واقتصادی اور مختلف سیاسی نظاموں کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس کی قیادت ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوویت روس کر رہا تھا۔ ہر کیمپ زیادہ سے زیادہ ریاستوں کے ساتھ فوجی اتحاد کے ذریعے اثر ورسوخ بڑھانے کا خواہشمند تھا۔ اس تناظر میں، نئے ابھرنے والے ممالک کی خود مختار صورتحال کو ناوابستہ قرار دیا جانے لگا، کیونکہ انہوں نے کسی بھی کیمپ کے ساتھ اتحاد کرنے سے انکار کر دیا۔

'ناوابستہ' طرز رسائی متعدد ذرائع سے پیدا ہوا تھا۔ دراصل، ان ریاستوں کے اولین مقاصد میں سے معاشی ترقی ایک اہم مقصد تھا جس کے لیے انہیں تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشی امداد اور وسائل کی بھی ضرورت تھی۔ دونوں کیمپوں کے ساتھ ناوابستگی نے انہیں تمام ممالک کے ساتھ اقتصادی تعلقات قائم رکھنے کے قابل بنایا۔ حال ہی میں آزادی حاصل کرنے والے ان ممالک کے لئے اہم شرط امن کی ضرورت تھی جس کے بغیر حقیقی ترقی ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ، یہ ممالک سرد جنگ کی سیاست سے پیدا ہونے والے عالمی خطرے سے محفوظ رہنا چاہتے تھے۔ مزید برآں، متعدد ممالک کو مختلف ضروریات نے 'ناوابستہ' طرز رسائی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ مثال کے طور پر، ہندوستان کی اندرونی سیاسی تکثیریت، سیاسی عمل، تاریخی کردار اور جغرافیائی صورتحال جیسے عوامل نے اس کی 'ناوابستہ' طرزِ رسائی کے ظہور میں اہم کردار ادا کیا۔

13.3 نظریہ 'ناوابستگی' (The Concept of Non-Alignment)

'ناوابستگی' کا مطلب ہے کہ کسی ایک یا دو بنیادی مخالف طاقتوں کا ساتھ دینے سے انکار کرنا ہے جیسا کہ سرد جنگ کے وقت متعدد ایشائی اور افریقی ممالک نے کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ناوابستگی امریکہ کی قیادت میں مغربی بلاک یا یو۔ایس۔ایس۔آر۔ کی قیادت میں کمیونسٹ بلاک کے ساتھ فوجی اتحاد کرنے سے انکار کر دینا۔ دراصل، ناوابستگی سے مراد خارجہ پالیسی میں آزادی کا دعویٰ کرنا ہے۔ بعض مغربی اسکالروں نے نظریہ 'ناوابستگی' کی اصطلاح کو تنہائی پسندی، علیحدگی، غیر جانبداری اور عدم شمولیت کے ساتھ الجھا دیا ہے۔ دراصل، ناوابستگی۔ تنہائی پسندی، علیحدگی اور غیر جانبداری نہیں ہے۔ ناوابستگی ایک سیاسی تصور ہے، جب کہ علیحدگی اور غیر جانبداری (neutrality) ایک قانونی تصور ہے۔ مزید ناوابستگی کسی ریاستی آئین میں لکھا ہوا کوئی قانون نہیں ہے، بلکہ ایک مثبت تصور ہے، لیکن علیحدگی اور غیر جانبداری کسی آئین یا دستور کی اہم خصوصیات ہو سکتے ہیں۔ الغرض، ناوابستگی سے مراد عالمی معاملات میں ایک فعال کردار ادا کرنا، اور ہر مسئلے کی بنیاد پر تمام ممالک کے ساتھ دوستی اور تعاون قائم کرنا ہے۔ یہ ہر مسئلے میں قومی مفاد کے تقاضوں کی بنیاد پر ایک آزاد حیثیت اختیار کرنے کی تدبیر ہے۔ یہ کسی نظریے کے خلاف نہیں ہے بلکہ نظریاتی اختلافات سے بالاتر ہو کر دنیا میں امن، سلامتی اور دوستی کو فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ناوابستہ اقوام نے سرد جنگ کے محاذ آرائی کی سیاست کی مسلسل مخالفت کی۔ انہوں نے دو قطبی دنیا میں واضح طور پر امن اور "امن کے علاقوں" کی تعمیر کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے علاوہ، ناوابستگی مواقع پرستی پر مبنی پالیسی بھی نہیں ہے جو ایک طاقت کو دوسری طاقت کے خلاف لڑا کر فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

13.4 ناوابستہ تحریک کا ارتقاء (Evolution of the Non-Aligned Movement)

ناوابستہ تحریک جدید نو آبادیاتی (Neo-Colonialist) تسلط کے خلاف ناوابستہ ریاستوں کے مشترکہ محاذ بنانے کی مشترکہ کوششوں سے وجود میں آئی۔ ہندوستان کے جواہر لال نہرو، مصر کے جمال عبدالناصر اور یوگوسلاویہ کے جوسیپ بروز ٹیٹو نے اس تحریک کی تعمیر میں بنیادی اقدام اٹھایے۔ ناوابستہ تحریک کے ان اولین معماروں میں نہرو نے ایک خاص کردار ادا کیا۔ نو سامراجیت (Neo-Imperialism) کے عروج اور اس کے نتیجے میں چھوٹی ریاستوں کو درپیش عدم تحفظ کے بارے میں نہرو کے ابتدائی نظریات نے اس تحریک کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ نہرو کا خیال تھا کہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کو نو سامراجیت سے لڑنے کے لیے یکجہتی اور اتحاد کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ابتدا میں ہی انہوں نے چالیس کی دہائی میں ایشیائی محاذ کو منظم کرنے کی کوشش کی تھی۔ 1947 میں انہوں نے نئی دہلی میں ایشیائی تعلقات کی کانفرنس بلائی۔ پچاس کی دہائی میں جب افریقہ کی ریاستوں نے نو آبادیاتی حکمرانی سے آزادی حاصل کرنا شروع کی تو اس محاذ کی بنیاد کو وسعت دینا ضروری ہو گیا۔ اپریل 1955 میں، نہرو نے انڈونیشیا، برما، سری لنکا اور پاکستان کے رہنماؤں کے ساتھ مل کر انڈونیشیا کے بینڈنگ (Bandung) شہر میں افرو ایشیائی کانفرنس بلائی۔ یہ دونوں کانفرنسیں اس سیاسی اور معاشی عدم تحفظ کو اجاگر کرتی ہیں جو اس وقت نئی آزاد ریاستوں کے لیے خطرہ تھا۔ تاہم، بینڈنگ کانفرنس یکساں ایشیائی اور افریقی محاذ بنانے میں ناکام رہی کیونکہ ان میں سے کئی

ریاستیں سامراج مخالف جھنڈے تلے اپنے خارجہ تعلقات کو چلانے پر راضی نہیں ہوئیں۔ وہ یا تو پہلے ہی مختلف مغربی فوجی اتحادوں میں شامل ہو چکے تھے یا مغربی طاقتوں کے ساتھ اپنے مفادات کو قریب سے پہچان چکے تھے۔ لہذا، دونوں گروہوں کے درمیان دراڑ بینڈ نگ میں ہی ظاہر ہو گئی۔ اس طرح، بینڈ نگ کانفرنس کے بعد ناوابستہ ملکوں کے لیے خطے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اصولوں کی بنیاد پر شناخت قائم کرنا ضروری ہو گیا۔ اس کوشش نے ان ریاستوں کو یوگوسلاویہ سے جوڑ دیا جو اسی طرح بین الاقوامی معاملات میں سیاسی شناخت کی تلاش میں تھی۔ 1956 میں ہندوستان، مصر اور یوگوسلاویہ کی حکومتوں کے سربراہان کے درمیان بیرونی میٹنگ نے تسلیم کیا کہ امن کے لیے جدوجہد اور تخفیفِ اسلحہ کی کوششوں کے درمیان ایک اہم ربط موجود ہے۔ یہ کانفرنس ناوابستہ تحریک کے قیام اور مشرقی یا مغربی بلاک سے ناوابستگی ظاہر کرنے میں ایک اہم قدم تھا۔ بالآخر، ان تمام کوششوں کا نتیجہ 1961 میں بلغراد میں پہلی ناوابستہ کانفرنس منعقد کرنے کی شکل میں سامنے آگیا۔ ناوابستہ تحریک کے ارکان ممالک کے لیے پانچ شرائط کا تعین اور اطلاق کیا گیا۔ ان شرائط کو پورا کرنے والے ممالک کو ہی کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا۔ وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

- آزاد خارجہ پالیسی کی حمایت کرنی چاہئے، خاص طور پر سرد جنگ کی سیاست کے تناظر میں۔
- تمام شکلوں میں نوآبادیاتی نظام کی مخالفت کرنی چاہئے۔
- فوجی بلاکس میں سے کسی کا رکن نہیں بننا چاہیے۔
- دونوں عظیم طاقتوں میں سے کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کرنا چاہیے۔
- بلغراد اجلاس میں شرکت کرنے والے ارکان کو چاہیے کہ وہ کسی بلاک کو اپنی سرزمین پر فوجی اڈہ بنانے کی اجازت نہ دیں۔

ناوابستگی کا مطلب ایک آزاد خارجہ پالیسی ہے۔ اس طرح، کسی بلاک میں شامل نہ ہو کر ایک غیر وابستہ ملک بغیر کسی تعصب کے بین الاقوامی صورتحال کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

درحقیقت، ناوابستہ تحریک کو دوسرے ممالک کی سیاست کے لیے منفی نقطہ نظر نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ اس تحریک کا مقصد دنیا کے تمام ممالک کے پُرامن بقائے باہمی کی حوصلہ افزائی کرنا، اور ان کے درمیان تعاون کے جذبے کو فروغ دینا تھا۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں جنگ ہونے کی صورت میں ایک ناوابستہ ملک پر لازم ہے کہ وہ متاثرہ ملک کے امن اور آزادی کے قیام کے لیے آزاد ممالک کے ساتھ تعاون کرے۔ ناوابستگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب کسی ملک کی آزادی کو خطرہ ہو یا اس کے ساتھ ناانصافی ہو یا جب کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر حملہ کرے تو قوم غیر جانبدار رہے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی ایک تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ایسی صورت حال میں ان کا ملک غیر جانبدار رہنے کا متحمل نہیں ہو سکتا، اور اس طرح یہ غیر جانبدار نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ، ناوابستگی کی پالیسی پر عمل کرنے سے کسی ملک کی خارجہ پالیسی مستحکم نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ خیال کرنا غلط ہو گا کہ ایک ناوابستہ ملک کو بین الاقوامی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ ناوابستہ ممالک بین الاقوامی سیاست کے میدان میں ثالثی کا کردار نہیں چاہتے ہیں۔ وہ کسی بھی مسئلے پر اس کی خوبیوں اور خامیوں کو تول کر ہی فیصلہ دیتے ہیں۔ لیکن اپنا فیصلہ دینے کے بعد وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ انہیں تنازعہ کے فریقین میں سے کسی ایک کا ساتھ دینا ہو گا۔ ناوابستہ ممالک کے

رہنما اسے عملی اور فعال سیاست کا ایک عمل سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق ناوابستہ ممالک دوسرے ملکوں کی مدد کرنے کے نظریے پر یقین کرتے ہیں۔ ناوابستہ ممالک اسے بین الاقوامی امن کے فروغ کا واحد ذریعہ قرار نہیں دیتے ہیں لیکن ان کے مطابق یہ پالیسی ان کے لیے امن برقرار رکھنے اور دنیا کے مختلف ممالک کو تحفظ فراہم کرنے کے کسی بھی طریقے سے زیادہ موزوں تھی۔ ناوابستہ تحریک کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ اپنے ارکان کو کسی نظریے، بلاک یا ملک کی مخالفت کرنے سے باز رکھنے کی خواہش رکھتی ہے۔ اس کا مقصد مختلف ملکوں کے درمیان امن اور دوستی کو فروغ دینا ہے۔ لیکن یہ کسی رکن ملک کا کسی دوسرے ملک کے نظریاتی یا سیاسی اختلاف میں شامل ہونے سے باز رہتی ہے۔ یہ مختلف بلاکس کے ارکان ممالک کی سیاست سے بھی مختلف ہے کیونکہ یہ دو ملکوں یا ملکوں کے گروہوں کے درمیان دوستی اور تعاون کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش نہیں کرتی ہے۔ درحقیقت، ناوابستگی کی پالیسی 'تیسری طاقت' کی نمائندگی نہیں ہے، اور اس کا مقصد دنیا کے مختلف ممالک پر مشتمل تیسرے بلاک کی تشکیل نہیں ہے۔

13.5 رکنیت کے شرائط (The Conditions of Membership)

21 جون 1961 کو 21 ناوابستہ ممالک کے نمائندوں نے قاہرہ میں ملاقات کی تاکہ ناوابستہ تحریک میں شامل ہونے کے لیے مطلوبہ شرائط کو تحریر کیا جائے۔ طویل بحث کے بعد حتمی فیصلہ کرنے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس ذیلی کمیٹی کے فیصلوں کے مطابق درج ذیل اصول وضع کیے گئے:

- ناوابستہ ملک کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنی آزاد پالیسی کو ترک کرے، اور ناوابستہ تحریک کے حق میں اپنی رائے اور خیالات کا اظہار کرے۔
- ارکان ممالک آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگوں کی تحریکوں کی حمایت جاری رکھ سکتے تھے۔ لیکن اس نے متعلقہ ممالک کے لئے تحریک کی حمایت کا طریقہ بیان نہیں کیا ہے۔
- ایک ملک، جو ناوابستگی کی تحریک پر یقین رکھتا ہے، کو کسی بھی کثیر ملکی فوجی اتحاد سے دور رہنا ہوگا۔

ناوابستہ تحریک کے کئی ارکان نے مندرجہ بالا اصولوں پر سختی سے عمل نہیں کیا۔ مصر، شام اور عراق نے امریکہ یا روس سے فوجی مدد حاصل کرنے کے معاہدے کیے۔ قبرص، ایتھوپیا، لیبیا، مالٹا، مراکش اور سعودی عرب نے اپنی اراضی پر فوجی اڈے قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس تحریک کا رکن بننے کا واحد معیار یہ رہ گیا تھا کہ جو ملک اس کا رکن بننا چاہتا ہے وہ سوویت یا امریکی بلاک کا رکن نہیں ہونا چاہیے۔

13.6 ناوابستہ تحریک میں شامل ہونے کے محرک عوامل

(Motivating Factors for Joining the Non-Aligned Movement)

ایسے کئی عوامل تھے جنہوں نے متعدد ممالک کو ناوابستہ تحریک میں شامل ہونے پر اکسایا:

- کئی ممالک نے سرد جنگ سے خود کو دور رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔اس قسم کے رویہ کو بعد میں غیر منسلک رویہ قرار دیا گیا۔
- ناوابستہ تحریک میں شامل ہونے والے ممالک یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ کسی بڑے ملک کے زیر اثر نہیں ہیں۔
- تحریک میں شامل ہونے والے ملکوں کو یہ خدشہ تھا کہ اگرانہوں نے کسی فوجی اتحاد میں شمولیت اختیار کی تو وہ بین الاقوامی سیاست کے مسائل میں الجھ جائیں گے،اوراپنے انفرادی مسائل کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکیں گے۔
- یہ ممالک بھی اپنی انفرادی شناخت اور سوچ کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔کسی بلاک میں شامل ہونے کی صورت میں ان کی شناخت ختم ہوسکتی تھی۔وہ کسی بڑی طاقت کا محض 'سایہ' نہیں بننا چاہتے تھے۔دوسری عالمگیر جنگ کے بعد آزاد ہونے والے ممالک سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی میدانوں میں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے خواہشمند تھے۔
- دوسری عالمگیر جنگ کے بعد آزاد ہونے والے ممالک ایک آزاد خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہونے کی خواہش رکھتے تھے۔
- ناوابستہ تحریک میں شامل ہونے والے زیادہ تر ممالک معاشی طور پر پسماندہ تھے۔ان کی خارجہ پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ کسی بھی ملک سے معاشی مدد حاصل کی جائے۔اِن مقاصد نے متعدد ممالک کو ناوابستگی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔
- علاوہ ازیں، متعدد ممالک نے سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے اس تحریک میں شمولیت اختیار کرلی۔مختلف رہنماؤں نے محسوس کیا کہ اگر وہ کسی بلاک میں شامل ہوگئے تو انہیں اپنے ممالک میں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔مزید، یہ رہنما بین الاقوامی سیاست کے جال میں الجھنے کے بجائے اپنے اندرونی مسائل کے حل کے لیے زیادہ وقت خرچ کرنا چاہتے تھے۔

13.7 تیسری دنیا (The Third World)

1950 کی دہائی کے دوران تیسری دنیا کی اصطلاح ان ممالک کے لیے استعمال کی جاتی تھی جو پہلی دنیا (صنعتی اور سرمایہ دارانہ ممالک) یا دوسری دنیا (صنعتی اور اشتراکی ممالک) کا حصہ نہیں تھے۔1950 اور 1960 کی دہائیوں کے دوران تیسری دنیا کی ریاستوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا کیونکہ یورپی نوآبادیاتی سلطنتیں ٹوٹ گئیں اور نئے آزاد ممالک وجود میں آ گئے۔1970 تک، تیسری دنیا افریقہ، ایشیا (سوائے سوویت یونین اور چین)، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، لاطینی امریکہ اور مشرق وسطیٰ پر مشتمل تھی۔وہ تقریباً سبھی ایک زمانے میں یورپی طاقتوں کی نوآبادیاں یا مینڈیٹ تھے،اور جب انہوں نے آزادی حاصل کی تو وہ غیر ترقی یافتہ یا کم ترقی یافتہ حالت میں تھے۔

1952 میں، الفریڈ سووی نامی ایک فرانسیسی کے لکھے گئے مضمون میں پہلی بار 'تیسری دنیا' کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ان کی رائے میں تیسری دنیا کے ممالک وہ ہیں ہے جن کا استحصال کیا جارہا ہے۔ایسے ممالک کو عام طور پر کمتر سمجھا جاتا ہے اور ان کی ایک الگ شناخت ہے۔ ماؤزے تنگ کے مطابق، تیسری دنیا اُن ملکوں کا گروہ ہے جو خام مال پیدا کرتی ہیں، بڑی طاقتوں کی نوآبادیاں رہی ہیں، اور پیداوار کی جدید تکنیک میں بہت پسماندہ ہیں۔ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک کو تیسری دنیا کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔انہوں نے دنیا کو پہلی دنیا، دوسری دنیا اور تیسری دنیا کے ممالک میں تقسیم کیا ہے، جیسے:

- پہلی دنیا کے ممالک میں دو عظیم طاقتیں امریکہ اور سوویت روس شامل ہیں۔
- دوسری دنیا کے ممالک وہ ہیں جن کا ان دو عظیم طاقتوں کے ساتھ فوجی اتحاد ہے۔
- تیسری دنیا کے ممالک میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے پسماندہ ممالک شامل ہیں۔

ارونگ ہارویز نے ممالک کو ان کی ترقی کے مراحل کے مطابق تقسیم کیا ہے۔ان کی رائے میں مغربی یورپ اور امریکہ پہلے زمرے میں آتے ہیں۔سوویت روس اور اس کے اتحادیوں کو دوسرے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے؛اور باقی کا تعلق تیسری قسم سے ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری قسم کے ممالک کو 'تیسری دنیا' کہا جاسکتا ہے۔یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ 'تیسری دنیا' کی اصطلاح سرد جنگ کے دوران شروع ہوئی تاکہ ناوابستہ ممالک کو مطلع کیا جائے۔آج ان ناوابستہ ممالک کو "ترقی پذیر ممالک" یا "گلوبل ساؤتھ" بھی کہا جاتا ہے۔

13.8 تیسری دنیا کی خصوصیات (Characteristics of the Third World)

تیسری دنیا کی ریاستیں ناوابستگی کے حق میں تھیں، جس کا مطلب ہے کہ وہ سرمایہ دار یا کمیونسٹ بلاک میں سے کسی کے ساتھ گہرا تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے، کیونکہ وہ دونوں کے مقاصد پر بہت مشکوک تھے۔ہندوستان کے وزیر اعظم نہرو (1947 سے 1964 تک) نے اپنے آپ کو تیسری دنیا کے غیر سرکاری رہنما کے طور پر پیش کیا، جو ان کے خیال میں عالمی امن کے لیے ایک طاقتور قوت ثابت ہو سکتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک نے اس حقیقت پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا کہ دونوں عظیم طاقتیں ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، امریکہ نے جنوبی اور وسطی امریکہ کے معاملات میں بے شرمی سے مداخلت کی، اور اُن حکومتوں کو گرانے میں مدد کی جو اسے منظور نہیں تھیں۔اس طرح کی مداخلت انہوں نے گوئٹے مالا (1954)، ڈومینیکن جمہوریہ (1965) اور چیلے (1973) میں عملائی۔ برطانیہ، فرانس اور سوویت یونین نے مشرقِ وسطیٰ میں مداخلت کی۔ تیسری دنیا کے رہنماؤں کی متواتر ملاقاتیں ہوئیں، اور 1979 میں ہوانا (کیوبا) کے ناوابستہ اجلاس میں 92 ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔اس وقت تک 'تیسری دنیا' کے ممالک میں دنیا کی تقریباً 70 فیصد آبادی شامل تھی۔

معاشی طور پر تیسری دنیا کے ممالک انتہائی غریب تھے۔مثال کے طور پر، اگرچہ تیسری دنیا دنیا کی 70 فیصد آبادی پر مشتمل ہے، پھر بھی وہ دنیا کی خوراک کا صرف 30 فیصد کھاتے ہیں؛ جب کہ امریکہ، دنیا کی تقریباً پانچ فیصد آبادی پر مشتمل ہے، اور دنیا کی خوراک کا چالیس فیصد کھاتے ہیں۔ تیسری دنیا کے لوگوں میں اکثر پروٹین (Protein) اور وٹامنز (Vitamins) کی کمی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے صحت کی ناسازگی اور شرحِ اموات میں اضافہ ہوتا ہے۔1980 میں ویلی برینڈٹ (جو 1967 سے 1974 تک مغربی جرمنی کے چانسلر رہے) کی سربراہی میں سیاست دانوں کے ایک بین الاقوامی گروہ، اور ایڈورڈ ہیتھ (1970 سے 1974 تک برطانیہ کے وزیر اعظم) نے تیسری دنیا کے مسائل پر ایک رپورٹ (برینڈٹ رپورٹ) تیار کی۔اس رپورٹ نے کہا کہ دنیا کو تقریباً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؛ یعنی شمال اور جنوب۔ شمال میں شمالی امریکہ، یورپ، یو۔ایس۔ایس۔آر۔ جاپان، اسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ترقی یافتہ صنعتی ممالک شامل ہیں، جبکہ جنوب

میں تیسری دنیا کے بیشتر ممالک شامل ہیں۔

تیسری دنیا کے تمام ممالک میں ایک مشترکہ خصوصیت یعنی 'ترقی کے لیے جدوجہد' ہے۔ دیگر خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

1. تکنیکی علم اور جدید سائنس میں تیسری دنیا کے ممالک پسماندہ ہیں۔ اس لیے ان ممالک کی معیشت کا دارومدار زراعت پر ہے۔ عام طور پر ان ممالک کی زرعی طرزِ زندگی کا بنیادی مقصد اپنی روزی کمانا ہے۔
2. تیسری دنیا کے تقریباً تمام ممالک کا انحصار زرعی مصنوعات اور خام مال کی پیداوار پر ہے۔ لیکن ان کی درآمدات صرف چند اشیاء تک محدود ہیں۔ اگر ایسے مواد کی مانگ کم ہو جائے تو ان ملکوں کی معیشت بری طرح متاثر ہو جاتی ہے۔
3. تیسری دنیا کے ممالک میں آبادی کی شرحِ نمو (growth rate) دیگر ممالک کے مقابلے بہت زیادہ ہے۔ اس سے ان ممالک میں کئی اقتصادی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔
4. تیسری دنیا کے اکثر ممالک جمہوریت کے غیر مستحکم مراحل سے گزر رہے ہیں۔ ان کے آئین میں متواتر ترامیم کے نتیجے میں ان کی طرزِ حکومت میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔
5. تیسری دنیا کے اکثر ممالک میں صرف ایک پارٹی اقتدار حاصل کرتی ہے۔ تاہم، ہندوستان، سری لنکا اور میکسیکو جیسے ممالک ایسے نظام کی کچھ مستثنیات ہیں۔
6. تیسری دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں بدعنوانی اور رشوت ستانی بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔
7. تیسری دنیا کے ممالک فوجی نظام اور ہتھیاروں کی پیدوار پر زیادہ دھیان دیتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی ترقیاتی سرگرمیوں پر زیادہ رقم خرچ نہیں کر پاتے ہیں۔
8. تیسری دنیا میں سیاست دان اور سرکاری اہلکار اپنے ذاتی آرام کے لیے کافی رقم خرچ کرتے ہیں۔ اس طرح ان ملکوں کی معیشت عموماً کمزور ہو جاتی ہے۔
9. تیسری دنیا کے ممالک کے وسائل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر سوڈان کے پاس اتنے قدرتی وسائل نہیں ہیں جب کہ نائیجیریا کو قدرت نے بہت سارے وسائل سے نوازا ہے۔
10. تیسری دنیا کی معیشت بھی بہت سے معاملات میں ایک جیسی نہیں ہے۔
11. تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں سرمایہ دارانہ معیشت ہے جبکہ دیگر نے اشتراکی طرز کی معیشت کو اپنایا ہے۔

13.9 تیسری دنیا کی اہم سرگرمیاں (Important Activities of the Third World)

بین الاقوامی سیاست میں دو عظیم طاقتوں کی برتری کے باوجود تیسری دنیا نے عالمی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ تیسری دنیا کی اہم سرگرمیاں درج ذیل ہیں:

- ایسوسی ایشن آف ساؤتھ ایسٹ ایشین نیشنز (Association of South-East Asian Nations) کو اقتصادی معاملات میں باہمی تعاون کو بڑھانے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ اور فلپائن اس کے ارکان ممالک تھے۔
- 1947 میں، ایشیائی ممالک کے درمیان دوستی کو فروغ دینے کے لیے نئی دہلی میں ہونے والی پہلی کانفرنس میں اٹھائیس ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اسی طرح کی کانفرنسیں 1950 میں فلپائن کے بوگوئی اور 1954 میں بوگر میں بھی منعقد کی گئیں۔
- اپریل 1955 میں بینڈنگ میں پہلی افریقی ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اجلاس میں دونوں براعظموں کے انیتس ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں غیر ملکی امداد، افریقی ایشیائی ممالک کا مشترکہ فنڈ، تکنیکی علم کے تبادلے اور اقتصادی ترقی کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس نے ایک ایٹمی توانائی کی تنظیم کے قیام کا مطالبہ کیا جس میں افریقہ اور ایشیا کے ممالک کی مناسب نمائندگی ہو۔ جنوبی افریقہ اور شمالی افریقہ کے کچھ ممالک میں نسلی امتیاز کی پالیسی کی مذمت کی گئی۔ کانفرنس میں فلسطین میں عربوں کے حقوق کی حمایت کی گئی۔ اس نے اقوام متحدہ میں ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی نمائندگی کو بڑھانے کا مطالبہ کیا۔
- بینڈنگ کانفرنس نے ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں ایک مشترکہ نقطہ نظر قائم کیا۔ اس نے اقوام متحدہ میں ایک افریقی ایشیائی گروہ کی بنیاد رکھی جس نے مشرق اور مغرب کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ پانچ سال کے عرصے میں افریقی اور ایشیائی ممالک کے نمائندوں کی تعداد 45 ہو گئی۔ اس لیے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کے لیے اس گروہ کی حمایت حاصل کرنا ضروری ہو گیا۔
- 1961 کے بعد سے ناوابستہ تحریک نے بین الاقوامی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ، بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اقوام متحدہ میں افریقہ اور ایشیا سے تعلق رکھنے والے ممالک کی تعداد تقریباً دو تہائی تھی۔ وہ اپنے آپ کو 1964 کے قائم کردہ '77 کے گروپ' سے تعلق رکھنے والے بتاتے تھے۔ اگرچہ کچھ عرصے بعد ان کی تعداد 127 تک پہنچ گئی لیکن وہ اسے 'گروپ آف 77' کے نام سے ہی پکارتے رہے۔ یہ گروپ کئی اقتصادی معاملات میں متحد محاذ پیش کرتا ہے۔
- اکتوبر 1981 میں، میکسیکو کے کینکون (Cancun) میں متعدد امیر اور غریب ممالک کی ایک شمالی جنوبی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں تیسری دنیا کے نمائندوں نے اقوام متحدہ کے عالمی بینک کے ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا، لیکن امیر ممالک نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔
- شمال میں واقع ممالک کو امیر جبکہ جنوب میں واقع ممالک کو غریب سمجھا جاتا ہے۔ جرمنی کے سابقہ چانسلر بیلی گرانٹ (Billy Grant) کی پہل پر منعقد ہونے والے جنوب جنوب مباحثے میں بائیس ممالک نے شرکت کی۔ ترقی پذیر ممالک کے نمائندے اقتصادی تعاون کے معاملات میں ترقی یافتہ ممالک کے رویے سے مطمئن نہیں تھے۔ اس طرح ترقی پذیر ممالک کے چند رہنما آپس میں اقتصادی تعاون کے نئے نظام کے بارے میں سوچنے لگے۔
- ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے پندرہ ممالک (گروپ آف 15)، جو ترقی پذیر ممالک کے درمیان باہمی تعاون قائم کرنا چاہتے تھے، نے ایک گروپ بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ گروہ ستمبر 1989 میں بلغراد میں نویں غیر وابستہ تحریک کے اجلاس میں قائم کیا گیا تھا۔ اس گروہ

نے عالمی اقتصادی صورتحال اور ترقی پذیر ممالک کے بین الاقوامی تعلقات کی حالت کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔اس گروپ کی بات چیت سے جنوب اور جنوب کے درمیان تعاون کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔1992 سے 2001 تک اس گروپ نے دنیا کے مختلف مقامات پر مزید آٹھ نشستیں منعقد کیں۔ان نشستوں میں اس گروہ کے ممبران نے ترقی کے عمل میں ایک قابل اعتماد شراکت داروں کے طور پر حصہ لینے پر آمادگی ظاہر کی۔اس گروہ نے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان بار بار بات چیت کی ضرورت پر زور دیا۔ اس گروہ نے ترقی پذیر ممالک کو تکنیکی علم کی منتقلی کی بھی حمایت کی۔اس کے علاوہ، انہوں نے بین الاقوامی دہشت گردی کی شدید مذمت کی۔

- 1885 میں علاقائی تعاون کے لیے South Asian Association for Regional Cooperation قائم کی گئی۔ علاقائی سلامتی کے تحفظ اور دیگر معاملات میں تعاون کے لیے اس ایسوسی ایشن نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان، پاکستان، مالدیپ، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھوٹان اور نیپال اس کے ارکان ہیں۔

مندرجہ بالا تنظیموں اور انجمنوں نے تیسری دنیا کے ممالک کے درمیان اقتصادی تعاون کے لیے بہت زیادہ تعاون کیا ہے۔انہوں نے نسلی امتیاز اور نو آبادیاتی پالیسیوں کی مخالفت کی، اور بین الاقوامی سیاست میں ایک مناسب مقام حاصل کیا۔

13.10 کوآرڈینیشن بیورو کا قیام اور ناوابستہ تحریک کے اجلاسوں کا انعقاد

(Establishment of the Co-ordination Bureau and Convening of the Summit Conferences)

ناوابستہ تحریک کے مختلف اراکین کے درمیان ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لیے کوآرڈینیشن بیورو قائم کیا گیا تھا۔ پہلے اس کے اراکین کو مشترکہ رضامندی سے نامزد کیا جاتا تھا لیکن بعد میں اس کے اراکین کا انتخاب کیا جانے لگا۔ بیورو اجلاسوں کے ایجنڈے تیار کرتا تھا، اور اپنے اراکین کو اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں میں متعدد مسائل پر اپنی رائے ظاہر کرنے کی ہدایات دیتا تھا۔ناوابستہ تحریک کا اجلاس تقریباً ہر تین سال کے بعد منعقد ہوتا ہے۔1961 سے 2024 تک دنیا کے مختلف حصوں میں اس کی انیس کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ان اجلاسوں میں بین الاقوامی مسائل اور حالات پر تبادلہ خیال کیا جاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں مسائل کے حل کے لیے تجاویز پیش کیے جاتے ہیں۔

13.10.1 پہلا اجلاس، بلغراد: 1 سے 6 ستمبر، 1961 (First Conference: Belgrade, September 1961)

اس کانفرنس میں 25 ممالک کے نمائندوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تین دیگر ممالک بولیویا، برازیل اور ایکویڈر نے اپنے مبصرین بھیجے۔ اس کانفرنس میں درج ذیل امور پر بحث ہوئی:

- اقوام متحدہ میں کمیونسٹ چین کا داخلہ، اور برلن اور کانگو کے مسائل پر بحث ہوئی۔
- نو آبادیاتی نظام کو عالمی امن کے مفادات کے لیے نقصان دہ قرار دیا گیا۔

- اس اجلاس نے اعلان کیا کہ تمام ممالک کی خود مختاری کا احترام کیا جانا چاہیے اور ایک ملک کو دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں کسی ملک کی مداخلت میں حمایت نہیں کرنی چاہیے۔
- مستقل بنیادوں پر امن کے قیام کے لیے پسماندہ ممالک کو معاشی، سیاسی اور سماجی پسماندگی سے نجات دلائی جائے۔
- جنوبی افریقہ کی طرف سے نسل پرستی کی پالیسی کی مذمت کی گئی اور پُرامن بقائے باہمی پر یقین کا اظہار کیا گیا۔

درحقیقت بلغراد کانفرنس کے فیصلوں نے سرد جنگ کے تناؤ کو کم کرنے میں مدد کی۔

13.10.2 دوسرا اجلاس، قاہرہ: 1964 (Second Conference: Cairo, 1964)

دوسرا اجلاس 5 سے 11 اکتوبر 1964 کو قاہرہ میں منعقد ہوا جس میں 46 ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں درج ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:

- بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے پُرامن طریقے اختیار کیے جائیں۔
- تخفیفِ اسلحہ کی ضرورت پر زور دیا گیا اور ایٹمی تجربات پر پابندی کا مطالبہ کیا گیا۔
- جنوبی افریقہ کی نسل پرستی کی پالیسی کی سخت مذمت کی گئی۔
- نوآبادیاتی نظام کی تمام شکلوں کو ختم کرنے پر زور دیا گیا۔ کمبوڈیا اور ویتنام میں مداخلت ختم کی جائے اور فلسطین میں عربوں کے حقوق کو تسلیم کیا جائے۔
- چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنایا جائے۔

اس طرح قاہرہ کانفرنس نے امن کے استحکام اور پُرامن بقائے باہمی کے تصور پر زور دیا۔

13.10.3 تیسرا اجلاس، لوساکا: 1970 (Third Conference: Lusaka, 1970)

زیمبیا کے دارالحکومت لوساکا میں منعقد ہونے والے اجلاس میں 54 ممالک کے نمائندوں اور 9 مبصرین نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں درج ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:

- اگر ضرورت پڑے تو اسرائیل کا بائیکاٹ کیا جائے۔
- امریکی فوج کو ویتنام سے باہر نکالا جائے۔ اسی طرح دنیا کے تمام ممالک سے غیر ملکی افواج کا انخلاء کیا جائے۔
- ارکان ممالک سے درخواست کی گئی کہ وہ جنوبی افریقہ کی کمپنیوں کے ہوائی جہازوں کو اپنے علاقوں پر پرواز کرنے سے روک دے۔
- ناوابستہ تحریک کے لیے ایک مستقل تنظیم کے قیام کی تجویز کو رد کیا گیا کیونکہ اس کا مطلب ایک تیسرے بلاک کی تشکیل نہیں تھا۔

13.10.4 چوتھا اجلاس، الجیئرز:1973(Fourth Conference: Algiers, 1973)

اس کانفرنس میں 75 ناوابستہ ممالک کے نمائندوں اور آٹھ مبصرین نے شرکت کی۔ اس میں درج ذیل قرار دادیں منظور کی گئیں:

- سامراجی اور نسلی امتیاز کی پالیسیوں کے خاتمے پر زور دیا گیا۔
- ناوابستہ ممالک کو اپنے معاشی وسائل کو استعمال کرنے کا پورا حق حاصل ہونا چاہیے۔
- ناوابستہ ممالک کے درمیان اقتصادی، تکنیکی اور تجارتی شعبوں میں تعاون ہونا چاہیے۔
- ناوابستہ ممالک کو چاہیے کہ وہ مشترکہ طور پر عالمی طاقتوں پر دباؤ ڈالیں تاکہ وہ دنیا کے سیاسی اور اقتصادی معاملات میں ناوابستہ ممالک کی آواز کو تسلیم کریں۔
- ناوابستہ ممالک کو بدلتی ہوئی بین الاقوامی صورتحال کے تناظر میں ناوابستہ تحریک کی از سرِ نو وضاحت کرنی چاہیے۔

13.10.5 پانچواں اجلاس، کولمبو:1976(Fifth Conference: Columbo, 1976)

اس کانفرنس میں 86 ناوابستہ ممالک کے نمائندوں اور دیگر 16 مبصرین اور مہمان نمائندوں نے شرکت کی۔ کانفرنس میں درج ذیل نکات پر زور دیا گیا:

- بین الاقوامی تجارت کے قوانین کو اس طرح سے تبدیل کیا جانا چاہیے کہ ترقی پذیر ممالک کو بہتر شرائط پر مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ انہیں اپنے درآمدات کے لیے مناسب قیمتیں حاصل کرنے کا موقع ملے۔
- اقتصادی وسائل کو ترقی پذیر ممالک میں منتقل کیا جانا چاہیے اور ان کی آزادی کا احترام کیا جانا چاہیے۔
- ترقی پذیر ممالک کو غذائی اجناس کی پیداوار بڑھانے کے لیے مناسب شرائط پر کافی وسائل اور مناسب تکنیکی مشورہ فراہم کیا جانا چاہیے۔

اپنے سیاسی اعلامیے میں اس اجلاس نے درج ذیل اعلانات کیے:

- مساوات کی بنیاد پر ایک نیا سیاسی نظام تشکیل دیا جائے۔
- مغربی ایشیا، قبرص، فلسطین اور شمالی اور جنوبی کوریا کے اتحاد کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ اس تناظر میں ان کی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کی گئی۔
- بحر ہند میں غیر ملکی طاقتوں کے بحری اڈوں کا موضوع بھی زیر بحث آیا اور اس علاقے کو کشیدگی سے پاک کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس تناظر میں ڈیاگو گارشیا(Diago Garcia) میں غیر ملکی بحری اڈے کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

13.10.6 چھٹا اجلاس، ہوانا:1979(Sixth Conference: Hawana, 1979)

اس اجلاس میں ناوابستہ ممالک کے 95 ارکان نے شرکت کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں فیڈل کاسترو نے ناوابستہ ممالک کے دوست کے طور پر سوویت روس کے کردار کی مدح سرائی کی۔ اس اجلاس میں درج ذیل قرار دادیں پاس کی گئیں۔

- اس اجلاس میں کہا گیا کہ ناوابستگی کا سامراجیت، نوآبادیت، نسلی امتیاز، غیر ملکی تسلط اور بیرونی مداخلت کے خلاف جدوجہد سے فطری تعلق ہے۔
- ناوابستہ ممالک سے کہا گیا کہ وہ ایک آزاد خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہو جائے، اور آپس میں اتحاد برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔
- تیل درآمد کرنے والے ناوابستہ ملکوں کو بتایا گیا کہ وہ جنوبی افریقہ کو سپلائی بند کر دیں۔
- کیمپ ڈیوڈ میں اسرائیل کے ساتھ اتحاد کرنے پر مصر کی کارروائی کی مذمت کی گئی۔
- اگرچہ ناوابستہ تحریک کے اصولوں کے مطابق ارکان ممالک کے اندرونی معاملات کو چھیڑنے سے پرہیز کرنا تھا، لیکن کیوبا اور اسرائیل نے اس کی خلاف ورزی کی اور پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو اجاگر کیا۔

13.10.7 ساتواں اجلاس، نئی دہلی 1983 (Seventh Conference: New Delhi, 1983)

کانفرنس میں 93 ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ستمبر 1979 میں ہوا نا اجلاس کے تین ماہ بعد سوویت افواج افغانستان میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کارروائی کے نتیجے میں دو بڑی طاقتوں کے درمیان اسلحے کی حدود کے تعین کے لیے ہونے والے مذاکرات منسوخ ہو گئے۔ مغربی طاقتوں نے روس پر کئی اقتصادی اور سیاسی پابندیاں لگانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ، اس نے ناوابستہ تحریک کے کئی ارکان کے درمیان دراڑ پیدا کر دی۔ ایک طرف ویت نام، شام، جنوبی یمن، ایتھوپیا نے روس کی کارروائی کی حمایت کی، تو دوسری طرف سنگاپور، مراکش، زائر، نیپال، پاکستان، مصر اور دیگر نے سوویت روس کی بھرپور مخالفت کی۔ ہندوستان اور چند دیگر رکن ممالک نے خواہش ظاہر کی کہ افغانستان سے سوویت روس کی افواج کا انخلا اور بیرونی مداخلت کا خاتمہ ہو۔ اسی اثنا میں عراق اور ایران، برطانیہ اور ارجنٹائن، اور لبنان پر عرب اور اسرائیل تنازعات نے انتہائی کشیدہ صورتحال پیدا کر دی۔

کانفرنس کے آغاز میں ہندوستان کی سابقہ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بڑی طاقتوں سے اپیل کی کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکیاں دینے سے باز رہیں۔ پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق نے اندرا گاندھی کو ان کی تقریر پر مبارکبادی پیش کی۔ انہوں نے پانچ نکاتی اقتصادی پروگرام پیش کیا۔ انہوں نے افغانستان میں سوویت روس کی مداخلت پر تشویش کا اظہار کیا اور مسئلہ کشمیر پر بھی بات کی۔ اس اجلاس کی قرارداد میں مندرجہ ذیل سیاسی معاملات سے متعلق بات کی گئی:

- جنوبی افریقہ میں سیاہ فام لوگوں کے استحصال، ان کے حقوق کی پامالی اور ان کے ساتھ توہین آمیز رویے کی مذمت کرتے ہوئے اجلاس نے ان کے ساتھ مکمل حمایت کا وعدہ کیا۔
- نمیبیا کے حوالے سے اجلاس نے یہ رائے مرتب کی کہ اس ملک کو آزاد قوم بننے کا بنیادی حق حاصل ہے۔
- اس اجلاس نے لاطینی امریکہ کے کئی ممالک میں جدید نوآبادیت، سامراجیت اور غیر ملکی تسلط کے خلاف شروع کی گئی تحریکوں کی حمایت کی۔

- اس اجلاس میں افغانستان کے مسئلے کے حل اور اس علاقے سے غیر ملکی افواج کے انخلاء پر اعتماد کا اظہار کیا گیا۔
- جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے اختلافات کو بات چیت کے ذریعے حل کریں اور اپنے علاقے میں بیرونی طاقتوں کی مداخلت کو روکے۔

درجِ بالا سیاسی اعلانات بے معنی تھے، کیونکہ اس میں تحریک ایسی حکومتوں سے مخاطب تھی جو نہ تو ناوابستہ تحریک کے ارکان تھے اور نہ ہی مخاطب ممالک اس کے زیر اثر تھے۔ علاوہ ازیں، قرارداد میں شامل متعدد امور پر ارکان کے درمیان اختلافِ رائے پائی گئی۔

13.10.8 آٹھواں اجلاس، ہرارے: 1986 (Eighth Conference: Harare, 1986)

1986 کے ہرارے اجلاس میں ناوابستہ ممالک کی تعداد 101 تک پہنچ گئی تھی۔ اجلاس میں درج ذیل قراردادیں پاس کی گئی:

- جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی کے خلاف کارروائی کا ایک جامع پروگرام شروع کیا جانا چاہیے، جس میں جنوبی افریقہ کی طرف ٹیکنالوجی کی منتقلی پر پابندیاں، درآمدات کا خاتمہ، تیل کی فروخت پر پابندیاں، اور ہوائی ٹریفک پر بندش شامل ہیں۔
- اس اجلاس نے اقوام متحدہ سے درخواست کی کہ وہ نمیبیا کی آزادی کی حمایت میں اپنا خصوصی اجلاس منعقد کرے۔
- اس میں نوآبادیت اور سامراجیت کی پالیسیوں کی سخت مذمت کی گئی۔

اقتصادی شعبے میں ترقی پذیر ممالک کے درمیان تعاون کو فروغ دینے کے لیے ایک کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ کمیشن غربت، بھوک، ناخواندگی اور دیگر مسائل کے حل کے لیے تجاویز پیش کرے گا۔ کمیشن کی تقرری کو اجلاس کا قابل تعریف کارنامہ قرار دیا گیا۔

13.10.9 نواں اجلاس، بلغراد: 1989 (Ninth Conference: Belgrade, 1989)

اس اجلاس میں ناوابستہ تحریک کے ارکان کی تعداد 102 ہو چکی تھی جن میں سے 98 ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں شرکاء نے مغربی طاقتوں کے خلاف اپنا مخالفانہ رویہ ترک کیا، اور تحریک کے ارکان کو جدید معاشی نوآبادیت سے بچانے کے ذرائع تلاش کیے۔ اس کانفرنس میں درج ذیل نکات پر بات کی گئی:

- نوآبادیات کو ختم کرنا بنی نوعِ انسان کا اخلاقی فرض ہے۔
- غیر ملکی قرضوں کے بھاری بوجھ اور تیسری دنیا کے ممالک کو درپیش تحفظ پسند رکاوٹوں (protectionist obstacles) کا مسئلہ حل ہونا چاہیے۔
- ماحول کی بڑھتی ہوئی آلودگی کے پیش نظر ایٹمی گندگی کو تلف کیا جانا چاہیے۔
- نشہ آور ادویات کے استعمال اور ان کے غیر قانونی کاروبار کو روکنے کے لیے موثر اقدامات کی ضرورت پر زور دیا گیا۔
- ان ممالک کی ایٹمی توانائی کی پیداوار پر پابندیاں نہیں لگائی جانی چاہئے جو اسے پُرامن ذرائع کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔
- ترقی پذیر ممالک کے درمیان تعاون اور ہم آہنگی کے فروغ کے لیے بارہ ارکان ممالک کے نمائندوں کی ایک ٹیم تشکیل دی جانی چاہیے۔

- نمیبیا کی آزادی کے حوالے سے اقوام متحدہ کے منصوبے کے خلاف جنوبی افریقہ کی کارروائی پر گہرے تشویش کا اظہار کیا گیا۔

مذکورہ بالا کے علاوہ، امریکہ، اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی پالیسیوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ امریکہ سے کہا گیا کہ وہ کیوبا (Cuba) کے خلاف اپنے دشمنانہ اقدامات کو ختم کرے، اور نکاراگوا (Nicaragua) کی بغاوتوں کے حوالے سے لاطینی امریکی ممالک کے اقدامات کی حمایت کرے۔ اسرائیل سے درخواست کی گئی کہ وہ لبنان سے اپنی فوجیں نکال دے۔ نسلی امتیاز کی تنقید اور نیلسن منڈیلا سمیت تمام سیاسی قیدیوں کی غیر مشروط رہائی کے مطالبے کا اعادہ کیا گیا۔ اجلاس نے یہ اعلان بھی کیا کہ تحریک کا بنیادی مقصد آزادی، مساوات اور سماجی انصاف پر مبنی ایک نیا نظام قائم کرنا ہے۔

13.10.10 دسواں اجلاس، جکارتہ:1992 (Tenth Conference: Jakarta, 1992)

اس اجلاس میں 108 ممالک کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ اس میں درج ذیل نکات پر بات کی گئی:

- دنیا کے تمام ممالک کو مساوات پر مبنی عالمی نظام قائم کرنے اور بین الاقوامی مسائل کو پُرامن طریقے سے حل کرنے کی تلقین کی گئی۔
- ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات میں بہتری اور ترقی پذیر ممالک کو امداد دینے کے لیے مذاکرات کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔
- ناوابستہ ممالک کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔
- اقوام متحدہ، خاص طور پر سلامتی کونسل، کی تنظیمِ نو پر زور دیا گیا۔

اس اجلاس میں، سرد جنگ کے خاتمے کی وجہ سے چند نمائندوں نے ناوابستہ تحریک کو ختم کرنے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ لیکن متعدد ارکان ممالک کی درخواستوں نے اس کی مطابقت اور ضرورت کو اجاگر کیا۔ وزرائے خارجہ کی سطح پر پاکستان نے ناوابستہ تحریک کو ایک ایسا نظام تیار کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، جس میں دو طرفہ تنازعات کو تحریک کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ یہ کشمیر کو ناوابستہ تحریک کے ایجنڈے پر لانے کا ایک چالاک منصوبہ تھا، لیکن پاکستان اپنے سفارتی عزائم میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس تحریک کے ذریعے لیا گیا ایک اہم فیصلہ عمومی اور عالمگیر تخفیفِ اسلحہ کا اعلان تھا۔ ناوابستہ تحریک نے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے تمام ہتھیاروں کے مکمل خاتمے کے لیے ایک قرارداد پیش کرتے ہوئے اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے جانے کا عزم کیا۔ ہندوستان کے موقف کی اس توثیق نے امتیازی (NPT) Non Proliferation Treaty پر دستخط کرنے کے خلاف ہندوستان کے مستقل موقف کی حوصلہ افزائی کی۔ ناوابستہ تحریک کی طرف سے NPT پر ہندوستان کے موقف کی توثیق زیادہ اہم تھی کیونکہ ناوابستہ تحریک کے 113 اراکین میں سے 111 پہلے ہی NPT پر دستخط کر چکے تھے۔ اسرائیل سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں پر قبضے کو ترک کرے، اور اپنی تمام جوہری صلاحیتوں کو فوری طور پر International Atomic Energy کے تحفظات کے مکمل دائرہ کار میں لائے۔ الغرض، بین الاقوامی سطح پر ناوابستہ تحریک نے اپنے متعدد اجلاسوں کے ذریعے غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

ناوابستہ تحریک کا انیسواں اجلاس جنوری 2024 میں یوگنڈا کے دارالحکومت کامپالا میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں تقریباً 120 ارکان ممالک نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں شرکاء نے اسرائیل-حماس جنگ کے دوران اسرائیل کے اقدامات کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس اجلاس میں ناوابستہ ممالک نے مندرجہ ذیل نکات پر زور دیا:

- اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قانون کے احترام کو برقرار رکھنا۔
- عصری بین الاقوامی صورت حال میں ناوابستہ تحریک کے کردار کو دوبارہ زندہ کرنا۔
- غزہ پٹی پر اسرائیلی فوج کی غیر قانونی جارحیت، فلسطینی شہریوں، شہری اشیاء کے خلاف اندھادھند حملوں، اور فلسطینی آبادی کی جبری نقل مکانی کی شدید مذمت کی گئی، اور فوری جنگ بندی کا مطالبہ کیا گیا۔
- اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ جوہری تخفیفِ اسلحہ بین الاقوامی امن اور سلامتی کے لیے ضروری ہے۔
- بین الاقوامی وعدوں کے مطابق انسانی حقوق کے فروغ اور تحفظ کی تصدیق کی گئی۔
- 2030 تک صنفی مساوات اور خواتین کو بااختیار بنانے کے مکمل احساس کو حاصل کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا۔
- دہشت گردی کی تمام شکلوں کی پُرزور مذمت کی گئی۔
- جنوب-جنوب اور شمال-جنوب تعاون کو مضبوط کرنے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔
- علاقائی اور بین الاقوامی تجارت، اور مناسب ٹیکنالوجی کی منتقلی کی حمایت کی گئی۔
- ناوابستہ ممالک میں سائنس، ٹیکنالوجی اور اختراعات کے فروغ کی حمایت کی گئی۔
- عالمی خوراک کے بحران سے نمٹنے کے لیے زرعی شعبے کو مضبوط کرنے کی کوششوں میں تعاون کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

13.11 ناوابستہ تحریک کے مقاصد اور کامیابیاں

(Goals and Achievements of the Non-Aligned Movement)

دونوں عظیم طاقتوں کا خیال تھا کہ تمام ممالک کو کسی نہ کسی بلاک میں شامل ہونا چاہیے۔ ان کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کے رویے میں تبدیلی آئی۔ 1953 میں سٹالن کی وفات کے بعد سوویت روس نے اعلان کیا کہ کوئی ملک کسی ایک بلاک میں شامل ہونے کا پابند نہیں ہے۔ 1956 میں سوویت کمیونسٹ پارٹی (Soviet Communist Party) کی بیسویں کانگریس نے تسلیم کیا کہ ناوابستہ ممالک خارجہ امور میں اپنی پالیسی پر عمل کر سکتے ہیں۔ مغربی بلاک نے بھی بیسویں صدی کی ستر کی دہائی میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ اس طرح، ناوابستہ تحریک دونوں عظیم طاقتوں کے شکوک و شبہات کو دور کرنے اور اپنے لیے خیر سگالی اور احترام کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی۔

ناوابستہ تحریک کا ایک بڑا ہدف نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ تھا۔ اس تحریک کے اجلاسوں نے قومی آزادی کی تحریکوں کی مسلسل حمایت

کی،اوران تحریکوں کی قیادت کرنے والی تنظیموں کواپنے اجلاسوں میں مکمل اراکین کادرجہ دیا۔اس نے نسلی امتیازاور ناانصافی کی بھی مذمت کی اور جنوبی افریقہ اور نمیبیا میں نسلی امتیاز کے خلاف تحریک کی مکمل حمایت کی۔آج دونوں ممالک میں یہ مکروہ پالیسی آزادی اور جمہوری حکومت کے قیام کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔اس نے دونوں عظیم طاقتوں کے درمیان تناؤ کو کم کرنے اور انہیں 'Detente ' کے مرحلے تک پہنچانے میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔

تیسرا پہلو جس میں ناوابستہ تحریک نے اہم کردار ادا کیا وہ قیامِ امن اور تخفیفِ اسلحہ ہے۔اس کے امن، پُرامن بقائے باہمی، انسانی بھائی چارے کی حمایت، اور کسی بھی قسم کے جنگوں کی مخالفت نے سرد جنگ کے تناؤ کو کم کیا۔اس نے بڑی طاقتوں کو ان راستے پر چلنے سے روکا جس سے ان کے درمیان جنگ کا امکان تھا۔ برلن مسئلہ، کوریائی جنگ، ویتنام کی جدوجہد، چینی ساحلوں پر جزائر سے جڑے تنازعہ (1955) اور نہرِ سویز (1956) جیسے مسائل میں ناوابستہ ممالک کی اپیلوں نے مطلوبہ اثرات مرتب کیے۔اس نے اس بات پر زور دیا کہ ہتھیاروں کی پیداوار کو کم کرکے وسائل کو سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔اس نے پہلے ایٹمی تجربے کا مطالبہ کیا اور بعد میں تمام کیمیائی ہتھیاروں کی نشوونما، ان کی ذخیرہ اندوزی اور استعمال پر پابندی لگانے والے معاہدے کا مطالبہ کیا۔

ناوابستہ تحریک اقوام متحدہ کی ساخت کو تبدیل کرنے اور اس کے اعضاء کے ذریعے بین ریاستی تعلقات کی مدت کو تبدیل کرنے میں بھی کامیاب ہوئی۔ چالیس اور پچاس کی دہائی میں اقوام متحدہ کے اعضاء میں ہونے والے مباحثوں پر مکمل طور پر عظیم طاقتوں اور ان کے ساتھیوں کا غلبہ تھا۔ناوابستگی کے ظہور نے اس صورتحال کو بدل دیا۔اس نے نہ صرف جنرل اسمبلی میں ووٹنگ کی ایک نئی اکثریت پیدا کی، بلکہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم بھی قائم کیا جس نے تیسری دنیا کے مقاصد کی حمایت کی۔اس طرح، ناوابستگی طرز رسائی نے عالمی سیاست میں تیسری دنیا کی شرکت کو آسان بنادیا، اور اس عمل میں بین الاقوامی تعلقات کو جمہوری بنادیا ہے۔

اقتصادی مساوات کے بارے میں بات کرتے ہوئے یہ ناوابستہ تحریک ہی تھی جس نے نیو انٹرنیشنل اکنامک آرڈر (New International Economic Order) کے قیام کا مطالبہ کیا۔ دراصل، اپنی سیاسی خودمختاری کے باوجود، نئی آزاد ریاستیں اقتصادی طور پر غیر مساوی رہیں۔ وہ وہی خام مال پیدا کرنے والے ممالک رہے جو ترقی یافتہ دنیا کو اپنی اجناس کم قیمت پر بیچتے تھے، اور ان سے تیار شدہ اشیاء زیادہ قیمت پر خریدتے تھے۔المیہ یہ تھا کہ وہ ایک جابرانہ معاشی نظام کا حصہ بن چکے تھے۔اس طرح، وہ تیار شدہ اشیاء، مالیات اور ٹیکنالوجی کے لیے ترقی یافتہ شمال پر مستقل طور پر انحصار کرتے تھے۔اس معاشی استحصال کو ختم کرنے کے لیے، ناوابستہ تحریک نے مساوات، عدم امتیاز اور تعاون کی بنیاد پر بین الاقوامی اقتصادی اور مالیاتی نظام کی تنظیمِ نو کا مطالبہ کیا۔

ناوابستگی کی تبلیغ نے ترقی یافتہ دنیا کو کسی حد تک یہ احساس دلایا ہے کہ تیسری دنیا کی محرومی کسی دن ان کی خوشحالی پر بھی منفی اثر ڈال سکتی ہے۔اس نے بڑی حد تک انہیں مذاکرات کرنے پر مجبور کیا۔ تیسری دنیا کے معاشی مطالبات کو قابل بحث بنانے میں کامیابی کے علاوہ،

ناوابستہ تحریک نے کچھ مخصوص مسائل کے لیے بھی اپنی جنگ جیت لی ہے۔ ناوابستہ تحریک نے مداخلت پسند تجارتی پالیسی کو بھی جائز قرار دینے میں کامیابی حاصل کی، جسے ترقی پذیر ممالک اپنانا چاہتے تھے۔ اس نے کامیابی سے دنیا کی توجہ ان مسئلوں کی طرف مبذول کروائی ہے جو ملٹی نیشنل کمپنیوں (Multinational Companies) کے کردار سے پیدا ہوئے ہیں، خاص طور پر ٹیکنالوجی کی منتقلی کے تناظر میں۔ اس نے ایک بہتر مالیاتی نظام قائم کرنے کے لیے آئی۔ ایم۔ ایف۔ پر زور ڈالا کہ وہ ترقی پذیر ملکوں کو قرضوں کی ادائیگی میں مدد فراہم کرے۔

ناوابستہ تحریک نے ثقافتی میدان میں پول آف نیوز ایجنسیز (Pool of News Agencies) کے کارنامے کو انجام دیا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سیاسی اور معاشی طور پر کمزور ممالک مغربی مواصلاتی نظام کی مدد کے بغیر معلومات اکٹھی کرنے اور بیرونی دنیا سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ اس کی سب سے اہم کامیابی اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس نے ترقی پذیر دنیا کو یہ سکھایا ہے کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ ہونے کے باوجود آزاد معاشی ترقی کیسے کی جاسکتی ہے۔ اس کے ارکان کی بڑی تعداد اور امن برقرار رکھنے کے لیے غیر جانبدارانہ پالیسی پر عمل کرنے کی وجہ سے ناوابستہ تحریک نے کامیابی سے اقوام متحدہ میں اثر رسوخ پیدا کیا۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی طاقت بڑھ گئی، اور سلامتی کونسل کی طاقت کسی حد تک کمزور ہو گئی۔

13.12 ناوابستہ تحریک کی کمزوریاں یا ناکامیاں

(Weaknesses or Failures of the Non-Aligned Movements)

ناوابستہ تحریک کی کمزوریاں یہ تھیں:

- مغربی طاقتوں کی رائے میں ناوابستگی کی پالیسی موقع پرستی پر مبنی تھی، اور اصولوں کے مطابق نہیں تھی۔
- ناقدین کے مطابق یہ تحریک کئی نظریات پر مبنی تھی لیکن جہاں تک ان کے نفاذ کا تعلق ہے تحریک ان کو حاصل کرنے میں خاطر خواہ طور پر ناکام رہی۔ مغربی بلاک نے اس تحریک پر اپنے اصل مقصد یعنی سوویت بلاک کے تئیں ہمدردی چھپانے کا الزام لگایا۔ اگرچہ اس تحریک نے کئی مواقع پر سوویت بلاک کی حمایت کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک نے کمیونسٹ بلاک کی پالیسیوں اور عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا۔
- متعدد ناقدین کی رائے میں ناوابستہ تحریک کا انحصار معاشی میدان میں بیرونی مدد اور ہتھیاروں کی خریداری پر تھا۔ دونوں طاقتوں سے اس قسم کی امداد حاصل کرنے کے لیے انہوں نے خود کو غیر منسلک قرار دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے دونوں طاقتوں سے امداد لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ناوابستگی کی اپنی شناخت کھو چکے ہیں۔
- کسی بیرونی ملک کے حملے کی صورت میں ناوابستہ تحریک غیر ملکی مدد حاصل کرنے کی حالت میں نہیں تھی۔ مثال کے طور پر، چین کے ہندوستان پر حملے کے وقت (1962) یہ محسوس ہوا کہ کئی ناوابستہ ممالک کو ہندوستان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

- جہاں تک بین الاقوامی سیاست کے دائرے کا تعلق ہے، تحریک کا دائرہ محدود ہے۔اس تحریک کی ساری پالیسی دو عظیم طاقتوں کی سیاست کے مدار میں گھومتی ہے۔
- کئی لوگوں کی طرف سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ناوابستگی کی پالیسی کا بنیادی مقصد کسی ملک کی فلاح و بہبود نہیں بلکہ بین الاقوامی سیاست میں رہنما بننے کی خواہش ہے۔
- متعدد ناقدین کے مطابق ناوابستہ تحریک بین الاقوامی سیاسی نظام میں اہم تبدیلیاں لانے میں ناکام رہی ہے۔ کئی بین الاقوامی مسائل میں طاقتور ممالک نے اپنا موقف نہیں بدلا۔ ہندوستان کی مخالفت کے باوجود امریکہ نے شمالی اور جنوبی کوریا کی سرحد پار کر دی۔ روس کی فوجیں ہنگری اور چیکوسلواکیہ میں داخل ہوئیں۔ چار عرب اور اسرائیل جنگوں کے دوران ناوابستہ تحریک کا کردار معمولی رہا۔
- یہ تحریک ایک نئے عالمی انتظام کے لیے موزوں ماحول پیدا نہ کر سکی۔ ہوانا کانفرنس (1979) کے دوران یہ واضح تھا کہ تحریک تین گروہوں میں تقسیم ہونے والی ہے۔ پہلے گروپ میں کیوبا، افغانستان، ویت نام، ایتھوپیا، جنوبی یمن تھے جنہوں نے روس کی پالیسیوں کی حمایت کی۔ دوسرے گروپ میں صومالیہ، سنگاپور، زائر، فلپائن، مراکش، مصر، وغیرہ تھے جو امریکہ کے حامی بن گئے۔ تیسرے گروپ میں ہندوستان، یوگوسلاویہ، سری لنکا، وغیرہ تھے، جو دنیا کو درپیش تمام سیاسی مسائل میں آزادانہ رویہ اپنانا چاہتے تھے۔
- اپنے اراکین میں بنیادی اتحاد کے فقدان کی وجہ سے تحریک ترقی یافتہ اقوام کے استحصال کے خلاف محاذ نہیں بنا سکی۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کے لیے کوئی موثر پروگرام بھی نہیں بنا سکی، البتہ انہوں نے ایک دوسرے کا استحصال کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ، تیل درآمد کرنے والے ممالک نے تحریک کے دیگر ارکان کو کوئی رعایت نہیں دی۔
- ناوابستہ ممالک کی حکومتوں کی نوعیت مختلف ہے۔ ہندوستان اور سری لنکا جیسے ممالک میں جمہوری حکومت ہے جبکہ نیپال، مراکش اور ایتھوپیا میں بادشاہوں کی حکومت ہے۔ ویتنام، کیوبا اور لاؤس میں کمیونسٹ حکومتیں ہیں جبکہ برما، گھانا، یوگنڈا میں فوجی آمروں کی حکومت ہے۔ اس کے علاوہ ہر ملک کے مسائل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بعض مواقع پر چند ناوابستہ ممالک کے درمیان کشیدگی نے انہیں جنگ کے قریب پہنچا دیا تھا۔ پنچشیل اصولوں کی خلاف ورزی اور لاعسکر کاری نے ثابت کر دیا ہے کہ تحریک کی کوئی بنیادی اہمیت نہیں تھی۔

13.13 سرد جنگ کے بعد ناوابستہ تحریک کی مطابقت

(Relevance of Non Aligned Movement after Cold War)

فروری 1992 میں، ناوابستہ ممالک کے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں مصر نے ارکان سے تحریک ختم کرنے کی اپیل کی، لیکن ارکان کی اکثریت نے اس کی مخالفت کی۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ تحریک اب بھی درج ذیل شعبوں میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے:

- نئے بین الاقوامی نظام کے قیام کا مطالبہ کرنا۔

- تخفیفِ اسلحہ کے لیے دباؤڈالنا۔
- جنوب اور جنوب کے درمیان تعاون کی حوصلہ افزائی کرنا۔
- بین الاقوامی دنیا میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تسلط کی مخالفت کرنا۔
- ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان، اور شمال اور جنوب کے درمیان بات چیت پر دباؤڈالنا۔
- بہتر مالی حیثیت والے ارکان ممالک کو ترقی پذیر ممالک کی مدد کے لیے اپنے وسائل استعمال کرنے پر راضی کرنا۔
- جدید نو آبادیت کے تحت استحصال کی مخالفت کرنا۔
- اقوام متحدہ کی تنظیمِ نو کے لیے طاقتور ممالک پر دباؤڈالنا تا کہ وہ اس پر راضی ہو جائیں۔اس سلسلے میں تجویز دی گئی کہ ویٹو پاور استعمال کرنے والے ارکان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور جنرل اسمبلی کو مزید اختیارات دیئے جائیں۔

ان اہداف کی حصولیابی کے لئے ناوابستہ تحریک کی مطابقت بڑھ جاتی ہے۔

آج کی دنیا دو عظیم طاقتوں میں منقسم نہیں ہے، لیکن اس کی تشکیل کی نوعیت کے بارے میں بھی کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ کچھ مصنفین کا خیال ہے کہ امریکہ واحد عظیم طاقت ہونے کی وجہ سے یہ یک قطبی ہے۔ دیگر مصنفین کا استدلال ہے کہ یہ کثیر قطبی ہے کیونکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ ساتھ یورپی یونین، جاپان، روس اور چین بھی مضبوط سیاسی طاقتیں ہیں۔ کچھ اسکالروں نے اسے دونوں یک قطبی اور کثیر قطبی کا نام دیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ اور G-7 طاقتیں باقی دنیا کو قابو کرنے کی صورتحال میں ہیں۔ لہذا، دنیا کے اس عالمی منظر نامے میں ناوابستگی ایک مشکل عمل بن چکی ہے اور اس کے برعکس کسی درمیانی کردار کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ اس لئے، اس پر عمل کرنے کی اشد ضرورت ہے، کیونکہ شمال کے غلبے سے بچنے کے لئے جنوب کے ترقی پذیر ممالک کو اپنی آزادی پر زور دینے اور مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا یہ کہ اس وقت تیسری دنیا کے ممالک پر بھی دباؤڈالا جا رہا ہے کہ وہ ترقی یافتہ ممالک کے تیار شدہ اشیاء کے لئے بازار کھولے اور املاک کے حقوق کے سوال پر ترقی یافتہ دنیا کے تمام مطالبات مان لیں، جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں تجارت سے متعلق تحفظ پسندی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح یہ تاثر بھی فروغ پا رہا ہے کہ تیسری دنیا کسی نہ کسی طرح ماحولیاتی آلودگی کی ذمہ دار ہے جب کہ حقیقت میں یہ شمالی ممالک کے ذریعہ وسائل کا بے دریغ استعمال ہے جو ماحولیاتی آلودگی کا سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ، شمالی حکومتیں اپنے غیر پائیدار پیداوار اور کھپت کے نظام کو برقرار رکھنے پر تلی ہوئی ہیں، اور جنوبی حکومتوں سے توقع کرتے ہیں کہ وہ شمال کے لیے ماحول محفوظ رکھے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کی جانب سے ترقی پذیر ممالک کو ٹیکنالوجی کی منتقلی پر سخت پابندیاں عائد کرنے کا رجحان ہے۔ دراصل، ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ممالک کو تکنیکی ترقی کے ثمرات سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کی پابندیاں کمپیوٹر سے لے کر دیگر مشینی اشیاء تک، خصوصی مرکب کے دھاتوں سے لے کر کیمیائی اشیاء اور طبّی آلات تک ہر چیز کا احاطہ کرتی ہیں۔ یقیناً یہ انتہائی ناانصافی ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ موجودہ دنیا ایٹمی اور غیر ایٹمی ممالک میں تقسیم کی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ممالک خود ایٹمی ہتھیاروں کو بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں، لیکن یہ دوسروں کو ایسے ہتھیار حاصل کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جوہری ہتھیاروں کا ہدف اب تیسری دنیا کے ممالک ہو سکتے ہیں کیونکہ انہیں ایٹمی ہتھیاروں کی حامل طاقتوں کی سلامتی کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ، تیسری دنیا کے ممالک پر اب زبردست دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی پیداوار سے باز رہیں اور اپنے مبینہ ضرورت سے زیادہ فوجی اخراجات کو کم کریں۔

پانچویں بات یہ کہ اقوام متحدہ کے تحت کثیر جہتی کو زندہ رکھنے کے بجائے، امریکہ کی سربراہی میں نئے اتحاد نے اپنے ایجنڈے میں ردوبدل کرنے کے لیے عالمی ادارے کے کثیر جہتی کردار کو تباہ کرنے کے لیے ہمہ گیر مہم چلائی گئی۔ غربت کا خاتمہ، ترقیاتی منصوبے، تجارت، مالیات اور قرض جیسے سخت گیر معاشی مسائل کو اقوام متحدہ کے ایجنڈے سے ہٹا کر انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ، ورلڈ بینک اور General Agreement on Trade and Tariffs کو منتقل کر دیا گیا، جن پر ان کا زیادہ کنٹرول ہے اور جو انہیں باہمی شرائط اور باہمی تعلق استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اقوام متحدہ کا حصہ بننے والے ممالک کو مالی امداد سے انکار کے ذریعے دھوکے میں رکھا جا رہا ہے۔ اور اقوام متحدہ کے سلامتی کونسل میں یہ مستقل ممبران ہیں جو عالمی امن اور سلامتی کو متاثر کرنے والے تمام فیصلے لیتے ہیں۔

مندرجہ بالا تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی ناوابستہ ممالک کی آزادی کے خطرات اور دباؤ نے نئی شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں موجودہ منفی رجحانات ایک منصفانہ اور جمہوری عالمی نظام اور ناوابستہ تحریک کے اغراض و مقاصد کے خلاف ہیں۔ ناوابستہ بڑے یا امیر ممالک یا ممالک کے گروہ میں سے کسی کو بھی ان نئی حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا، ناوابستہ ممالک کو مشترکہ سوچ اور عمل کے لیے مل جل کر رہنا چاہیے۔ اس لئے، ناوابستہ ممالک کے متذکرہ بالا منفی رجحانات کو مندرجہ ذیل تین اہم طریقوں سے زائل کیا جا سکتا ہے:

- اقوام متحدہ میں اصلاحات اور اسے مضبوط کرنا۔
- جنوب جنوب تعاون کی حوصلہ افزائی کرنا۔
- ضروری اصلاحات کے ذریعے ناوابستہ تحریک کو مستحکم کرنا۔

اس طرح موجودہ عالمی سیاست میں ناوابستگی کو آج دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے لیے اتنی ہی متعلقہ بنائی جا سکتی ہے جتنی کہ یہ سرد جنگ کے دوران تھی۔ تاہم، اس کی نااہلی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ناوابستہ تحریک کو شدید اندرونی مسائل کا سامنا ہے۔ ان مسائل میں رکنیت کے معیارات (جو بہت زیادہ آزاد خیال ہیں اور اکثر اس کی خلاف ورزی کی جاتی ہے)، اراکین میں نظم و ضبط کا فقدان، اتفاق رائے کے طریقِ کار میں کمزوریاں اور عالمی واقعات کی نگرانی کے لیے کسی مخصوص طریقِ کار کی عدم موجودگی شامل ہیں۔

13.14 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ناوابستہ تحریک دو عالمی پیش رفتوں کے تناظر میں ابھر گئی تھی: تیسری دنیا کے ممالک کی قومی آزادی کی جدوجہد؛ اور امریکہ اور یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ کے درمیان سرد جنگ جس کے نتیجے میں دو فوجی بلاک اور اتحاد وجود میں آ گئے۔ سیاسی آزادی کے باوجود تیسری دنیا کے ممالک اب بھی معاشی طور پر پسماندہ اور نئے سامراجی دباؤ کا شکار تھے۔ اس صورتحال کو بہتر کرنے کے لیے تیسری دنیا کے ممالک ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئے اور ناوابستہ تحریک قائم کی۔ وہ اتحاد کے نظام سے باہر رہنا چاہتے تھے تاکہ بیرونی پالیسی اور تعلقات میں ایک آزادانہ طریقِ کار پر عمل کیا جا سکے۔ ناوابستہ تحریک نے انہیں اپنی خارجہ پالیسی کو برقرار رکھنے اور اپنے ملکوں کی معاشی ترقی کے لیے کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس نے مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے تیسری دنیا یا جنوب کے ترقی پذیر ممالک کو درپیش مشترکہ مسائل پر بحث کرنے کے لیے ایک اہم فورم (forum) فراہم کیا۔ یہ تحریک ان اصولوں کو برقرار رکھتی ہے جو بین الاقوامی نظام میں سیاسی اور اقتصادی انصاف کو فروغ دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی کامیابیاں نمایاں تھیں۔ لیکن سرد جنگ کے اختتام کے بعد ناوابستہ تحریک کی مطابقت کے بارے میں بحث جاری ہو گئی۔ اگرچہ سرد جنگ کا تناظر بدل چکا ہے، لیکن دنیا اب بھی امیر اور غریب ملکوں، یا ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں بٹی ہوئی ہے۔ ترقی پذیر ممالک جو دنیا کی آبادی کا تین چوتھائی حصہ ہیں صرف بین الاقوامی سیاسی نظام کے حاشیے پر ہیں۔ ناوابستگی کی پالیسی اس وقت تک عمل میں رہے گی جب تک کہ بین الاقوامی سیاسی نظام حقیقی مساوات اور باہمی تعاون کی بنیاد پر کام نہیں کرے گا۔ اس لئے، ناوابستہ تحریک کو دوبارہ فعال کرنے اور اس کی تجدید کی فوری ضرورت ہے تاکہ مزید مساوات پر مبنی عالمی نظام کے لیے مل کر کام کیا جا سکے۔

13.15 کلیدی الفاظ (Key Words)

ناوابستگی : 'ناوابستگی' کا مطلب ہے کہ کسی ایک یا دو بنیادی مخالف طاقتوں کا ساتھ دینے سے انکار کرنا ہے جیسا کہ سرد جنگ کے وقت متعدد ایشائی اور افریقی ممالک نے کیا تھا۔ ناوابستگی سے مراد خارجہ پالیسی میں آزادی کا دعویٰ کرنا ہے۔

تیسری دنیا : تیسری دنیا کی اصطلاح ان ممالک کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو پہلی دنیا (صنعتی اور سرمایہ دارانہ ممالک) یا دوسری دنیا (صنعتی اور اشتراکی ممالک) کا حصہ نہیں ہیں۔

تخفیفِ اسلحہ : تخفیفِ اسلحہ ہتھیاروں کو کم کرنے یا ختم کرنے کا عمل ہے۔ یہ عام طور پر کسی ملک کی فوج یا مخصوص قسم کے ہتھیاروں سے متعلق ہے۔

13.16 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

13.16.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ناوابستہ تحریک کا پہلا اجلاس کب اور کہاں منعقد ہوا؟

2. بینڈنگ(Bandung)کانفرنس کب منعقد ہوئی؟

3. سرد جنگ کن دو عظیم طاقتوں کے درمیان لڑی گئی؟

4. ناوابستہ تحریک کے معروف رہنماوں کے نام بتائے۔

5. دوسری عالمگیر جنگ کب ختم ہوئی؟

6. ہندوستان کے پہلے وزیراعظم کون تھے؟

7. South Asian Association for Regional Cooperation کب قائم کی گئی؟

8. ناوابستگی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

9. 1992 میں ناوابستہ تحریک کا اجلاس کہاں منعقد ہوا؟

10. ناوابستہ تحریک کا حالیہ اجلاس کب اور کہاں منعقد ہوا؟

13.16.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. کس قسم کی تاریخی صورت حال ناوابستہ تحریک کے ظہور کا باعث بنی؟

2. کیاناوابستہ تحریک مستقبل میں کوئی مفید مقصد پورا کر سکتی ہے؟بحث کیجئے۔

3. ناوابستہ تحریک کی کمزوریوں اور ناکامیوں پر روشنی ڈالئے۔

4. 1980 کے بعد سے شمال اور جنوب کے درمیان فرق کو ختم کرنے کے لیے کیا کوششیں کی گئی ہیں اور وہ کتنی کامیاب رہی؟

5. تیسری دنیا کی اہم خصوصیات بیان کریں۔

13.16.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ناوابستہ تحریک کی کامیابیوں پر بحث کریں۔

2. تیسری دنیا کی اہم سرگرمیوں پر ایک مضمون لکھئے۔

3. سرد جنگ کے بعد ناوابستہ تحریک کی مطابقت پر روشنی ڈالئے۔

13.17 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Burns and Ralph, *World Civilizations*, WW Norton: Goyal Saab Publishers, Delhi, 2001.
2. Covaski, Jovan, *Non-Aligned Movement Summits*, Bloomsbury Academic, London, 2022.
3. Dev, Arjun and Indira Arjun Dev, *History of the World from Late nineteenth to the Early Twenty-First Century*, Orient Black Swan, New Delhi, 2009.
4. Guy, Arnold, *Non-Aligned Movement and the Third World*, Scarecrow Press Inc., 2006.
5. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first

pub. in 1999).

6. Kochler, Hans, *The Principles of Non-Alignment*, Third World Centre for Research and Publishing, 1982.
7. Lowe, Norman, *Mastering the Modern World History*, Palgrave, Macmillan, 1982.
8. Mathur, L.P., *Twentieth Century World*, Avishkar Publishers & Distributors, Jaipur, 2004.
9. Nester, William R., *Globalization: A Short History of the Modern World*, Palgrave, Macmillan, 2010.
10. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
11. Perry, Marvin, *Western Civilization*: *Ideas, Politics and* Society, Wadsworth Cengage Learning, 2011.
12. Willettes, Peter, *The Non-Alignment Movement: The Origin of a Third World Alliance*, Popular Prakashan, Bombay, 1978.

اکائی۔ 14 اقوام متحدہ: کامیابیاں اور چیلنجز

(The UNO: Achievements and Challenges)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 اقوامِ متحدہ کی ابتدا
14.3 مقاصد اور اُصول
14.4 اقوام متحدہ کا ڈھانچہ
14.5 ذیلی اعضاء
14.6 انتظامیہ
14.7 اقوام متحدہ کی کامیابیاں
14.8 درپیش چیلنجز
14.9 اکتسابی نتائج
14.10 کلیدی الفاظ
14.11 نمونہ امتحانی سوالات
14.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
14.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
14.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
14.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید(Introduction)

اقوام متحدہ(UN) ہمارے دور کا ایک اہم بین الاقوامی ادارہ ہے۔ یہ 1945 میں 51 ممالک کے رکن ممالک کے ساتھ قائم کیا گیا تھا اور اس کی موجودہ رکنیت 192 ہے۔ آج دنیا کے بیشتر ممالک اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ اقوام متحدہ کی سرگرمیاں نہ صرف حکومتوں کی ضرورتوں اور امیدوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ اقوام متحدہ ایک عالمی ادارہ ہے اور اس کی سرگرمیاں وسیع ہیں۔ مبالغہ آرائی کے بغیر، ہماری زندگی کا کوئی ایک پہلو ایسا نہیں ہے جو اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کے بڑھتے ہوئے دائرہ کار کے باہر ہو۔

14.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد طلبا اس قابل ہو جائیں گے کہ

- اقوام متحدہ کے اصول اور مقاصد کو سمجھ سکیں۔
- اقوام متحدہ کے ڈھانچہ سے بھی واقف ہو جائیں۔
- اقوام متحدہ کے ذیلی اعضاء اور اس کے انتظامیہ سے واقف ہو جائیں۔
- اقوام متحدہ کے افعال اور اس کا ہیڈ کواٹر سے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔

14.2 اقوام متحدہ کی ابتداء(Origin of the UNO)

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں دو عالمی جنگیں ہوئیں جن کی وجہ سے 80 ملین افراد ہلاک ہوئے۔ ان جنگوں میں سے ہر ایک عالمی رہنما اور لوگوں نے پُرامن دنیا کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کا عزم کیا۔ دوسری عالمی جنگ میں دشمن ممالک (جیسے جرمنی، جاپان اور اٹلی) کی مکمل شکست سے پہلے ہی، امریکہ، سابق سوویت یونین اور برطانیہ کی زیر قیادت اتحادی طاقتوں نے لیگ آف نیشنز کی جگہ ایک تنظیم کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ امریکی صدر، روزویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم، ونسٹن چرچل نے اگست 1941 میں بحر اوقیانوس کے چارٹر پر دستخط کیے جس میں جنگ کے بعد امن کے ادارے کی خواہش کی نشاندہی کی گئی۔ اس کے بعد ماسکو، تہران، ڈمبرٹن اوکس اور یالٹا میں مختلف نظریات اور تجاویز پر تبادلہ خیال کے لیے کانفرنسوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ آخر کار، امریکہ نے 1945 کے اوائل میں سان فرانسسکو کانفرنس کی میزبانی کی تاکہ نئی تنظیم 'اقوام متحدہ' کے چارٹر کو حتمی شکل دی جا سکے۔ اقوام متحدہ کا قیام 24 اکتوبر 1945 کو عمل میں آیا۔ تب سے ہم 24 اکتوبر کو یو این ڈے کے طور پر مناتے ہیں۔ چارٹر اقوام متحدہ کا آئین ہے۔ اس میں تنظیم کے مقاصد، اقوام متحدہ اور اس کے رکن ممالک دونوں کے طرز عمل کی رہنمائی کرنے والے اصول، بنیادی اعضاء اور ان کی ساخت اور اختیارات کی فہرست دی گئی ہے۔

14.3 مقاصد اور اصول(Objectives and Principles)

چارٹر شروع ہی میں اقوام متحدہ کے چار وسیع مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے۔

(i) جارحیت کو دبانے کے لیے اجتماعی اقدامات کے ذریعے اور تنازعات کے پرامن حل کے ذریعے بین الاقوامی امن اور سلامتی کو برقرار رکھنا؛

(ii) مساوات اور خودارادیت کے اصول کے مکمل احترام پر مبنی ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار کرنا۔

(iii) اقتصادی، سماجی، ثقافتی یا انسانی شعبوں میں بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینا۔

(iv) انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کی حوصلہ افزائی کرنا۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول میں، اقوام متحدہ اور اس کے رکن ممالک دونوں کو اہم رہنما اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں سر فہرست ممالک کے درمیان برابری کا اصول ہے چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا، مضبوط ہو یا کمزور۔ اقوام متحدہ رکن ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی، اقوام متحدہ کے رکن ممالک سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بین الاقوامی امن و سلامتی کو خطرے میں ڈالے بغیر دیگر ممالک کے ساتھ اپنے تنازعات پرامن طریقے سے حل کریں۔ مزید یہ کہ رکن ممالک کو کسی دوسرے رکن کے خلاف دھمکیوں یا طاقت کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔ ارکان کا فرض ہے کہ وہ امن کے نفاذ میں اقوام متحدہ کی مدد کریں۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی نوٹ کر چکے ہیں کہ بین الاقوامی امن اور سلامتی کی بحالی اقوام متحدہ کا ایک بہت اہم مقصد ہے۔ دوسرے مقاصد امن کے مقصد کے تکمیل ہیں۔ اقوام متحدہ کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے، ہمیں عالمی ادارے کے ایک بنیادی پہلو کو ذہن میں رکھنا چاہیے: یہ ایک سیاسی ادارہ ہے جو عالمی سیاست کے تناظر میں اپنی رکن حکومتوں کی خدمت کرتا ہے۔

نہ حکومتوں کی ترجیحات اور نہ ہی بین الاقوامی سیاست میں رجحانات مستحکم ہیں۔ وہ وقت بہ وقت بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے اختیارات کے استعمال میں، اقوام متحدہ سخت، مکینیکل یا یکساں نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا، اقوام متحدہ کے کردار کو لچک اور عملیت پسندی سے نشان زدہ کیا جاتا ہے۔ عام طور پر اقوام متحدہ نے سخت رویہ اختیار نہ کرنے کو ترجیح دی۔ جب بھی جارح ملک کو امن کی خلاف ورزی کی شکایات موصول ہوئیں تو اس کی مذمت کریں۔ اس کے بجائے، اس نے اپنی کوششوں کو فوری طور پر لڑائی روکنے اور جنگ سے پہلے کے مقامات پر فوجوں کے انخلاء کی کوشش کرنے کی ہدایت کی ہے۔

14.4 اقوام متحدہ کا ڈھانچہ (Organs of the UNO)

اقوام متحدہ کے پاس متعدد خصوصی ایجنسیاں ہیں جو اقوام متحدہ کے اندر خود مختار اداروں کے طور پر کام کرتی ہیں۔ جنرل اسمبلی، سلامتی کونسل، اقتصادی اور سماجی کونسل، بین الاقوامی عدالت انصاف، اور سیکرٹریٹ اقوام متحدہ کے بنیادی اجزاء ہیں۔ اقوام متحدہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو عالمی امن کو برقرار رکھنے اور تمام بنی نوع انسان کے لیے سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ یہ اقوام کے درمیان دوستانہ تعلقات کو فروغ دینے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ آپ اقوام متحدہ، اس کی تشکیل، اور اس کے کام کرنے کے بارے میں سب کچھ یہاں پڑھ سکتے ہیں۔ اقوام متحدہ اپنے 6 اہم اداروں کے ذریعے کام کرتا ہے۔ وہ ہیں:

- جنرل اسمبلی (General assembly)
- سلامتی کونسل (Security council)
- سیکرٹریٹ (Secretariat)
- اقتصادی اور سماجی کونسل (Economic and Social council)
- ٹرسٹی شپ کونسل (Trusteeship Council)
- بین الاقوامی عدالت انصاف (International Court of Justice)

ذیل میں ہر ایک اعضاء کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

1۔جنرل اسمبلی (The General Assembly)

واحد ادارہ جس میں اقوام متحدہ کے تمام اراکین کی نمائندگی ہوتی ہے، جنرل اسمبلی اقوام متحدہ کے چارٹر کے دائرہ کار میں کسی بھی معاملے سے متعلق جان بوجھ کر، نگرانی، مالیاتی اور انتخابی کام انجام دیتی ہے۔تاہم، اس کا بنیادی کردار مسائل پر بحث کرنا اور سفارشات پیش کرنا ہے، حالانکہ اسے اپنی قراردادوں کو نافذ کرنے یا ریاستی کارروائی پر مجبور کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ دیگر افعال میں نئے اراکین کو داخل کرنا شامل ہے۔ اقتصادی اور سماجی کونسل کے اراکین کا انتخاب، سلامتی کونسل کے غیر مستقل اراکین، اور ٹرسٹی شپ کونسل؛ اقوام متحدہ کے دیگر اداروں کی سرگرمیوں کی نگرانی کرتے ہیں، جن سے اسمبلی رپورٹیں حاصل کرتی ہے۔ اور بین الاقوامی عدالت انصاف کے ججوں کے انتخاب اور سیکرٹری جنرل کے انتخاب میں حصہ لینا۔ فیصلے عام طور پر سادہ اکثریت کے ووٹ سے ہوتے ہیں۔ تاہم اہم سوالات پر— جیسے کہ نئے اراکین کا داخلہ، بجٹ کے معاملات، اور امن و سلامتی کے مسائل— دو تہائی اکثریت سے طے کیے جاتے ہیں۔

اسمبلی سالانہ اور خصوصی اجلاس میں بلاتی ہے، ہر سال ریاستوں کے پانچ علاقائی گروپوں میں سے ایک نئے صدر کا انتخاب کرتی ہے۔ ہر باقاعدہ اجلاس کے آغاز میں، اسمبلی ایک عام بحث بھی کرتی ہے، جس میں تمام اراکین شرکت کر سکتے ہیں اور بین الاقوامی تشویش کا کوئی بھی مسئلہ اٹھا سکتے ہیں۔ تاہم، زیادہ تر کام چھ اہم کمیٹیوں کو سونپے جاتے ہیں: (1) تخفیف اسلحہ اور بین الاقوامی سلامتی، (2) اقتصادی اور مالی، (3) سماجی، انسانی اور ثقافتی، (4) خصوصی سیاسی اور عدم نوآبادیت، (5) انتظامی ٔ بجٹ، اور (6) قانونی۔

جنرل اسمبلی نے ان مسائل پر بحث کی ہے جن کو اقوام متحدہ کے دیگر اداروں نے یا تو نظر انداز کیا ہے یا ان سے گریز کیا ہے، بشمول عدم نوآبادیت، نمیبیا کی آزادی، جنوبی افریقہ میں نسل پرستی، دہشت گردی اور ایڈز کی وبا۔ ہر سال اسمبلی کی طرف سے منظور کی جانے والی قراردادوں کی تعداد 350 سے زیادہ ہوگئی ہے اور بہت سی قراردادیں بغیر مخالفت کے منظور کی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود ارکان کے درمیان کئی مسائل پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے، جیسے کہ سرد جنگ، عرب اسرائیل تنازعہ، اور انسانی حقوق۔ جنرل اسمبلی نے بڑے مسائل کی طرف عوام کی توجہ مبذول کرائی ہے، اس طرح رکن حکومتوں کو ان پر پوزیشنیں تیار کرنے پر مجبور کیا گیا ہے، اور اس نے اہم عالمی مسائل سے نمٹنے کے

لیے ایڈہاک باڈیز اور کانفرنسوں کے انعقاد میں مدد کی ہے۔

2۔سلامتی کونسل (The Security Council)

اقوام متحدہ کا چارٹر سلامتی کونسل کو بین الاقوامی امن اور سلامتی کی بحالی کی بنیادی ذمہ داری تفویض کرتا ہے۔ سلامتی کونسل اصل میں 11 ممبران پر مشتمل تھی - پانچ مستقل اور چھ غیر مستقل - جن کا انتخاب جنرل اسمبلی نے دو سال کے لیے کیا تھا۔ شروع سے ہی، سلامتی کونسل کے غیر مستقل ارکان کو مخصوص علاقوں یا ریاستوں کے گروپوں کو نمائندگی دینے کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ رکنیت میں اضافہ ہوا، یہ مشق مشکل میں پڑ گئی۔ 1965 میں اقوام متحدہ کے چارٹر میں ایک ترمیم نے کونسل کی رکنیت کو بڑھا کر 15 کر دیا، جس میں اصل پانچ مستقل اراکین کے علاوہ 10 غیر مستقل اراکین شامل ہیں۔ مستقل ارکان میں سے، عوامی جمہوریہ چین نے 1971 میں جمہوریہ چین (تائیوان) کی جگہ لی، اور روسی فیڈریشن نے 1991 میں سوویت یونین کی جگہ لی۔ جرمنی کے متحد ہونے کے بعد، کونسل کی تشکیل پر دوبارہ بحث چھڑ گئی، اور جرمنی، ہندوستان اور جاپان نے مستقل کونسل کی نشستوں کے لیے درخواست دی۔ غیر مستقل اراکین کا انتخاب منصفانہ علاقائی نمائندگی حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، پانچ اراکین افریقہ یا ایشیا سے، ایک مشرقی یورپ سے، دو لاطینی امریکہ سے، اور دو مغربی یورپ یا دیگر علاقوں سے۔ 10 غیر مستقل ارکان میں سے پانچ ہر سال جنرل اسمبلی کے ذریعے دو سال کی مدت کے لیے منتخب ہوتے ہیں، اور پانچ ہر سال ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ صدارت ہر رکن کے پاس ایک ماہ کی مدت کے لیے ہوتی ہے۔ سلامتی کونسل کا ہر رکن ایک ووٹ کا حقدار ہے۔ تمام "طریقہ کار" معاملات پر - جن کی تعریف بعض اوقات تنازعہ میں ہوتی ہے - کونسل کے فیصلے اس کے کسی بھی نو اراکین کے مثبت ووٹ کے ذریعے کیے جاتے ہیں۔ اصل معاملات، جیسے کہ کسی تنازع کی تحقیقات یا پابندیوں کے اطلاق کے لیے بھی نو اثباتی ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے، جن میں ویٹو پاور رکھنے والے پانچ مستقل ارکان کے ووٹ بھی شامل ہیں۔ عملی طور پر، تاہم، ایک مستقل رکن فیصلے کی درستگی کو متاثر کیے بغیر پرہیز کر سکتا ہے۔ اس بات پر ووٹ کہ آیا کوئی معاملہ طریقہ کار ہے یا اصل ہے بذات خود ایک اہم سوال ہے۔ چونکہ سلامتی کونسل کو مسلسل کام کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے ہر رکن کی نمائندگی ہر وقت نیویارک شہر میں اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں ہوتی ہے۔ کوئی بھی ملک خواہ وہ اقوام متحدہ کا رکن ہی کیوں نہ ہو، کوئی ایسا تنازعہ لا سکتا ہے جس پر وہ فریق ہو سلامتی کونسل کی توجہ دلائے۔ جب کوئی شکایت ہوتی ہے، تو کونسل پہلے پرامن حل کے امکان کو تلاش کرتی ہے۔ بین الاقوامی امن دستوں کو مزید مذاکرات تک متحارب فریقوں کو الگ رکھنے کا اختیار دیا جا سکتا ہے۔

اگر کونسل کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امن کے لیے حقیقی خطرہ ہے، امن کی خلاف ورزی ہے، یا جارحیت کا عمل ہے (جیسا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 39 میں بیان کیا گیا ہے)، وہ اقوام متحدہ کے اراکین سے سفارتی یا اقتصادی پابندیاں لگانے کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اگر یہ طریقے ناکافی ثابت ہوتے ہیں تو، اقوام متحدہ کا چارٹر سلامتی کونسل کو مجرم ملک کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ سرد جنگ کے دوران، امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان مسلسل اختلاف اور سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کے ویٹو پاور نے سلامتی کونسل کو ایک غیر موثر ادارہ بنا دیا۔ تاہم، 1980 کی دہائی کے آخر سے، کونسل کی طاقت اور وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ 1987 اور 2000 کے درمیان اس

نے پچھلے کسی بھی وقت کے مقابلے میں زیادہ امن قائم کرنے کی کارروائیوں کی اجازت دی۔ ویٹو کے استعمال میں ڈرامائی طور پر کمی واقع ہوئی ہے، حالانکہ سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کے درمیان اختلافِ رائے - خاص طور پر 2003 میں عراق کے خلاف فوجی طاقت کے استعمال پر کبھی کبھار کونسل کی تاثیر کو نقصان پہنچایا ہے۔ اتفاق رائے حاصل کرنے کے لیے، کونسل کے مستقل اراکین کے درمیان نسبتاً غیر رسمی ملاقاتیں نجی طور پر کی جاتی ہیں، یہ ایک ایسا عمل ہے جس پر سلامتی کونسل کے غیر مستقل اراکین نے تنقید کی ہے۔ کئی قائمہ اور ایڈہاک کمیٹیوں کے علاوہ، کونسل کے کام کو ملٹری اسٹاف کمیٹی، پابندیوں کے تحت ہر ملک کے لیے پابندیوں کی کمیٹیاں، امن فوج کی کمیٹیاں، اور ایک بین الاقوامی ٹربیونلز کمیٹی فراہم کرتی ہے۔

3۔اقتصادی اور سماجی کونسل (The Economic and Social Council)

بین الاقوامی اقتصادی اور سماجی مسائل پر بحث کے لیے اقوام متحدہ کے مرکزی مقام کے طور پر ڈیزائن کیا گیا، اقتصادی اور سماجی کونسل (ECOSOC) اقوام متحدہ اور اس کی خصوصی ایجنسیوں کی اقتصادی، سماجی، انسانی، اور ثقافتی سرگرمیوں کی ہدایت اور ہم آہنگی کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کے ذریعے قائم کردہ، ECOSOC کو اقتصادی اور سماجی مسائل پر بین الاقوامی کارروائی کی سفارش کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ انسانی حقوق کے عالمی احترام کو فروغ دینا؛ اور صحت، تعلیم اور ثقافتی اور متعلقہ شعبوں میں عالمی تعاون کے لیے کام کرتی ہے۔ ECOSOC مطالعہ کرتا ہے؛ جنرل اسمبلی کی طرف سے غور کے لیے قراردادیں، سفارشات اور کنونشن تیار کرتا ہے؛ اور اقوام متحدہ کے مختلف پروگراموں اور خصوصی ایجنسیوں کی سرگرمیوں کو مربوط کرتا ہے۔ ECOSOC کا زیادہ تر کام انسانی حقوق، منشیات، آبادی، سماجی ترقی، اعداد و شمار، خواتین کی حیثیت، اور سائنس اور ٹیکنالوجی جیسے موضوعات پر فعال کمیشنوں میں انجام دیا جاتا ہے۔ کونسل یورپ، ایشیا اور بحرالکاہل، مغربی ایشیا، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے علاقائی کمیشنوں کی بھی نگرانی کرتی ہے۔

اقوام متحدہ کا چارٹر ECOSOC کو غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کو مشاورتی درجہ دینے کی اجازت دیتا ہے۔ مشاورتی حیثیت کی تین اقسام کو تسلیم کیا گیا ہے: عمومی زمرہ NGOs (سابقہ زمرہ I) میں متعدد اہداف اور سرگرمیاں رکھنے والی تنظیمیں شامل ہیں۔ خصوصی زمرہ کی این جی اوز (سابقہ زمرہ II) ECOSOC سرگرمیوں کے بعض شعبوں میں مہارت رکھتی ہیں۔ اور روسٹر این جی اوز کی اقوام متحدہ کی سرگرمیوں میں کبھی کبھار ہی دلچسپی لیتی ہے۔ مشاورتی حیثیت غیر سرکاری تنظیموں کو ECOSOC اجلاسوں میں شرکت کرنے، رپورٹیں جاری کرنے اور کبھی کبھار میٹنگوں میں گواہی دینے کے قابل بناتی ہے۔ 1990 کی دہائی کے وسط سے، ECOSOC میں، ایڈہاک عالمی کانفرنسوں میں، اور اقوام متحدہ کی دیگر سرگرمیوں میں NGO کی شرکت کے دائرہ کار کو بڑھانے کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں۔ 21ویں صدی کے اوائل تک، ECOSOC نے 2,500 سے زیادہ این جی اوز کو مشاورتی درجہ دے دیا تھا۔

اصل میں یہ ECOSOC 18 ممالک کے نمائندوں پر مشتمل تھا، لیکن چارٹر میں 1965 اور 1974 میں ترمیم کی گئی تاکہ اراکین کی تعداد 54 ہو جائے۔ اراکین کا انتخاب جنرل اسمبلی کے ذریعے تین سال کی مدت کے لیے کیا جاتا ہے۔ سلامتی کونسل کے پانچ

مستقل اراکین میں سے چار - امریکہ، برطانیہ، سوویت یونین (روس) اور فرانس — کو مسلسل دوبارہ منتخب کیا گیا ہے کیونکہ وہ ECOSOC کے زیادہ تر بجٹ کے لیے فنڈ فراہم کرتے ہیں، جو کہ اقوام متحدہ کے کسی بھی ذیلی ادارے میں سب سے بڑا ہے۔ فیصلے سادہ اکثریتی ووٹ سے کیے جاتے ہیں۔

4۔ٹرسٹی شپ کونسل(The Trusteeship Council)

ٹرسٹی شپ کونسل کو اعتماد کے علاقوں کی حکومت کی نگرانی اور انہیں خود حکومت یا آزادی کی طرف لے جانے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ ٹرسٹی شپ کا نظام، جیسا کہ لیگ آف نیشنز کے تحت مینڈیٹ کے نظام کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا کہ جنگ میں شکست خوردہ ممالک سے نوآبادیاتی علاقوں کو فاتح طاقتوں کے ساتھ الحاق نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ مستقبل تک بین الاقوامی نگرانی میں ایک قابل اعتماد ملک کے زیر انتظام ہونا چاہیے۔ مینڈیٹ کے نظام کے برعکس، ٹرسٹی شپ سسٹم نے اعتماد والے علاقوں سے ان کی آزادی پر درخواستیں مدعو کیں اور خطوں میں متواتر بین الاقوامی مشنوں کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ 1945 میں صرف 12 لیگ آف نیشنز کے مینڈیٹ رہ گئے: ناورو، نیو گنی، رwانڈا-ارونڈی، ٹوگولینڈ اور کیمرون (فرانس کے زیرِ انتظام)، ٹوگولینڈ اور کیمرون (برطانوی زیرِ انتظام)، بحرالکاہل کے جزائر (کیرولینز، مارشلز، اور ماریاناس)، مغربی ساموا، جنوبی مغربی افریقہ، تانگانیکا، اور فلسطین۔ یہ تمام مینڈیٹ اعتماد کے علاقے بن گئے سوائے جنوبی مغربی افریقہ (اب نمیبیا) کے، جسے جنوبی افریقہ نے ٹرسٹی شپ کے نظام میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ ٹرسٹی شپ کونسل، جس کا ہر سال ایک بار اجلاس ہوتا ہے، اعتماد کے علاقوں کا انتظام کرنے والی ریاستوں، سلامتی کونسل کے مستقل ممبران جو اعتماد کے علاقوں کا انتظام نہیں کرتے، اور جنرل اسمبلی کے ذریعے منتخب کردہ اقوام متحدہ کے دیگر اراکین پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر رکن کے پاس ایک ووٹ تھا، اور فیصلے موجود افراد کی سادہ اکثریت کے ذریعے کیے جاتے تھے۔ 1994 میں، پالاؤ کی آزادی کے ساتھ، جو آخری باقی ماندہ قابل اعتماد علاقہ ہے، کونسل نے اپنی کارروائیاں ختم کر دیں ۔اب سالانہ اجلاس کی ضرورت نہیں ہے، کونسل اپنے صدر کے فیصلے پر یا اپنے ارکان کی اکثریت کی درخواست پر، جنرل اسمبلی یا سلامتی کونسل کے ذریعے اجلاس کر سکتی ہے۔ 1994 کے بعد سے کونسل کے لیے نئے کردار تجویز کیے گئے ہیں، جن میں عالمی کامنز (مثلاً، سمندری فرش اور بیرونی خلا) کا نظم و نسق اور اقلیتوں اور مقامی لوگوں کے لیے ایک فورم کے طور پر کام کرنا شامل ہے۔

5۔بین الاقوامی عدال برائے انصاف(The International Court of Justice)

بین الاقوامی عدالت انصاف، جسے عام طور پر عالمی عدالت کے نام سے جانا جاتا ہے، اقوام متحدہ کا بنیادی عدالتی ادارہ ہے، حالانکہ عدالت کی ابتدا لیگ آف نیشنز سے پہلے ہے۔ بین الاقوامی تنازعات کی ثالثی کے لیے ایک بین الاقوامی عدالت کے قیام کا خیال 1899 میں دی ہیگ میں منعقدہ ایک بین الاقوامی کانفرنس کے دوران پیدا ہوا۔ یہ ادارہ 1919 میں لیگ آف نیشنز کے تحت بین الاقوامی انصاف کی مستقل عدالت (PCIJ) کے طور پر شامل کیا گیا اور اس نے اسے اپنایا۔ 1945 میں اقوام متحدہ کے قیام کے ساتھ نام۔ عدالت کے فیصلے کا پابند ہے، اور اس کے وسیع دائرہ اختیار میں "وہ تمام مقدمات شامل ہیں جن کا فریقین اس کا حوالہ دیتے ہیں اور تمام معاملات جو خاص طور پر اقوام متحدہ کے

چارٹر میں یا نافذ العمل معاہدوں اور کنونشنز میں فراہم کیے گئے ہیں۔"سب سے اہم بات یہ ہے کہ ریاستیں ان کی رضامندی کے بغیر کسی تنازعہ میں فریق نہیں بن سکتی ہیں، حالانکہ وہ تنازعات کے مخصوص زمروں میں عدالت کے لازمی دائرہ اختیار کو قبول کر سکتی ہیں۔ عدالت جنرل اسمبلی یا سلامتی کونسل کی درخواست پر یا جنرل اسمبلی کے اختیار کردہ دیگر اداروں اور خصوصی ایجنسیوں کی درخواست پر مشاورتی رائے دے سکتی ہے۔ اگرچہ عدالت نے کامیابی کے ساتھ کچھ مقدمات کی ثالثی کی ہے (مثلاً، 1992 میں ہونڈوراس اور ایل سلواڈور کے درمیان سرحدی تنازعہ)، حکومتیں حساس معاملات پیش کرنے سے گریزاں ہیں، اس طرح بین الاقوامی امن اور سلامتی کو لاحق خطرات کو حل کرنے کی عدالت کی صلاحیت کو محدود کر دیا گیا ہے۔ بعض اوقات ممالک نے بھی عدالت کے دائرہ اختیار یا نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر، جب نکاراگوا نے 1984 میں اپنی بندرگاہوں کی کان کنی کے لیے امریکہ کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا تو عدالت نے نکاراگوا کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن امریکہ نے عدالت کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا، سلامتی کونسل میں نکاراگوا کی اپیل کو روک دیا، اور اس سے دستبردار ہو گیا۔ لازمی، یا عام، عدالت کا دائرہ اختیار، جسے اس نے 1946 سے قبول کیا تھا۔ عدالت کے 15 ججوں کا انتخاب جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل آزادانہ ووٹنگ کرتے ہیں۔ کوئی بھی دو جج ایک ہی ریاست کے شہری نہیں ہو سکتے، اور ججوں کو دنیا کے بڑے قانونی نظاموں کے کراس سیکشن کی نمائندگی کرنی ہوتی ہے۔ جج نو سال کی مدت پوری کرتے ہیں اور دوبارہ انتخاب کے اہل ہوتے ہیں۔ عالمی عدالت کی نشست ہیگ میں ہے۔

6۔ سیکرٹریٹ(The Secretariat)

انتونیو گوٹیرس سیکرٹری (موجودہ) جنرل، اقوام متحدہ کا پرنسپل ایڈمنسٹریٹو آفیسر، جنرل اسمبلی کے دو تہائی ووٹوں اور سلامتی کونسل کی سفارش اور اس کے مستقل اراکین کی منظوری سے پانچ سالہ قابل تجدید مدت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ سیکرٹری جنرل عام طور پر چھوٹے، غیر جانبدار ممالک سے آتے ہیں۔ سیکرٹری جنرل تمام میٹنگوں میں چیف ایڈمنسٹریٹو آفیسر کے طور پر کام کرتا ہے اور وہ سکریٹریٹ کی حکم کے مطابق کام کرتا ہے جو وہ اعضاء سیکرٹریٹ کو سونپتے ہیں۔ وہ اقوام متحدہ کے بجٹ کی تیاری کی بھی نگرانی کرتا ہے۔ سکریٹری جنرل کے پاس اہم سیاسی کام ہوتے ہیں، ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی ایسے معاملے کو تنظیم کے سامنے لائے جس سے بین الاقوامی امن اور سلامتی کو خطرہ ہو۔ اقوام متحدہ کے چیف ترجمان اور عالمی امور میں اقوام متحدہ کی سب سے زیادہ نظر آنے والی اور مستند شخصیت، سیکرٹری جنرل اکثر ایک اعلیٰ سطحی مذاکرات کار کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اس عہدے کی اہمیت کی تصدیق کرتے ہوئے، دو سیکرٹری جنرل کو امن کا نوبل انعام دیا گیا ہے: 1961 میں ڈیگ ہمارسک جولڈ اور 2001 میں اقوام متحدہ کے شریک وصول کنندہ کوفی عنان۔ سیکرٹریٹ اقوام متحدہ کے کام کو اقوام متحدہ کے چارٹر میں اشارہ سے کہیں زیادہ حد تک متاثر کرتا ہے۔ یہ ترجمہ کرنے، تشریح کرنے، بڑی تعداد میں ملاقاتوں کے لیے خدمات فراہم کرنے اور دیگر کاموں کے علاوہ متعدد رپورٹس، مطالعات اور تحقیقات کی تیاری کا ذمہ دار ہے۔ چارٹر کے تحت عملے کی بھرتی بنیادی طور پر میرٹ کی بنیاد پر کی جاتی ہے، حالانکہ مختلف جغرافیائی خطوں سے افراد کو بھرتی کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ سیکرٹریٹ کے کچھ ارکان مستقل معاہدوں پر کام کر رہے ہیں، لیکن دیگر اپنی قومی حکومتوں کی طرف سے عارضی تفویض پر کام کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں انہیں

اقوام متحدہ سے وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا ہے اور انہیں رکن حکومتوں سے ہدایات حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ سیکرٹریٹ کے اثر و رسوخ کو اس حقیقت سے منسوب کیا جا سکتا ہے کہ اس کے عملے میں تقریباً 9,000 افراد رکن ممالک کے سیاسی تقرر کے بجائے مستقل ماہرین اور بین الاقوامی سرکاری ملازمین ہیں۔ سیکرٹریٹ نیویارک، جنیوا، ویانا، نیروبی (کینیا) اور دیگر مقامات پر مقیم ہے۔ ناقص انتظامی طریقوں کے لیے اس پر کثرت سے تنقید کی جاتی رہی ہے — حالانکہ اس نے اپنے کاموں کی کارکردگی کو بڑھانے کے لیے غیر جانبداری کے ساتھ مسلسل کوششیں کی ہیں۔

14.5 ذیلی اعضاء (The Subsidiary Organs)

اقوام متحدہ کے نیٹ ورک میں جنرل اسمبلی اور خود مختار خصوصی ایجنسیوں کے ذریعہ بنائے گئے ذیلی ادارے بھی شامل ہیں۔ ذیلی ادارے جنرل اسمبلی یا ECOSOC یا دونوں کو رپورٹ کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اعضاء کو براہ راست اقوام متحدہ کی طرف سے مالی اعانت فراہم کی جاتی ہے۔ دوسروں کو حکومتوں یا نجی شہریوں کے رضاکارانہ تعاون سے مالی اعانت فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ، ECOSOC کے اقتصادی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی، صحت اور متعلقہ شعبوں میں کام کرنے والی این جی اوز کے ساتھ مشاورتی تعلقات ہیں۔ این جی اوز نے اقوام متحدہ کی خصوصی ایجنسیوں کے کام میں، خاص طور پر صحت، قیام امن، پناہ گزینوں کے مسائل، اور انسانی حقوق کے شعبوں میں تیزی سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ خصوصی ایجنسیاں سالانہ ECOSOC کو رپورٹ کرتی ہیں اور اکثر ایک دوسرے کے ساتھ اور اقوام متحدہ کے مختلف اداروں کے ساتھ تعاون کرتی ہیں۔ تاہم، ان کے اپنے اصول، اہداف اور قواعد بھی ہیں، جو بعض اوقات اقوام متحدہ کے دیگر اداروں اور ایجنسیوں سے متصادم ہو سکتے ہیں۔ خصوصی ایجنسیاں خود مختار ہیں کیونکہ وہ اپنے بجٹ کو خود کنٹرول کرتی ہیں اور ان کے اپنے بورڈ آف ڈائریکٹرز ہیں، جو جنرل اسمبلی یا سیکرٹری جنرل سے آزادانہ طور پر ایجنسی کے سربراہوں کا تقرر کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی اہم خصوصی ایجنسیوں اور متعلقہ اداروں میں انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (ILO)، اقوام متحدہ کی خوراک اور زراعت کی تنظیم (FAO)، اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم (UNESCO)، اور عالمی ادارہ صحت (World Health Organization) شامل ہیں۔ ڈبلیو ایچ او). دو سب سے طاقتور خصوصی ایجنسیاں ہیں، جو اقوام متحدہ کے فیصلہ سازی کے حوالے سے بھی سب سے زیادہ خود مختار ہیں، وہ ورلڈ بینک اور انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (IMF) ہیں۔ اقوام متحدہ، اپنی مخصوص ایجنسیوں کے ساتھ، اکثر اجتماعی طور پر اقوام متحدہ کے نظام کے طور پر کام کرتا ہے۔

14.6 انتظامیہ (Administration)

مالیات سیکرٹری جنرل کو اس کی منظوری کے لیے دو سالہ بجٹ جنرل اسمبلی میں پیش کرنا چاہیے۔ چارٹر میں کہا گیا ہے کہ تنظیم کے اخراجات جنرل اسمبلی کی طرف سے تقسیم کیے گئے ممبران برداشت کریں گے۔ شراکتوں کی کمیٹی ہر ریاست کی عمومی اقتصادی سطح اور صلاحیت کی بنیاد پر تمام اراکین کے لیے تشخیص کا پیمانہ تیار کرتی ہے، جسے منظوری کے لیے جنرل اسمبلی میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ریاست ہائے

متحدہ امریکہ سب سے بڑا تعاون کرنے والا ملک ہے، حالانکہ اس کے تعاون کا تناسب مسلسل کم ہوتا جارہا ہے، اقوام متحدہ کے قیام کے وقت سے وہ پانچویں حصے سے 1975 میں ایک چوتھائی اور 2000 میں تقریباً ایک پانچواں حصہ رہ گیا ہے۔ دیگر اراکین فی کس زیادہ حصہ ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر سان مارینو کا فی کس حصہ ریاستہائے متحدہ کے مقابلے میں تقریباً چار گنا ہے۔ امریکی تعاون 1990 کی دہائی کے دوران ایک متنازعہ مسئلہ بن گیا، جب ملک نے اپنی ذمہ داریوں کو مکمل طور پر ادا کرنے سے انکار کر دیا اور فنڈز کی اس سطح پر اعتراض کیا جو اسے فراہم کرنے کی ضرورت تھی۔ 1999 میں امریکی کانگریس نے اقوام متحدہ میں اصلاحات کا ایک بل منظور کیا، اور شدید گفت و شنید کے بعد اقوام متحدہ کے اراکین نے بجٹ میں امریکی حصہ کو کم کرنے اور کمی کو پورا کرنے کے لیے دیگر ریاستوں سے تعاون بڑھانے پر اتفاق کیا۔ جب خصوصی پروگراموں، خصوصی ایجنسیوں، اور امن کی کارروائیوں کی لاگت کو باقاعدہ بجٹ میں شامل کیا جاتا ہے، تو اقوام متحدہ کے نظام کی کل سالانہ لاگت میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ (خصوصی پروگراموں کی مالی اعانت اقوام متحدہ کے اراکین کے رضاکارانہ تعاون سے کی جاتی ہے، اور خصوصی ایجنسیوں اور امن کی کارروائیوں کا اپنا بجٹ ہوتا ہے۔) اس کی ایک وجہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اقوام متحدہ سے امن قائم کرنے اور دیگر امداد کے لیے اپیلوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہے۔ اور جزوی طور پر بعض رکن ممالک کی جانب سے تنظیم کو بروقت ادائیگیاں کرنے میں ناکامی کی وجہ سے، اقوام متحدہ کو مسلسل اور شدید مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔

مراعات اور استثنیٰ

اقوام متحدہ کے استحقاق اور استثنیٰ سے متعلق ایک جنرل کنونشن، جسے فروری 1946 میں جنرل اسمبلی نے منظور کیا اور اکثر اراکین نے اسے قبول کیا، اس بات پر زور دیتا ہے کہ اقوام متحدہ قانونی شخصیت کا مالک ہے۔ کنونشن میں جائیداد اور اقوام متحدہ کے اہلکاروں کے قانونی عمل سے استثنیٰ جیسے معاملات بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ اقوام متحدہ اور ریاستہائے متحدہ کے درمیان جون 1947 میں دستخط کیے گئے ایک معاہدے میں نیویارک شہر میں اقوام متحدہ کے صدر دفتر کے مراعات اور استثنیٰ کی وضاحت کی گئی ہے۔

ہیڈ کوارٹر (Headquarter)

جنرل اسمبلی نے لندن میں اپنے پہلے اجلاس کے دوسرے حصے کے دوران نیویارک میں اپنا مستقل ہیڈ کوارٹر تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ جان ڈی راکفیلر، جونیئر نے مین ہٹن میں عمارت کی جگہ کے لیے زمین عطیہ کی۔ عارضی ہیڈ کوارٹر نیویارک کے لانگ آئی لینڈ پر لیک پر قائم کیا گیا تھا۔ مستقل سیکرٹریٹ کی عمارت 1951-52 میں مکمل ہوئی اور اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ جنرل اسمبلی اور کونسلوں کے لیے رہائش فراہم کرنے والی عمارت 1952 میں مکمل ہوئی اور اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ 1947 میں اپنایا گیا اقوام متحدہ کا جھنڈا، تنظیم کے سرکاری نشان پر مشتمل ہے (ایک سرکلر دنیا کا نقشہ، جیسا کہ قطب شمالی سے دیکھا گیا ہے، جس کے چاروں طرف زیتون کی شاخوں کی چادریں ہیں) ہلکے نیلے رنگ کے پس منظر پر مرکوز ہے۔ اسمبلی نے 24 اکتوبر کو اقوام متحدہ کے دن کے طور پر نامزد کیا ہے۔

14.7 اقوام متحدہ کی کامیابیاں (Achievements of the UNO)

بین الاقوامی امن اور سلامتی کی بحالی اقوام متحدہ کا بنیادی کام ہے۔ چارٹر کا باب 6 سلامتی کونسل کی مداخلت کے ذریعے، گفت وشنید، ثالثی، ثالثی اور عدالتی فیصلوں کے ذریعے تنازعات کے بحرالکاہل حل کے لیے فراہم کرتا ہے۔ سلامتی کونسل کسی بھی تنازعہ یا صورت حال کی تحقیقات کر سکتی ہے تاکہ یہ تعین کیا جا سکے کہ آیا اس سے بین الاقوامی امن اور سلامتی کو خطرہ لاحق ہے۔ تنازعہ کے کسی بھی مرحلے پر، کونسل مناسب طریقہ کار یا ایڈجسٹمنٹ کے طریقوں کی سفارش کر سکتی ہے، اور، اگر فریقین پرامن طریقے سے تنازعہ کو حل کرنے میں ناکام رہتے ہیں، تو کونسل تصفیہ کی شرائط تجویز کر سکتی ہے۔ اجتماعی سلامتی کا ہدف، جس کے تحت ایک رکن کے خلاف جارحیت کو سب کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، چارٹر کے باب 7 کے تحت ہے، جو سلامتی کونسل کو جبر کے اقدامات کا حکم دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ سفارتی، اقتصادی اور فوجی پابندیوں سے لے کر مسلح قوت — ایسے معاملات میں جہاں پرامن تصفیہ کی کوششیں ناکام ہو گئی ہوں۔ اس طرح کے اقدامات سرد جنگ کے دوران شاذ و نادر ہی لاگو ہوتے تھے، تاہم، کیونکہ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان کشیدگی نے سلامتی کونسل کو جارحیت پر اکسانے والوں پر اتفاق کرنے سے روک دیا۔ اس کے بجائے، امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے کیے گئے اقدامات نے اکثر احتیاطی سفارت کاری اور امن قائم کرنے کی شکل اختیار کی۔ سرد جنگ کے بعد کے دور میں، اقوام متحدہ سے امن کی بحالی اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں کی اپیلوں میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا، اور بین الاقوامی امن و سلامتی کو نئے خطرات کا سامنا کرنا پڑا، بشمول ایڈز اور بین الاقوامی دہشت گردی۔ سلامتی کونسل کے بنیادی کردار کے باوجود، اقوام متحدہ کا چارٹر سلامتی کے امور میں جنرل اسمبلی اور غیر رکن ریاستوں کی شرکت کا بندوبست کرتا ہے۔ کوئی بھی ریاست، خواہ وہ اقوام متحدہ کی رکن ہو یا نہ ہو، کوئی بھی تنازعہ یا صورت حال جو بین الاقوامی امن اور سلامتی کو خطرے میں ڈالتی ہو، سلامتی کونسل یا جنرل اسمبلی کی توجہ میں لا سکتی ہے۔ چارٹر جنرل اسمبلی کو اختیار دیتا ہے کہ وہ "بین الاقوامی امن اور سلامتی کی بحالی سے متعلق کسی بھی سوال پر بحث کرے" اور "ایسے کسی بھی سوال کے بارے میں ریاست یا متعلقہ ریاستوں یا سلامتی کونسل یا دونوں کو سفارشات پیش کرے۔" یہ اختیار اس شق کے ذریعہ محدود ہے کہ، "جب کہ سلامتی کونسل کسی تنازعہ یا صورت حال کے سلسلے میں موجودہ چارٹر میں تفویض کردہ کاموں کو انجام دے رہی ہے، جنرل اسمبلی اس تنازعہ یا صورت حال کے حوالے سے کوئی سفارش نہیں کرے گی جب تک کہ سلامتی کونسل سے درخواست نہ کی گئی ہو۔

نومبر 1950 کی "یونائٹنگ فار پیس" قرارداد کے ذریعے، تاہم، جنرل اسمبلی نے اپنے آپ کو امن کو لاحق خطرات سے نمٹنے کا اختیار دیا ہے اگر سلامتی کونسل مستقل رکن کے ویٹو کے بعد عمل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اگرچہ یہ دفعات جنرل اسمبلی کو ایک وسیع ثانوی کردار فراہم کرتی ہیں، لیکن سلامتی کونسل ایسے فیصلے کر سکتی ہے جو تمام اراکین کو پابند کرتی ہیں، جبکہ جنرل اسمبلی صرف سفارشات کر سکتی ہے۔ امن قائم کرنے کے لیے بین الاقوامی مسلح افواج کو پہلی بار 1948 میں کشمیر اور فلسطین میں جنگ بندی کے لیے استعمال کیا گیا۔ اگرچہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں خاص طور پر اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، فوجوں کے انخلا اور مذاکرات کے زیر التواء متحارب فریقوں کے درمیان بفر کے طور پر اس طرح کی قوتوں کا استعمال کر سکتے ہیں؟ جسے امن قائم کرنے کے نام سے جانا جاتا ہے-1956 میں مصر، اسرائیل، فرانس اور اقوام متحدہ

کے درمیان سوئز بحران کے دوران رسمی شکل دی گئی تھی۔ بادشاہی امن مشن نے بہت سی شکلیں اختیار کی ہیں، حالانکہ ان میں یہ حقیقت مشترک ہے کہ ان میں کئی ممالک کے فوجی دستے شامل ہیں، اور یہ فوجی اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اختیار کے تحت کام کرتے ہیں۔ 1988 میں اقوام متحدہ کی امن فوج کو امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ سرد جنگ کے دوران، نام نہاد فرسٹ جنریشن، یا "کلاسیکی"، امن کی حفاظت مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے تنازعات اور ایشیا میں نوآبادیات سے پیدا ہونے والے تنازعات میں استعمال ہوتی تھی۔ 1948 اور 1988 کے درمیان اقوام متحدہ نے سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کے علاوہ غیر جانبدار ممالک سے عام طور پر ہلکے ہتھیاروں سے لیس فوجیوں پر مشتمل 13 امن مشن شروع کیے اکثر کینیڈا، سویڈن، ناروے، فن لینڈ، انڈیا، آئرلینڈ اور اٹلی۔

ان مشنز میں موجود فوجیوں کو، نام نہاد "بلیو ہیلمٹ" کو صرف اپنے دفاع میں طاقت کا استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ مشن کو تنازعہ کے فریقین کی رضامندی اور سلامتی کونسل اور فوجی تعاون کرنے والے ممالک کی حمایت دی گئی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی قیام امن کے چیلنجز مزید پیچیدہ ہوگئے۔ ان حالات کا جواب دینے کے لیے جن میں اندرونی نظم و نسق ٹوٹ چکا تھا اور شہری آبادی متاثر ہو رہی تھی، متعدد سیاسی اور سماجی مقاصد کے حصول کے لیے "دوسری نسل" کی امن فوج قائم کی گئی تھی۔ پہلی نسل کی امن فوج کے برعکس، دوسری نسل کی امن فوج میں اکثر سویلین ماہرین اور امدادی ماہرین کے ساتھ ساتھ فوجی بھی شامل ہوتے ہیں۔ دوسری نسل اور پہلی نسل کے امن کے درمیان ایک اور فرق وہ سپاہی ہے۔

14.8 درپیش چیلنجز (The Challenges Ahead)

18 ستمبر 2017 کو اقوام متحدہ کی 72 ویں جنرل اسمبلی میں، 120 ممالک نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوٹیرس کی تجویز کردہ اصلاحات کے لیے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ 1946 سے، اقوام متحدہ نے مکمل یا جزوی طور پر متعدد اصلاحات کی ہیں۔ 'اصلاح' کی اصطلاح اقوام متحدہ کے رکن ممالک کے لیے اس کی وضاحت کے فقدان اور اتفاق رائے کی کمی کی وجہ سے پریشان کن ثابت ہوئی ہے۔ عملدرآمد. یہ خاص طور پر 2018 میں امریکہ (امریکہ) کی طرف سے عالمی نظم و نسق کی ضرورت، اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے فیصلوں کی اہمیت جیسے شکوک و شبہات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایران جوہری معاہدہ، اور اقوام متحدہ کی کارکردگی۔ یہ بریفنگ بتاتی ہے کہ موجودہ اصلاحات کس طرح پچھلی اصلاحات سے مختلف ہیں، جتنا کہ یہ نظم و نسق پر توجہ مرکوز کرتی ہے اور احتساب اور شفافیت کے فقدان، غیر موثریت، اور موجودہ نظام میں تنظیم اور اس کے رکن ممالک کے درمیان اعتماد میں کمی کی تنقیدوں کو دور کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کا اصلاحاتی ایجنڈا تین اہم شعبوں پر مرکوز ہے: ترقی، انتظام، اور امن و سلامتی۔ سب سے پہلے، ترقیاتی اصلاحات 2030 ایجنڈا برائے پائیدار ترقی کے اہداف کو حاصل کرنے کے لیے اقوام متحدہ کے ترقیاتی نظام میں ایک جرات مندانہ تبدیلی لائے گی۔ یہ اقوام متحدہ کے ملکی ماہرین کی ایک آزاد ٹیم ('ریذیڈنٹ کوآرڈینیٹرز') کی قیادت میں ملکی ٹیموں کی ایک نئی نسل کی تشکیل پر مرکوز ہوگی۔ دوسرا، عمل کو آسان بنانا، شفافیت میں اضافہ اور مینڈیٹ کی بہتر ترسیل سیکرٹریٹ کے لیے ایک نئے انتظامی نمونے کی بنیاد بنے گی۔ تیسرا، تنازعات کی روک تھام اور قیام امن کو ترجیح دے کر، مؤثریت

میں اضافہ اور امن و سلامتی کی اصلاحات پر زور دیا جائے گا۔ امن کی کارروائیوں اور سیاسی مشنوں کی ہم آہنگی اس کے آغاز کے دو سال بعد، اصلاحات کا عمل ثمر آور ہونا شروع ہوا، جس کا نفاذ 2019 میں شروع ہونے والا ہے اور اسے ہموار کرنے، جوابدہی، شفافیت اور کارکردگی پر توجہ دی جائے گی۔ تاہم، اصلاحاتی عمل میں انسانی حقوق کو تقویت دینے کا واضح ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بریفنگ موجودہ اصلاحات سے فائدہ اٹھانے کے امکانات کو بھی تلاش کرتی ہے تاکہ انسانی حقوق کی عدم تقسیم کو فروغ دیا جا سکے، جبکہ اقوام متحدہ کی جاری اصلاحات پر اسٹیک ہولڈرز کے رد عمل کا جائزہ لیا جائے۔

14.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم نے

- اقوام متحدہ کے اصل اور اس کے اصوُل اور مقاصد کو سمجھا۔
- اقوام متحدہ کے ڈھانچہ سے بھی روبرو ہوئے۔
- اقوام متحدہ کے ذیلی اعضاء اور اس کے انتظامیہ سے واقف ہوئے۔
- اقوام متحدہ کے افعال اور اس کا ہیڈ کواٹر سے متعلق معلومات بھی حاصل کی۔

14.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

سلامتی کونسل : اس میں پانچ مستقل اور دس غیر مستقل اراکین ممالک ہوتے ہیں جو عالمی سطح پر امن قائم کرنے کے لئے پابند ہے۔

سین فرانسیسکو کانفرنس : بین الاقوامی تنظیم پر اقوام متحدہ کی کانفرنس (UNCIO) جسے عام طور پر سان فرانسسکو کانفرنس کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کا چارٹر : اقوام متحدہ اور اس کے رکن ممالک کو بین الاقوامی امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے، بین الاقوامی قانون کو برقرار رکھنے، اعلیٰ معیار زندگی حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے۔

14.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

14.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اقوام متحدہ کا ادارہ کب قائم ہوا؟
2. اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں کتنے مستقل ممبران ہیں؟
3. اقوام متحدہ کے کس ادارے میں تمام ممبران کی نمائندگی ہوتی ہے؟
4. Uniting for Peace قرارداد کب کیا گیا؟

5. اقوام متحدہ کا بنیادی عدالتی ادارہ ہے؟
6. کیا ہندوستان سلامتی کونسل کا مستقل ممبر ہے؟
7. سلامتی کونسل میں کل کتنے ممبران ہوتے ہیں؟
8. بین الاقوامی عدال برائے انصاف کا ھیڈ کوارٹر کہاں ہے؟
9. ٹرسٹی شپ کونسل کب قائم کی گئی؟
10. لیگ آف نیشنز کب وجود میں آیا؟

14.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اقوام متحدہ کیا ہے اور اس کے قیام عمل کی ضرورت کیوں پڑی؟
2. اقوام متحدہ کے اصتلاحات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. اقوام متحدہ کے اصول اور مقاصد کو بتایئے۔
4. اقوام متحدہ کے ذیلی اعضاء پر روشنی ڈالیئے۔
5. اقوام متحدہ کے انتظامیہ پر ایک مختصر نوٹ لکھئے۔

14.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اقوام متحدہ کے افعال کو بیان کیجئے۔
2. سلامتی کونسل پر ایک مضمون لکھیے۔
3. اقوام متحدہ کے اہم اعضاء پر مختصر روشنی ڈالیئے۔

14.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Baylis, John, Steve Smith and Patricia Owens, *The Globalisation of World Politics*, Oxford, 2011.
2. Goldstein, Joshua S., and Jon C. Pevehouse, *International Relations*, Pearson, 2016, (11th Edition).
3. Lowe, Norman., *Mastering the Modern World History*, Palgrave, Macmillan, 1982.
4. Mansbach, Richard W. and Kirsten L. Rafferty, *Introduction to Global Politics*, Routledge, 2011 (2nd Edition).
5. Nye, Joseph S., *Understanding International Conflicts*, Longman, 2007, (6th Edition).
6. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
7. Shimko, Keith L., *International Relations*, Houghton Mifflin Company, 2012, (4th Edition).

اکائی 15– ترقی پسند عوامی تحریک

(Progressive Popular Movements)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 امریکہ میں بڑی ہلچل کا دور

15.3 ترقی پسند عوامی تحریق

15.4 خواتین کا حقِ رائے دہی اور 19 ویں ترمیم

15.5 ترقی پسند عوامی تحریق کے اسباب

15.6 ترقی پسند عوامی تحریق کے نتائج

15.7 ترقی پسند عوامی تحریق کے عوامل

15.8 اکتسابی نتائج

15.9 کلیدی الفاظ

15.10 نمونہ امتحانی سوالات

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید (Introduction)

ترقی عوامی پسند تحریک ایک سیاسی اور سماجی اصلاحی تحریک تھی جو 19 ویں صدی کے اواخر اور 20 ویں صدی کے اوائل میں امریکہ میں بڑی تبدیلیوں کا سبب بنی۔ اس دوران تحریک کے مقاصد میں قومی حکومت کو مضبوط کرنا اور لوگوں کے معاشی، سماجی اور سیاسی مطالبات کو حل کرنا شامل تھا۔ ترقی پسند کارکنوں نے امریکی معاشرے کے ایسے عناصر کا مشاہدہ کیا جن کی وہ اصلاح کرنا چاہتے تھے، خاص طور پر اشرافیہ

کے درمیان دولت کے انتہائی ارتکاز اور بڑے کاروباری گھرانوں کی بے پناہ معاشی اور سیاسی طاقت کو ختم کرنا۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- امریکہ میں بڑی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا مطالعہ کریں گے۔
- امریکی آئین میں اہم ترامیم کا مطالعہ کریں گے۔
- ترقی پسند عوامی تحریک کو سمجھیں گے۔
- خواتین کا حق رائے دہی اور 19ویں ترمیم کی جانکاری حاصل کریں گے۔
- ترقی پسند عوامی تحریک کے اسباب کو سمجھیں گے۔
- ترقی پسند عوامی تحریک کے نتائج سے روبرو ہوں گے۔
- ترقی پسند عوامی تحریک کے عوامل کا مطالعہ کریں گے۔

15.2 امریکہ میں بڑی ہلچل کا دور (Time of Major Upheavals in America)

1865 سے 1917 تک ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1. تعمیر نو کے دور (Reconstruction Era)
2. دورِ مُلمّع (Gilded Age)
3. ترقی پسند دور (Progressive Era)

1865 سے 1917 تک امریکہ میں صنعت کاری کا عروج ہوا جس کی وجہ سے وہاں دوسرے ممالک سے آئے ہوئے مہاجرین کی تعداد میں عظیم اضافی ہوا۔ یہ شمالی امریکہ اور مغربی امریکہ میں تیز رفتار اقتصادی ترقی اور بڑھتی ہوئی خوشحالی کا دور تھا۔ امریکہ دنیا کی غالب اقتصادی، صنعتی اور زرعی طاقت بن گیا تھا۔ 1865 سے 1900 تک غیر زرعی مزدوروں کی اوسط سالانہ آمدنی میں 75 فیصد اضافہ ہوا، اور پھر 1918 تک مزید 33 فیصد اضافہ ہوا۔

1۔ تعمیر نو کا دور (Reconstruction Era)

تعمیر نو کا دور 1863 سے 1877 تک کا دور تھا۔ اس دور میں وفاقی حکومت نے عارضی طور پر متحدہ ریاستوں (confederacy) کی جنوبی ریاستوں کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ اپریل 1865 میں اپنے قتل سے پہلے، صدر ابراہم لنکن نے تعمیر نو کے معتدل منصوبوں کا اعلان کیا تھا تاکہ سابق متحدہ ریاستوں کو جلد از جلد دوبارہ امریکہ کی وفاقی حکومت میں ضم کیا جاسکے۔ لنکن نے مارچ 1865 میں فریڈ مینز بیورو (Freedman’s Bureau) قائم کیا، تاکہ سابق غلاموں کو تعلیم، صحت کی دیکھ بھال اور روزگار کی

تلاش میں مدد فراہم کی جا سکے۔ غلامی کا حتمی خاتمہ امریکی دستور کی تیرھویں ترمیم کے ذریعے کیا گیا، جس کی دسمبر 1865 میں توثیق ہوئی۔ تاہم، لنکن کو ان کی اپنی پارٹی کے ریڈیکل ریپبلکنز نے اس کی مخالفت کی جنہیں خدشہ تھا کہ سابق متحدہ ریاستیں کبھی بھی حقیقی طور پر غلامی اور کنفیڈریٹ قوم پرستی (confederate nationalism) سے دستبردار نہیں ہوں گی، اور ہمیشہ مخفی طور پر بحال کرنے کی کوشش کریں گی۔ نتیجے کے طور پر، بنیاد پرست ریپبلکنز نے قانونی پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی جو زیادہ تر سابق باغیوں کے ووٹ ڈالنے اور منتخب عہدہ رکھنے کے حقوق کو چھین لینے پر مرکوز تھیں۔ بنیاد پرستوں کی مخالفت لنکن کے نائب صدر اور جانشین اینڈریو جانسن نے کی۔ اینڈریو جانسن ٹینیسی ڈیموکریٹ تھے۔ تاہم، بنیاد پرستوں نے 1866 کے اہم انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی نے انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ کانگریس میں اس طرح کی قانون سازی سے متعلق صدر جانسن کے ویٹو کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے امریکی مقننہ کے نچلے ایوان 'ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو' میں صدر جانسن کا کامیابی سے مواخذہ (impeachment) کیا، اور انہیں 1868 میں سینیٹ کے عہدے سے تقریباً ہٹا دیا۔

تعمیر نو کا دور ریاستہائے متحدہ کی تاریخ اور جنوبی ریاستہائے متحدہ کی تاریخ کا ایک ایسا دور تھا جو امریکی خانہ جنگی کے بعد آیا اور غلامی کے خاتمے اور گیارہ سابقہ متحدہ ریاستوں کے امریکہ میں دوبارہ انضمام کے قانونی، سماجی اور سیاسی چیلنجوں کا غلبہ تھا۔ اس دوران نئے آزاد کیے گئے غلاموں کو امریکہ میں شہریت اور مساوی شہری حقوق دینے کے لیے ریاستہائے متحدہ کے آئین میں تین ترامیم کی گئیں۔ ان قانونی کامیابیوں کو روکنے کے لیے، سابق کنفیڈریٹ ریاستوں نے پول ٹیکس اور خواندگی کے ٹیسٹ نافذ کیے اور وہ سیاہ فام لوگوں کو ڈرانے اور کنٹرول کرنے اور انہیں ووٹ دینے سے روکنے یا ان کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے دہشت گردی میں ملوث رہے۔

ان ترامیم کو تعمیر نو کی ترامیم، یا خانہ جنگی کی ترامیم کہا گیا اور یہ ریاستہائے متحدہ کے آئین کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں ترامیم ہیں جو 1865 اور 1870 کے درمیان اختیار کیے گئی تھیں۔ یہ ترامیم خانہ جنگی کے بعد کی گئی جنوبی امریکہ کی تعمیر نو مہم کے نفاذ کا ایک حصہ تھیں۔

تیرھویں ترمیم (Thirteenth Amendment)

تیرھویں ترمیم 1864 میں تجویز کی گئی تھی اور 1865 میں اس کی توثیق کی گئی۔ اس ترمیم نے غلامی اور غیر ارادی غلامی کا خاتمہ کیا، سوائے ان لوگوں کے جو کسی جرم کے لیے سزا یافتہ ہوں۔ اسے امریکی سینیٹ نے 8 اپریل 1864 کو منظور کیا تھا۔ لنکن انتظامیہ کی طرف سے ایک ناکام ووٹ اور وسیع قانون سازی کے بعد، ایوان نے 31 جنوری 1865 کو اس کی پیش رفت کی۔ اس کی توثیق 6 دسمبر 1865 کو تمام ریاستوں نے کی سوائے ڈیلاویئر، نیو جرسی اور کینٹکی۔

چودھویں ترمیم (Fourteenth Amendment)

چودھویں ترمیم نے تمام افراد کے لیے شہریت کے حقوق اور قوانین کے مساوی تحفظ کو یقینی بنایا۔ ریاستہائے متحدہ کے آئین میں چودھویں ترمیم 13 جون 1866 کو کانگریس کی طرف سے تجویز کی گئی تھی۔ 9 جولائی 1868 تک، اسے سرکاری طور پر چودھویں ترمیم

بننے کے لیے مطلوبہ تعداد میں ریاستوں کی مقننہ سے منظوری مل چکی تھی۔ 20 جولائی 1868 کو سیکرٹری آف اسٹیٹ ولیم سیوارڈ (William Seward) نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس ترمیم کو منظوری دے دی گئی ہے اور اسے وفاقی آئین میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس ترمیم میں شہریت کے حقوق اور قوانین کے مساوی تحفظ کی بات کی گئی ہے اور یہ ترمیم جنگ کے بعد آزاد ہونے والوں کے ساتھ سلوک سے متعلق مسائل کے جواب میں تجویز کی گئی تھی۔ ترمیم کی سخت مخالفت کی گئی تھی، خاص طور پر جنوبی ریاستوں کی طرف سے اسے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ چودھویں ترمیم آئین کے سب سے زیادہ زیر بحث حصوں میں سے ایک ہے۔

پندرہویں ترمیم (Fifteenth Amendment)

پندرہویں ترمیم 1869 میں تجویز کی گئی تھی اور 1870 میں اس کو منظوری ملی۔ یہ نسل، رنگ، یا غلامی کی سابقہ شرط کی بنیاد پر شہریوں کے ووٹنگ کے حقوق میں امتیازی سلوک کو روکتی ہے۔ ریاستہائے متحدہ کے آئین میں پندرہویں ترمیم وفاقی اور ریاستی حکومتوں کو اس شہری کی نسل، رنگ، یا غلامی کی سابقہ شرط کی بنیاد پر کسی شہری کو ووٹ دینے کے حق سے انکار کرنے سے منع کرتی ہے۔ اس کی توثیق 3 فروری 1870 کو تعمیر نو کی تیسری اور آخری ترمیم کے طور پر کی گئی۔

2۔ دورِ ملمّع (Gilded Age)

ریاستہائے متحدہ کی تاریخ میں دورِ ملمع کو تقریباً 1870 کی دہائی کے آخر سے لے کر 1890 کی دہائی کے آخر تک کے دور کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، جو تعمیر نو کے دور اور ترقی پسند دور کے درمیان واقع ہوا۔ اس کا نام 1920 کی دہائی کے مورخین نے 1873 میں لکھے گئے مارک ٹوین (Mark Twain) کے ایک ناول کے نام پر رکھا تھا۔ مورخین نے 19 ویں صدی کے آخر میں معاشی توسیع کو مادیت پسندانہ زیادتیوں کے وقت کے طور پر دیکھا جس کی وجہ بڑے پیمانے پر سیاسی بدعنوانی تھی۔

یہ امریکہ میں تیز رفتار اقتصادی ترقی کا وقت تھا، خاص طور پر شمالی اور مغربی ریاستہائے متحدہ میں۔ اس دوران امریکہ میں خاص طور پر ہنر مند کارکنوں کی اجرتوں میں یورپ کی نسبت بہت زیادہ اضافہ ہوا اور صنعت کاری نے تیزی سے ہنر مند لیبر فورس کا مطالبہ کیا۔ لہذا، اس عرصے میں امریکہ میں لاکھوں یورپی تارکین وطن کی آمد دیکھی گئی۔ صنعت کاری کی تیز رفتار توسیع نے 1860 سے 1890 تک حقیقی اجرت میں 40 فیصد اضافہ کیا۔ 1880 میں فی صنعتی کارکن جن میں مرد، خواتین اور بچے شامل ہیں اوسطاً سالانہ اجرت 380 ڈالر سے بڑھ کر 1890 میں 584 ڈالر ہو گئی۔ یہ 59 فیصد کا اضافہ تھا۔ دورِ ملمع بھی غربت کا دور تھا اور یہ بڑھتی ہوئی عدم مساوات کا بھی دور تھا، کیونکہ لاکھوں تارکین وطن امریکہ میں داخل ہوئے، اور دولت کا بے لگام ارتکاز زیادہ نمایاں اور متنازعہ ہو گیا۔ دورِ ملمع کی اصطلاح کا اطلاق 1920 کی دہائی کے مورخین نے اس دور پر کیا جنھوں نے اس اصطلاح کو مارک ٹوین کے ایک غیر معروف ناول، The Gilded Age سے لیا۔ اس ناول میں خانہ جنگی کے بعد کے وعدے کے 'سنہری دور' یا 'دورِ ملمع' پر طنز کیا گیا، جس کو سنگین سماجی مسائل کے دور میں معاشی توسیع کو مصنوعی آرائش کے طور پر ظاہر کیا گیا تھا۔ 1920 اور 1930 کی دہائیوں میں، استعارہ Gilded Age کا اطلاق امریکی تاریخ میں ایک

مقررہ مدت پر ہونا شروع ہوا۔ اس اصطلاح کو ادبی اور ثقافتی نقادوں کے ساتھ ساتھ متعدد مورخین نے بھی بطور تنقید استعمال۔ ان کے مطابق یہ اصطلاح مادیت پسند زیادتیوں اور بڑے پیمانے پر سیاسی بدعنوانی کے وقت کے لیے ایک توہین آمیز اصطلاح تھی۔

1870 اور 1900 کے درمیان امریکی آبادی تقریباً دوگنی ہوگئی۔ امریکہ میں مہاجرین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور شہر کاری نے چھوٹے پیمانے پر مینوفیکچرنگ اور تجارت کو بڑے پیمانے پر کارخانے کی پیداوار اور بہت بڑی قومی کارپوریشنوں میں تبدیل کرنے میں مدد کی۔

Immigrants registering themselves for jobs in America. (Image: US Congress Library)

1870 کی دہائی میں، ریاستہائے متحدہ میں ضرورت سے زیادہ مادیت اور سیاسی بدعنوانی کا دور شروع ہوا۔ دورِ ملمع کے نام سے مشہور اس دور میں ایک چھوٹی اشرافیہ کے پاس بے پناہ دولت کا ارتکاز ہوا۔ صنعتی سرگرمیاں اور کارپوریٹ ترقی میں بے حد اضافہ ہوا۔ 1863 سے 1899 تک مینوفیکچرنگ کی پیداوار میں 800 فیصد سے زیادہ کا اضافہ ہوا لیکن منافع زیادہ تر Robber Barons کہلانے والے کاروباری افراد کی ایک چھوٹی سی تعداد کو گیا جنہوں نے اجارہ داریاں قائم کیں اور اپنی دولت میں بے حد اضافہ کیا جب کہ اسی وقت بہت سے مزدور غربت میں رہتے تھے اور ان کے پاس اقتصادی قوت کا فقدان تھا۔

اس طرح، 1870 کی دہائی کے دوران امریکی تاریخ میں دورِ ملمع مجموعی مادیت اور صریح سیاسی بدعنوانی کا دور تھا جس نے سماجی اور سیاسی تنقید کے اہم ناولوں کو جنم دیا۔ اس دور کا نام ان میں سے سب سے قدیم، دی گلڈڈ ایج (1873) سے لیا جاتا ہے، جسے مارک ٹوین نے

چارلس ڈڈلی وارنر کے ساتھ مل کر لکھا تھا۔اس ناول میں واشنگٹن کی واضح اور درست وضاحت کی گئی ہے،اوراس میں لالچی صنعت کاروں اور بدعنوان سیاستدانوں سمیت اس وقت کی بہت سی سرکردہ شخصیات کے خاکے بنائے گئے ہیں۔

3۔ترقی پسند دور (Progressive Era)

ترقی پسند دور امریکہ میں تبدیلیوں اور ہلچل کا تیسرا دور تھا۔اسی دور میں ترقی پسند عوامی تحریک واقع ہوئی۔ترقی پسند عوامی تحریک کے بارے میں آپ اس اکائی کے آئندہ حصے میں پڑھیں گے۔

15.3 ترقی پسند عوامی تحریک (Progressive Popular Movement)

ترقی پسند عوامی تحریک ایک سیاسی اور سماجی اصلاحی تحریک تھی جس نے 19ویں صدی کے اواخر اور 20ویں صدی کے اوائل میں امریکہ میں بڑی تبدیلیاں پیدا کی تھیں۔اس دوران، تحریک کے مقاصد میں قومی حکومت کو مضبوط کرنااور لوگوں کے معاشی، سماجی اور سیاسی مطالبات کو حل کرنا شامل تھا۔ترقی پسند کارکنوں نے امریکی معاشرے کے ایسے عناصر کو دیکھا جن کی وہ اصلاح کرنا چاہتے تھے، خاص طور پر اشرافیہ کے پاس دولت کے انتہائی ارتکاز اور بڑے کاروباری گھرانوں کی بے پناہ معاشی اور سیاسی طاقت کو ختم کرنا۔

صنعتی سرگرمیوں اور کارپوریٹ ترقی کے زبردست اضافے والے دور کو Gilded Age کانام دیا گیا۔اس سے مراداس دور سے تھی جس میں بے شک معاشی اور کاروباری ترقی ہوئی لیکن امریکہ کے مزدور طبقے کواس کے فوائد منتقل نہ ہو سکے اور عوام غربت کے شکار ہوگئے۔اس دور کی ناکامی اور خامیوں کا حل ترقی پسند عوامی تحریک کے ذریعہ تلاش کیا گیا۔Gilded Age کا فائدہ حاصل کرنے والے کاروباری گھرانے اسٹیل، پٹرولیم اور نقل وحمل کی صنعتوں میں اپنی اجارہ داریوں کے ذریعے امیر ہوئے۔ان میں جان راکفیلر (John Rockfeller)، اینڈریو کارنیگی(Andrew Carnegie)، کارنیلیس وینڈربلٹ (Cornelius Vanderbilt)، لیلینڈ سٹینفورڈ (Leland Stanford)اور جے پی مورگن(J.P. Morgan)سب سے زیادہ مشہور تھے۔

مارک ٹوئن کے طنزیہ ناولThe Gilded Age کے بعد 1880 میں ایک سیاسی ناول 'ڈیموکریسی' شائع کیا گیا جسے تاریخ دان ہنری ایڈمز نے گمنام طور پر شائع کیا۔ایڈمز کی کتاب ایک بے ایمان وسطی مغربی سینیٹر سے متعلق ہے اور یہ بتاتی ہے کہ بدعنوانی کا اصل ذریعہ بے ضابطہ اور لاقانونیت والے مغرب کے غیر اصولی رویوں میں مضمر ہے۔

دورِ ملمع کے سیاسی ناول امریکی ادب میں ایک نئے تناؤ کے آغاز کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ ناول سماجی احتجاج کی ایک ذریعہ کے طور پر، ایک ایسا رجحان پیش کرتے ہیں جو 19ویں صدی کے آخر اور 20ویں صدی کے اوائل میں مک ریکروں کی سرگرمیوں کے ساتھ پروان چڑھا اور جس نے عوامی ناول نگاروں کو جنم دیا۔

ترقی پسند دور کے رہنماؤں نے بہت سے دیگر مسائل پر کام کیا جس میں کام کے اوقات کی مدت، بشمول مزدوروں کے حقوق،

خواتین کا حق رائے دہی، معاشی اصلاحات، ماحولیاتی تحفظات، اور غریب تارکین وطن سمیت غریبوں کی بہبود جیسے مسائل شامل تھے۔

کام گار یونینیں بہتر معاشی اور کام کے حالات کے لیے دباؤ ڈالتی رہیں۔ اس وقت نمایاں مسائل دن میں صرف آٹھ گھنٹے کام کا مطالبہ، بچوں کی مزدوری پر پابندی، زیادہ اجرت، اور کام کی جگہ کی حفاظت کے حالات تھے۔

مزدور اکثر انتہائی خراب حالات میں کام کرتے تھے۔ وہ دن بھر میں انتہائی لمبی مدت تک کام کرتے تھے، بہت کم تنخواہ حاصل کرتے تھے، اور انہیں حفاظت کے چند ضوابط کے ساتھ فیکٹریوں میں محنت کرنی پڑتی تھی۔ 25 مارچ 1911 کو نیویارک میں کپڑے کی ایک فیکٹری میں آگ بھڑک اٹھی۔ یہ فیکٹری بھیڑ سے بھری اور غیر محفوظ عمارت میں تھی۔ اس عمارت کے دروازوں کو پہلے سے ہی بند رکھا جاتا تھا تاکہ چوری سے بچا جا سکے۔ جب عمارت میں آگ لگی تو 146 کارکنان، جن میں زیادہ تر نوجوان تارکین وطن خواتین تھیں، آگ کی لپیٹ میں آ گئیں یا آگ سے بچنے کی کوشش میں عمارت سے باہر کود گئے اور موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس سانحے پر بہت ہنگامہ ہوا۔ اس سانحہ کو Triangle Shirtwaist Factory Fire کہا جاتا ہے۔ اس سانحہ کے بعد نیویارک میں فیکٹری تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل کی گئی۔ کمیشن کی تحقیق کے نتیجے میں 30 سے زیادہ صحت اور حفاظت کے قوانین منظور ہوئے جن میں فائر کوڈز اور چائلڈ لیبر کی پابندیاں شامل ہیں۔

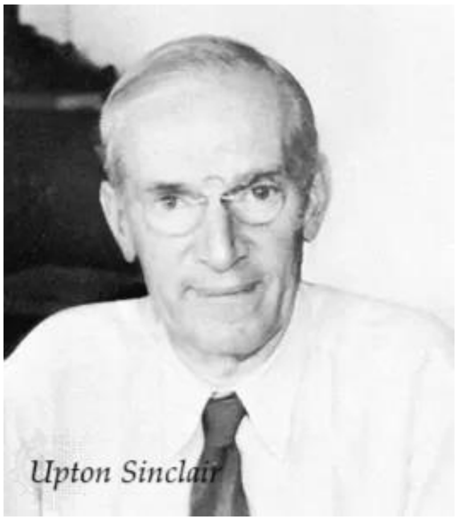

ترقی پسند عوامی تحریک میں صحافی اپٹن سنکلیئر (Upton Sinclair) کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا تعلق تفتیشی رپورٹرز کے اس طبقے سے تھا جسے مَک ریکر کہتے ہیں، کیونکہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ معاشرے میں چھپی ہوئی برائیوں کو فاش کرتے تھے۔ سنکلیئر نے شکاگو، الینوائے کے گوشت کے ذبح خانوں اور پیکیجنگ پلانٹس میں مزدوری کے حالات کی چھان بین کرنے میں وقت گزارا اور اپنی تفتیش کے نتائج کو اپنے ناول 'دی جنگل' کی شکل دی۔ انہوں نے عوام کی توجہ ان خراب حالات کی طرف کی جن سے مزدوروں کو دوچار ہونا پڑا، لیکن لوگ فوڈ پروسیسنگ کے عمل میں استعمال ہونے والے خراب اور غیر صحت مندانہ طریقوں کی وضاحتوں سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس ناول پر عوامی جذبات اور امریکی صدر تھیوڈور روزویلٹ کے رد عمل کی وجہ سے 1906 میں کھانے کی فیکٹریوں کے لیے ضابطے منظور ہوئے، جن میں Meat Inspection Act اور Pure Food and Drug Act شامل ہیں۔

جب امریکہ میں شہر کاری ہوئی تو اس نے دیگر مسائل کو جنم دیا۔ بڑھتی ہوئی شہر کاری کا مطلب آبادی کی کثافت میں زبردست اضافہ ہونا۔ شہری مراکز میں جلد ہی بہت سے محلے بھیڑ بھرے، خطرناک، غیر صحت بخش مکانات سے بھر گئے۔ فوٹو جرنلسٹ جیکب رائس (Jacob Riis) نے نیویارک شہر کے غریب محلوں میں دیکھے گئے مصائب کی طاقتور تصاویر کھینچی اور انہیں اپنی 1890 کی کتاب How the Other Half Lives میں شائع کیا۔ لوگ تصویریں دیکھ کر حیران اور متاثر ہوئے اور ایسی قانون سازی اور امداد کا

مطالبہ کیا جو غریب ترین امریکیوں کی مدد کرے۔ ترقی پسند رہنما جیسا کہ جین ایڈمز نے محلوں کے اندر حالات کو بہتر بنانے، تارکین وطن اور دیگر حقوق سے محروم گروہوں کو ضروری خدمات تک رسائی میں مدد کرنے کے لیے کام کیا۔

معاشی مصلحین دورِ ملمع کی زیادتیوں اور عدم مساوات کو روکنا چاہتے تھے۔ عوامی جذبات اجارہ داریوں کے خلاف تھے، اور قانون سازوں نے بڑے پیمانے پر کارپوریشنوں کو منظم کرنے کے لیے کام کیا جو معاشی اور سیاسی طاقت کے مالک تھے۔ ریل روڈ اور اسٹیل کی صنعتوں میں اجارہ داریوں کے جواب میں، Sherman Antitrust Act کو 1890 میں منظور کیا گیا۔ اس ایکٹ نے اجارہ داریوں اور ٹرسٹوں کو توڑنے اور روکنے میں مدد کی۔ 1902 کے شروع میں Ida Tarbell نے مضامین کا ایک سلسلہ لکھا، جو بعد میں The History of the Standard Oil Company (1904) کے نام سے شائع ہوا، جس میں سب سے بڑے ٹرسٹ، Standard Oil Company میں بدعنوانی کو بے نقاب کیا۔

15.4 خواتین کا حق رائے دہی اور 19 ویں ترمیم (Women's Suffrage and 19th Amendment)

امریکہ میں خواتین کا حقِ رائے دہی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ ترقی پسند دور میں خواتین کے حق رائے دہی کی مہم بہت سے لوگوں کی ترجیح بن گئی۔ متعدد کارکنوں نے خواتین کے حق رائے دہی کی حمایت میں مارچ کیا اور منظم آئینی ترمیم کی حمایت کا اعلان کیا جو خواتین کو ووٹ کا حق دے سکے۔ Susan B. Anthony، Elizabeth Stanton، اور Carrie Catt نے تحریک کی قیادت کرنے میں مدد کی۔ 1920 میں کانگریس نے انیسویں ترمیم منظور کی، جس میں ان تمام خواتین کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا جو امریکی شہری تھیں۔

Activists of the Women's Suffrage Movement
(Image Courtesy: Library of US Congress)

1912 کے صدارتی انتخابات میں وسکونسن کے گورنر رابرٹ فولیٹ ریپبلکن نامزدگی جیتنے میں ناکام رہے۔ سابق صدر تھیوڈور روزویلٹ نے 1909 میں وائٹ ہاؤس چھوڑ دیا تھا لیکن اب وہ مزید ایک بار صدارت حاصل کرنے کی امید کر رہے تھے۔ اس کے بجائے، ریپبلکن نے فیصلہ کیا کہ موجودہ صدر ولیم ٹافٹ کو عام انتخابات میں ان کی نمائندگی کرنی چاہیے۔ Follette نے 1911 میں نیشنل ریپبلکن پروگریسو لیگ بنائی تھی، اور لیگ 1912 میں پروگریسو پارٹی بن گئی۔ پارٹی کو بل موس پارٹی (Bull Moose Party) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ریپبلکن نامزدگی کے لیے روزویلٹ کی کوشش ناکام ہونے کے بعد، پروگریسو پارٹی نے انہیں اپنا صدارتی امیدوار منتخب کیا۔ بل موس پارٹی کا مشہور عرفی نام طاقت اور جوش کی خصوصیات سے اخذ کیا گیا تھا جو اکثر روزویلٹ اپنے آپ کو بیان کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ روزویلٹ کے بل موس کے ٹکٹ اور نائب صدارتی امیدوار ہیرام ڈبلیو جانسن (Hiram W. Johnson) نے ریپبلکن ووٹ کو تقسیم کر دیا، جس کے نتیجے میں ووڈرو ولسن (Woodrow Wilson) کی قیادت میں ڈیموکریٹس کی جیت ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم میں امریکہ کے شامل ہونے پر ترقی پسند تحریک ٹوٹ گئی۔ تاہم، ترقی پسند عوامی تحریک کے دوران قائم ہونے والی بہت سی تنظیمیں، جیسے لیبر یونینز اور پیشہ ورانہ اور شہری گروپ، امریکی معاشرے میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔

15.5 ترقی پسند عوامی تحریک کے اسباب (Causes of Progressive Popular Movement)

ترقی پسند عوامی تحریک کے بڑے اسباب یہ تھے:

- 19ویں صدی کے آخر میں امریکی آبادی میں اضافہ ہوا، اور یہ آبادی 1870 اور 1900 کے درمیان تقریباً دوگنا ہو گئی۔
- 19ویں صدی کے آخر میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دوسرے ممالک سے تارکین وطن کی آمد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور لوگوں کی شہری مراکز کی طرف نقل و حرکت بھی ہوئی۔
- شہر کاری کی وجہ سے چھوٹے پیمانے پر ہونے والی مینوفیکچرنگ بعد میں بڑے پیمانے کی فیکٹری پروڈکشن میں تبدیل ہو گئی۔
- شہروں اور صنعتوں کی ترقی نے نئے مسائل متعارف کرائے، جیسے بگڑتی ہوئی معاشی عدم مساوات، کام کے خطرناک حالات، اور غریب، بھیڑ بھرے حالات زندگی۔
- ایک چھوٹی اشرافیہ کے پاس دولت کا بہت زیادہ ارتکاز ہوا اور ان کے پاس بہت زیادہ معاشی اور سیاسی طاقت تھی، جب مزدور اور دیگر طبقات غربت کا شکار تھے۔
- اس وقت، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں حکومت لامرکزیتی طرز پر زیادہ کام کرتی تھی۔ یہ حکومتی مشینری قومی سطح کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام تھی۔

15.6 ترقی پسند عوامی تحریک کے نتائج (Results of Progressive Popular Movement)

ترقی پسند عوامی تحریک کے نتائج درج ذیل ہیں:

ترقی پسند عوامی تحریک نے ایک اصلاحی روایت کا آغاز کیا جو تب سے امریکی معاشرے میں موجود ہے۔

وفاقی قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے اجارہ داریاں ٹوٹ گئیں۔

کئی مزدور یونین، تجارتی گروپ، اور پیشہ ورانہ، شہری اور مذہبی انجمنیں قائم کی گئیں۔ ان انجمنوں نے عوام کی زندگیوں کو بہتر بنایا۔

ایسے قوانین اور ضوابط بنے جو خوراک کی حفاظت کے تقاضے، چائلڈ لیبر قوانین، اور آٹھ گھنٹے کام کے اوقات کا سبب بنے۔

15.7 ترقی پسند عوامی تحریک کے پیچھے عوامل

(Factors behind Progressive Popular Movement)

ترقی پسند عوامی تحریک کے اہم عوامل درج ذیل ہیں:

راست جمہوریت (Popular Democracy)

جارجزم (Georgism)

تفتیشی صحافت (Muckraking)

جدید کاری (Modernisation)

فلاح کاری (Philanthropy)

مڈل کلاس اقدار (Middle-class Values)

1۔ راست جمہوریت (Popular Democracy)

نیو جرسی کے مزدور کارکن جیمز ڈبلیو سلیوان نے 1888 میں سوئٹزرلینڈ کا دورہ کیا اور ایک تفصیلی کتاب لکھی جو اس نظریے کو آگے بڑھانے والے اصلاح کاروں کے لیے ایک نمونہ بن گئی۔ اس کتاب کا نام تھا: Direct Legislation by the Citizenship through Initiative and Referendum, 1893۔ Initiative اور Referendum ایک طرح کے جمہورین آلات ہیں جو راست جمہوریت میں قانون کی منظوری یا انتخاب میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ Initiative اور Referendum کو استعمال کرنے سے محنت کش طبقے کو سیاسی طاقت ملے گی اور ہڑتالوں کی ضرورت میں کمی آئے گی۔ سلیوان کی کتاب مزدور کارکنوں، سوشلسٹوں اور پاپولسٹوں میں بہت مقبول ہوئی۔

2۔ جارجزم (Georgism)

جارجزم کا تصور ہینری جارج سے تعلق رکھتا ہے۔ ہنری جارج کی پہلی کتاب جس کا عنوان تھا Progress and Poverty

کی کئی ملین کاپیاں فروخت ہوئیں، جو 1800 کی دہائی کے آخر میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں سے ایک بن گئی۔ اس نے ترقی پسند دور اور دنیا بھر میں سماجی اصلاحات کی تحریک کو ایک نظریے کے گرد ابھارنے میں مدد کی جسے اب جارجزم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جیکب رائس (Jacob Riis) اس اشاعت کی تاریخ کی وجہ سے واضح طور پر ترقی پسند دور کے آغاز کو 1879 کے طور پر نشان زد کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے ہی ترقی پسند عوامی تحریک کی شروعات ہوئی۔

3۔ تفتیشی صحافت (Muckraking)

مَک ریکنگ کا تعلق تحقیقاتی صحافت کے ذریعے بدعنوانی کو بے نقاب کرنے سے ہے۔ امریکہ میں 1900 میں رسالوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور کچھ رسالوں کے صارفین کی تعداد لاکھوں میں پہنچ گئی۔ ذرائع ابلاغ کے دور کے آغاز میں، قومی اشتہارات کے تیزی سے پھیلاؤ کی وجہ سے مقبول میگزینوں کے سرورق کی قیمت تیزی سے تقریباً 10 سینٹ تک گر گئی، جس سے ان کے استعمال میں مالی رکاوٹ کم ہو گئی۔ میگزین کی گردش میں ڈرامائی طور پر اضافے کا ایک اور عنصر سیاست، مقامی حکومت اور بڑے کاروبار میں بدعنوانی کی نمایاں کوریج تھا، خاص طور پر صحافیوں اور مصنفین کی طرف سے جو مَک ریکر کے نام سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے سماجی اور سیاسی بدعنوانیوں اور کوتاہیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے مشہور رسالوں کے لیے لکھنا شروع کیا اور ان میں اپنے کالم شائع کیے۔ اپنی تحقیقاتی صحافت پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ تحقیقی صحافی سماجی برائیوں اور کارپوریٹ اور سیاسی بدعنوانی کو بے نقاب کرنے کا کام کرتے تھے۔ فضول خرچی، بدعنوانی اور سکینڈل کو بے نقاب کرنے میں مہارت حاصل کرنے والے صحافی ریاستی اور مقامی سطح پر کام کرتے تھے۔ دوسرے صحافی جیسے لنکن سٹیفنز (Lincoln Steffens) نے بہت سے بڑے شہروں میں سیاسی بدعنوانی کو بے نقاب کیا۔ روزویلٹ نے ان صحافیوں کو ان کا عرفی نام دیا تھا۔

4۔ جدید کاری (Modernisation)

ترقی پسند عوامی تحریک کے حامی جدیدیت کے شوقین تھے، جن کا عقیدہ معاشرے کی خامیوں کو دور کرنے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے کردار میں تھا۔ وہ معاشرے میں فضول خرچ کے خلاف تھے اور تعلیم کو اس سے بچنے کا ذریعہ مانتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ تعلیم کے ذریعہ ہی روشن مستقبل قائم کیا جا سکتا ہے۔ ترقی پسندی کی خصوصیات میں شہری صنعتی معاشرے کے لیے سازگار رویہ، ماحول اور زندگی کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے بنی نوع انسان کی صلاحیت پر یقین، اقتصادی اور سماجی معاملات میں مداخلت کی ذمہ داری پر یقین، ماہرین کی اہلیت اور کارکردگی میں یقین شامل ہیں۔ فریڈرک ونسلو ٹیلر کا نام اس دور کے عظیم مفکرین میں آتا ہے جنہوں نے سائنسی انتظامیہ کے تصور کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ایسے متعدد طریقوں کو واضح کیا جن سے صنعتوں میں کام کاج کو آسان بنایا گیا۔

5۔فلاح کاری (Philanthropy)

امریکہ میں امیر خاندانوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا، یہ تعداد 1870 کی دہائی میں تقریباً 100 کروڑ پتیوں سے 1892 میں 4,000 اور 1916 میں 16,000 تک پہنچ گئی۔ان امیر خاندانوں مین بہت سے لوگوں نے اینڈریو کارنیگی کی کتاب 'دی گو سپل آف ویلتھ' کے اس موقف کی تائد کی جس میں کہا گیا تھا کہ ان کا معاشرے کے لیے بھی ایک فرض ہے کہ وہ کالجوں، ہسپتال، طبّی تحقیق، لائبریریاں، عجائب گھر، مذہب اور سماجی بہتری کے دیگر ادروں کی مالی مدد کریں۔

6۔مڈل کلاس اقدار (Middle Class Values)

متوسط طبقہ یعنی مڈل کلاس ترقی پسند دور کا نمایاں گروپ تھا۔ متوسط طبقہ اس زمانے میں ہونے والی زیادہ تر سوچ اور اصلاح کے پیچھے محرک بن گیا۔اس وقت کے اعلیٰ طبقے اور اشرافیہ کے لیے بڑھتی ہوئی ناراضگی کے ساتھ، متوسط طبقے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اعلیٰ طبقے کے انفرادی فلسفے کو مسترد کرتے ہیں۔ متوسط طبقے کے لوگ اس بات کے خواہش مند تھے کہ معاشرے کے مختلف طبقات جیسے اعلیٰ طبقے، محنت کش طبقے، کسانوں اور مزدوروں کے درمیان ربط قائم ہو۔اس جانب جیمز ایڈمز نے لفظ association کا اختراع کیا۔ان کا یہ قدم انفرادیت پسندی کے برعکس تھا اور معاشرے میں بین طبقاتی تعلقات کی شروعات تھا۔مزید برآں، متوسط طبقہ، خاص طور پر خواتین، وکٹورین دور سے پہلے کی گھریلو اقدار سے دور ہونا شروع ہو گئیں۔ طلاق کی شرح میں اضافہ ہوا کیونکہ خواتین نے تعلیم اور گھر سے آزادی حاصل کرنے کو ترجیح دی۔

15.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عزیز طلبا، اس اکائی میں آپ نے ترقی پسند عوامی تحریک اور اس سے قبل تعمیر نو کے دور اور دورِ مُلمّع کا مطالعہ کیا۔آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی بھی ملک میں عوامی تحریکیں ہی بڑی تبدیلیوں کا سبب بنتی ہیں۔امریکہ میں یہ تبدیلیاں 19ویں صدی کے آخر میں رونما ہوئیں اور 20ویں صدی کے اوائل تک اپنی تکمیل کو پہنچی۔ترقی پسند عوامی تحریک نے شہر کاری کے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے عوام اور انتظامیہ کو تیار کیا۔سماج کے متوسط طبقے اور خواتین کے حقوق کے لیے مختلف ضوابط اور قانون بنائے گئے۔عزیز طلبا، آپ نے اس اکائی میں پڑھا کہ ترقی پسند عوامی تحریک کو کامیاب بنانے میں صحافیوں اور ان کی تصانیف کا بہت بڑا رول تھا۔ان کی تصانیف نے ہی عوام کو مختلف مسائل سے متعارف کرایا۔درحقیقت ان کے ناولوں اثر کتابوں نے امریکی انتظامیہ اور قانون سازوں اس بات کے لیے مجبور کیا کہ وہ عوامی فلاح کو دھیان میں رکھتے ہوئے آئین میں موثر تبدیلیاں کریں۔عوامی پسند تحریک کا دور ایک دلچسپ دور ہے اور اس دور کے وقانون اور ضوابط آج بھی امریکی سیاست کو متاثر کرتے ہیں۔

15.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

ترقی پسند عوامی تحریک

تفتیشی صحافت یا مک ریکنگ

جار جزم

فریڈرک وِنسلو ٹیلر

سائنسی انتظامیہ

دورِ مُلمّع

تعمیرِ نو کا دور

امریکی آئین کی 13ویں ترمیم

امریکی آئین کی 14ویں ترمیم

امریکی آئین کی 14ویں ترمیم

امریکی آئین کی 19ویں ترمیم

امریکی خانہ جنگی کا دور

15.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. امریکہ میں خانہ جنگی کب ہوئی؟
2. امریکہ میں تعمیر نو کا دور کب واقع ہوا؟
3. امریکہ میں دور مُلمّع کو Gilded Age کا نام کیوں دیا گیا؟
4. The Gilded Age ناول کا مصنف کون تھا؟
5. ترقی پسند عوامی تحریک کے کسی ایک تفتیشی صحافی کا نام لکھیے۔
6. Sherman Antitrust Act کب منظور کیا گیا؟
7. امریکہ میں خواتین کو حق رائے دہی کس ترمیم کے تحت فراہم کیا؟
8. فریڈرک ٹیلر نے کس انتظامی تصور کو پیش کیا؟
9. جار جزم کیا ہے؟

10. مَک ریکنگ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

15.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ترقی پسند عوامی تحریک کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟
2. ترقی پسند عوامی تحریک کے عوامل کو بیان کیجیے۔
3. ترقی پسند عوامی تحریک اسباب پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. ترقی پسند عوامی تحریک کس طرح خواتین کے حقِ رائے دہی کا سبب بنی؟
5. جار جزم پر ایک نوٹ لکھیے۔

15.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ترقی پسند عوامی تحریک پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. ترقی پسند عوامی تحریک کے عوامل اور نتائج کو بیان کیجیے۔
3. امریکی آئین کی 13 ویں، 14 ویں، 15 ویں اور 19 ویں ترامیم کی وضاحت کیجیے۔

15.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Drehle David von, *Triangle: The Fire that Changed America*, 2002.
2. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
3. Hofstadter, Richard, *The Age of Reform*, 1955.
4. McGerr, Michael E., *A Fierce Discontent: The Rise and Fall of the Progressive Movement in America, 1870–1920*, 2003.
5. Morris, Edmund, *The Rise of Theodore Roosevelt*, 1979.
6. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
7. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
8. Rothbard Murray N., *The Progressive Era*, 2017.
9. Taylor, Frederick Winslow, The Principles of Scientific Management, 1911.
10. Wilson, Woodrow, *The Study of Administration*, 1887.

اکائی 16۔ سوویت یونین کا انہدام اور سرد جنگ کا خاتمہ
(Collapse of the Soviet Union and the End of Cold War)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید
16.1 مقاصد
16.2 پس منظر
16.3 سوویت یونین کا انتشار
16.3.1 اقتصادی اسباب
16.3.2 سیاسی اسباب
16.3.3 گورباچوف کا کردار
16.3.4 سماجی اسباب
16.4 سرد جنگ کا خاتمہ
16.4.1 روس کی اقتصادی حالات اور گورباچوف کی اصلاحات
16.4.2 مشرقی یورپ میں جمہوری تحریکیں اور تبدیلی کے مطالبات
16.4.3 امریکی پالیسی اور رونالڈ ریگن کی قیادت
16.5 سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کے انتشار کے اثرات
16.6 اکتسابی نتائج
16.7 کلیدی الفاظ
16.8 نمونہ امتحانی سوالات
16.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید (Introduction)

سوویت یونین کا انہدام اور سرد جنگ کا خاتمہ 20ویں صدی کی اہم پیش رفت تھیں۔ سوویت یونین 1991 میں ٹوٹ گیا اور جس کے ساتھ سرد جنگ کا بھی خاتمہ ہوا. سرد جنگ کا خاتمہ اور سوویت یونین کی تحلیل 1991 میں ہوئی۔ سرد جنگ، جو تقریباً 1947 سے 1991 تک جاری رہی، بنیادی طور پر ریاست ہائے متحدہ (The US) اور سوویت یونین (The USSR) کے درمیان سیاسی اور فوجی تنازعہ تھا۔ یہ جنگ بنیادی طور پر ان کے درمیان نظریات کے تصادم پر مبنی تھی، یعنی سرمایہ داری اور سوشلزم۔ اس عرصے کے دوران دونوں ممالک نے اپنے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مختلف ممالک میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کی کوشش کی اور یہ کشیدگی بعض اوقات ایٹمی جنگ کے خطرے تک پہنچ گئی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے اہم واقعات میں میخائل گورباچوف کا اقتدار میں آنا، جو سوویت یونین کے آخری صدر بنے، اور ان کے اصلاحاتی اقدامات جیسے کہ "پیریسٹروکا" (معاشی اور سیاسی اصلاحات) اور "گلاسناسٹ" (غیر مجرمانہ پالیسیاں) کا نفاذ شامل ہیں۔۔ اس کے نتیجے میں، سوویت یونین کی اندرونی پوزیشن کمزور ہوئی اور ملک کے مختلف حصوں میں آزادی کے مطالبات بڑھ گئے۔ 1991 میں سوویت یونین تحلیل ہو گیا اور 15 آزاد جمہوریہ قائم ہوئے جن میں روس، یوکرین، بیلاروس اور دیگر ممالک شامل تھے۔ اس تحلیل کے ساتھ ہی سرد جنگ کا باقاعدہ خاتمہ ہوا اور امریکہ دنیا کی صف اول کی سپر پاور بن کر ابھرا۔ سوویت یونین کا انہدام عالمی سیاست میں ایک اہم موڑ تھا اور اس نے دنیا کے جغرافیائی سیاسی منظر نامے کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سرد جنگ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے اور یہ بتا سکیں گے کہ کیا حقیقت میں سرد جنگ کا اختتام ہو چکا ہے۔
- سوویت یونین کے انتشار کو سمجھ سکیں گے۔
- انتشار کے اہم اسباب کو جان پائیں گے مثلاً سیاسی، معاشی اور سیاسی۔
- گورباچوف کی پالیسیاں اس انتشار میں کیا کردار ادا کی، اس کی بھی معلومات حاصل کر سکیں گے۔

16.2 پس منظر (The Historical Context)

دوسری جنگ عظیم کے بعد دو سپر پاور یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت سوشلسٹ جمہوریہ ابھرے۔ یہ دونوں طاقتیں دوسری جنگ عظیم میں ایک ساتھ لڑیں لیکن جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی ان کے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی جو 1991ء تک جاری رہی۔ اس دور کو عالمی تاریخ میں سرد جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ سوویت یونین کی تحلیل کے بعد سرد جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن کیا یہ سچ ہے؟ اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سب سے پہلے ہم سرد جنگ کو مختصراً سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ جنگ نہیں بلکہ جنگ جیسی صورتحال ہے۔ اس میں گولہ باری نہیں ہوتی بلکہ دشمنی عروج پر رہتی ہے اور دشمن کو نیچا دکھانے، تباہ کرنے اور بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ سرد جنگ

(1947-1991) ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین کے درمیان سیاسی، اقتصادی اور فوجی تناؤ کا دور تھا۔ یہ جنگ جسمانی تصادم کے بجائے نظریات پر مبنی تھی۔ امریکہ نے جمہوریت اور سرمایہ داری کو فروغ دیا جبکہ سوویت یونین نے 8اشتراکی کو فروغ دیا۔ دونوں ممالک کے درمیان اس مقابلے نے یورپ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک کو متاثر کیا۔ دونوں طاقتوں نے ایک دوسرے کے خلاف تنازعات کو بڑھایا، جیسے کوریا کی جنگ (1950-53) اور ویتنام کی جنگ (1955-75)، لیکن براہ راست لڑائی نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک نے بڑے پیمانے پر جوہری ہتھیاروں کے تجربات بھی کیے اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ہتھیار بھی جمع کیے ہیں۔ سرد جنگ 1991 میں سوویت یونین کے ٹوٹنے اور آزاد ممالک کی تشکیل کے ساتھ ختم ہوئی جس کے بعد امریکہ دنیا کی صف اول کی سپر پاور بن کر ابھرا۔ سب سے پہلے ہم سوویت یونین کے انتشار پر بات کرتے ہیں، اس کے بعد سرد جنگ کے خاتمے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

16.3 سوویت یونین کا انتشار (Collapse of the Soviet Union)

سوویت یونین کا قیام جتنا غیر متوقع اور حیران کن تھا (دیکھیں یونٹ نمبر 5)، اس کا ٹوٹنا اس سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔ 1917 کے آغاز تک ایسا ممکن نہیں لگتا تھا کہ روس جیسے بہت بڑے پسماندہ اور مظلوم ملک میں دو انقلاب برپا ہو سکتے ہیں، ایک سرمایہ دارانہ اور دوسرا اشتراکی۔ اسی طرح 1988 تک یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ سوویت یونین جس کا حریف طاقتور امریکہ ہو، جس ملک کے عوام نے انقلاب کا ثمر چکھ لیا تھا، اندرونی دھماکے سے منہدم ہو جائے گا۔ آپ نے یونٹ پانچ میں سوویت انقلاب کے بارے میں پڑھا ہے۔ آئیے ہم روس کے دوسرے، یعنی سوویت یونین کے ٹوٹنے سے متعلق حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوویت یونین باضابطہ طور پر 26 دسمبر 1991 کو تحلیل ہو گیا۔ سوویت یونین کا تحلیل ایک پیچیدہ اور کثیر الجہتی واقعہ تھا، جو 1980 کی دہائی کے آخر سے لے کر 1991 میں اس کے باضابطہ اختتام تک جاری رہا۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے امکانات اس کے ظہور کے حالات میں پوشیدہ تھے۔ مارکس اور اینگلز کی طرف سے پیش کردہ اشتراکی انقلاب صرف امریکہ، انگلستان، فرانس اور جرمنی جیسے ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں رونما ہونا چاہیے تھا، جہاں سماج کی ترقی کے سرمایہ دارانہ کام مکمل ہو چکے تھے اور ترقی یافتہ سرمایہ داری کے بطن سے ایک بہتر جمہوری اور اشتراکی نظام وجود میں آ سکتا تھا۔ ایسا امکانات جرمنی میں ابھر بھی رہے تھے لیکن جیسا کہ تاریخ دان کرس ہارمن نے تجزیہ کیا ہے، وہاں کی ورکرز پارٹیوں کی قیادت نے گڑبڑ پیدا کر دی۔ انقلاب آیا لیکن روس جیسے ملک میں جس کے بارے میں لینن نے خود 1905 میں لکھا تھا کہ روس میں سرمایہ دارانہ ترقی بہت کم ہے اور پرولتاریہ طبقہ اتنی بڑی تعداد میں نہیں ہے کہ انقلاب کی قیادت کر سکے۔ ایسے میں زار شاہی اور فروری انقلاب کی کمزوریوں کی وجہ سے انقلاب برپا ہوا لیکن سرمایہ دارانہ کاموں سے نبٹنے میں برسوں لگ گئے اور وہ آخری دم تک مکمل نہ ہو سکے۔ اس لیے وہاں ایک نامکمل اشتراکی نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ 1921 میں، لینن کو ایک نئی اقتصادی پالیسی نافذ کرنی پڑی جس نے چھوٹے پیمانے پر ہی سہی، ایک طرح سے سرمایہ داری کو بحال کیا۔ اس کے بعد سرمایہ داری کے عناصر کو کبھی بھی مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکا۔ خود سوویت یونین میں ایسے لوگ تھے جو سرمایہ داری کے حامی تھے۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوویت یونین کی بنیاد میں ہی ٹوٹ پھوٹ کے بیج بوئے جا چکے تھے۔ تاہم 1980 کی دہائی سے اس کے ٹوٹنے کے آثار نظر آنے لگے۔ اس کے پیچھے سیاسی، معاشی اور سماجی وجوہات تھیں۔

16.3.1 اقتصادی اسباب (Economic Causes)

سوویت یونین کا معاشی بحران سب سے بڑی اور فیصلہ کن وجہ تھی جو بالآخر اس کے انتشار پر منتج ہوئی۔ اس بحران کی ایک طویل تاریخ تھی، جس میں متعدد عوامل شامل تھے جیسے کہ منصوبہ بند معیشت کی ناکامی، ٹیکنالوجی میں پسماندگی، بھاری فوجی اخراجات، اور تیل کی عالمی منڈیوں میں کمی۔ سوویت یونین نے اپنی معیشت کو مرکزی منصوبہ بند نظام (command economy) کے تحت چلایا، جہاں حکومت پیداوار، تقسیم اور وسائل کے استعمال کے تمام پہلوؤں کو کنٹرول کرتی تھی۔ اس کا مقصد پیداوار کے ہر شعبے کو کنٹرول کرنا اور دولت اور خدمات کو یکساں طور پر سب میں تقسیم کرنا تھا۔ سوویت معیشت میں، پیداواری منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے سخت اہداف مقرر کیے گئے تھے، لیکن ان منصوبوں کو پورا کرنے میں بڑی ناکامیاں تھیں۔ زیادہ تر صنعتوں اور زرعی شعبوں میں تکنیکی ترقی کا فقدان تھا، جس کی وجہ سے پیداواری صلاحیت میں کمی واقع ہوئی۔ پیداوار میں معیار کا بھی فقدان تھا، کیونکہ پیداوار کو معیار اور جدت پر نہیں بلکہ مقداری اہداف پر زیادہ توجہ دی گئی تھی۔ مرکزی طور پر کنٹرول ہونے کی وجہ سے صنعتوں اور زرعی شعبوں میں لچک اور جدت کی بہت کمی تھی۔ پیداواری ضروریات اور صارفین کی ترجیحات کو تبدیل کرنے کا کوئی فوری جواب نہیں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سوویت پیداوار اپنے صارفین کی بدلتی ہوئی ضروریات کو مزید پورا نہیں کر سکتی تھی۔

سوویت یونین کا زرعی شعبہ انتہائی پسماندہ تھا۔ اگرچہ سوویت یونین نے زرعی شعبے کو بہت اہمیت دی تھی لیکن پھر بھی زرعی مصنوعات کی پیداوار کم تھی۔ زرعی شعبے میں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔ سوویت یونین میں زرعی زمین کا زیادہ تر اجتماعی فارموں (collective farms) اور ریاستی فارموں (اسٹیٹ farms) کے ذریعے استحصال کیا جاتا تھا، جس نے نہ صرف ایک کمزور انتظامی ڈھانچے کا حصہ تھے، بلکہ مناسب وسائل اور ٹیکنالوجی سے بھی محروم تھے۔ جس کے نتیجے میں 1970 اور 1980 کی دہائیوں میں سوویت یونین کو غذائی مصنوعات کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑا۔ بنیادی غذائی اشیاء جیسے گندم، گوشت اور دودھ کی قلت نے حکومت کو درآمدات پر انحصار کرنے پر مجبور کیا، جس سے معاشی دباؤ میں مزید اضافہ ہوا۔ سوویت یونین کی معیشت کا انحصار بنیادی طور پر توانائی کی پیداوار، خاص طور پر تیل اور گیس پر تھا۔ 1970 اور 1980 کی دہائیوں میں، سوویت یونین دنیا کے سب سے بڑے تیل پیدا کرنے والے ممالک میں سے ایک تھا اور اس کی برآمدات سے غیر ملکی کرنسی کی درآمدات ہوتی تھیں۔ لیکن 1980 کی دہائی میں تیل کی گرتی ہوئی قیمتوں نے سوویت معیشت کو شدید پریشانی میں ڈال دیا۔ تیل کی کم ہوتی آمدنی کی وجہ سے سوویت یونین کو درآمدات کی ادائیگی میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے زرمبادلہ کی قلت پیدا ہو گئی۔ اس سے سوویت حکومت کے لیے پیداوار اور اقتصادی سرگرمیوں کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔

سوویت یونین کا ایک اہم حصہ فوجی اور دفاعی اخراجات تھا۔ سرد جنگ کے دوران، سوویت یونین نے اپنی فوجی طاقت بڑھانے پر بہت زیادہ خرچ کیا، خاص طور پر امریکہ کے ساتھ مقابلے میں۔ فوجی اخراجات سوویت یونین کے لیے ایک بھاری مالی بوجھ بن گئے۔ یہ صرف مسلح افواج کی دیکھ بھال تک محدود نہیں تھا بلکہ اسلحے اور فوجی ٹیکنالوجی کی ترقی پر بھی بھاری اخراجات کیے جا رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں شہری

معیشت کو نظر انداز کیا گیا اور وسائل کا ضیاع ہوا۔ سرد جنگ کی صورتحال میں، سوویت یونین نے بین الاقوامی سطح پر اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لیے بہت سی جنگوں اور تنازعات میں حصہ لیا، جیسا کہ افغانستان کی جنگ۔ جنگ نے سوویت یونین کے وسائل کو مزید کمزور کر دیا اور جو شدید مالی بحران کا باعث بنا۔

16.3.2 سیاسی اسباب (Political Causes)

سوویت یونین کے سیاسی بحران کا تعلق اس کے مرکزی اور آمرانہ نظام سے تھا جو بالآخر اس کے ٹوٹنے کی بڑی وجہ بنا۔ 1980 کی دہائی کے آخر میں، گورباچوف نے perestroika (معاشی اصلاحات) اور glasnost (شفافیت) کی پالیسیوں کو نافذ کیا، جس کا مقصد حکمرانی کو بہتر بنانا اور زیادہ کھلے پن کو فروغ دینا تھا۔ لیکن یہ پالیسیاں الٹا ثابت ہوئیں، کیونکہ ان اصلاحات نے موجودہ عدم اطمینان کو مزید تیز کر دیا۔ سوویت یونین میں مختلف نسلی اور قومی گروہوں کے درمیان گہری تقسیم تھی۔ گورباچوف کی پالیسیوں نے ان گروہوں کو اپنی آزادی کا مطالبہ کرنے کی ترغیب دی۔ بالٹک ریاستوں (ایسٹونیا، لٹویا، لتھوانیا)، یوکرین، جارجیا اور دیگر جمہوریہ نے اپنی آزادی کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ گورباچوف کا مرکزی طور پر منحصر نظامِ حکمرانی اصلاحات کے عمل میں پیچیدگیوں کا شکار ہوا، جس کے نتیجے میں زیادہ عدم اطمینان اور مخالفت ہوئی۔ اگست 1991 کی بغاوت (گورباچوف کو ہٹانے کی ناکام کوشش) نے بھی اس کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ اس بغاوت کی ناکامی نے گورباچوف کی سیاسی پوزیشن کو مزید کمزور کر دیا اور بورس یلسن جیسے لیڈروں کو آزادی کی طرف بڑھنے کا باعث بنا۔ نتیجے کے طور پر، سوویت یونین کی 15 جمہوریہوں نے آزادی کا اعلان کیا، اور 26 دسمبر 1991 کو سوویت یونین تحلیل ہو گیا۔ ان سیاسی وجوہات نے سوویت یونین کے اتحاد کو تباہ کیا اور اس کے ٹوٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔

16.3.3 گورباچوف کا کردار (Role of Mikhail Gorbachev)

میخائل گورباچوف (Mikhail Gorbachev) کے 1985 میں اقتدار میں آنے کے بعد، انہوں نے سوویت یونین کی معیشت اور معاشرے میں اصلاحات کی کوشش کی۔ Perestroika اور Glasnost وہ پالیسیاں تھیں جو میخائل گورباچوف نے 1985 میں نافذ کیں، جن کا مقصد سوویت یونین کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی ڈھانچے میں اصلاحات لانا تھا۔ اگرچہ ان پالیسیوں کا مقصد یونین کو زندہ کرنا تھا، لیکن ان کے نتیجے میں سوویت یونین کے انتشار میں مدد ملی۔

- **Perestroika (پیریسترویکا):** پیریسترویکا کا مقصد سوویت یونین کی سخت، مرکزی منصوبہ بند معیشت میں اصلاحات لانا تھا۔ گورباچوف نے حکومتی کنٹرول کو کسی حد تک کم کرنے، نجی انٹرپرائز کو فروغ دینے اور پیداواری نظام کو مزید لچکدار بنانے کی کوشش کی۔ گورباچوف نے مارکیٹ پر مبنی عناصر کو شامل کرنے کی تجویز پیش کی، جیسے کہ مقامی سطح پر پیداواری فیصلے کرنے کے لیے خود مختاری اور کچھ نجی ملکیت فراہم کرنے کی کوشش۔ تاہم، یہ اصلاحات کافی حد تک محدود تھیں، اور زیادہ تر سرکاری اہلکار انہیں اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے۔ مزید برآں، انتظامی ڈھانچہ بہت کمزور تھا، جس کی وجہ سے اصلاحات کے اثرات بہت محدود اور منفی ثابت ہوئے۔

Perestroika نے پہلے سے ہی غیر مطمئن شہریوں کی توقعات کو بڑھادیا، لیکن جب معاشی اصلاحات سے حقیقی فوائد حاصل نہیں ہوئے تو عام لوگوں میں مایوسی اور غصہ بڑھ گیا۔

- **گلاسنوسٹ (Glasnost):** گلاسنوسٹ کے متعدد عمومی اور مخصوص معنی ہیں۔ کم از کم اٹھارہویں صدی کے آخر سے ہی روسی زبان میں اس کا مطلب "کشادگی اور شفافیت" کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں روسی سلطنت میں، اصطلاح خاص طور پر عدالتی نظام میں اصلاحات سے وابستہ تھی، ان میں پریسوں اور عوام کی آزمائشوں میں شرکت کی اجازت دینے والی اصلاحات تھیں جن کے فیصلوں کو اب بلند آواز سے پڑھنا تھا۔ 1980 کی دہائی کے وسط میں، اسے میخائل گورباچوف نے سوویت یونین میں حکومتی شفافیت میں اضافہ کے لیے ایک سیاسی نعرہ کے طور پر مقبول کیا تھا۔ گلاسنوسٹ کا مقصد سوویت حکومت کے اندر شفافیت، کھلے پن اور مکالمے کو فروغ دینا تھا۔ اس کے تحت گورباچوف نے میڈیا، تنقید اور بحث کی آزادی کی اجازت دی۔ گورباچوف نے میڈیا کو حکومت پر تنقید کرنے اور بدعنوانی، نااہلی اور دیگر سماجی مسائل پر کھل کر بات کرنے کی اجازت دی۔ اس سے لوگوں میں سیاسی معاملات میں شرکت کا جذبہ بیدار ہوا اور پہلے سے موجود بے اطمینانی کو باہر آنے کا موقع ملا۔ Glasnost نے لوگوں کو حکومت کی ناکامیوں اور بدعنوانی کو بے نقاب کرنے کی قیادت کی۔ اس کھلے پن نے ایسے مسائل کو جنم دیا جو پہلے دبائے گئے تھے، جیسے کہ غربت، ضرورت سے زیادہ فوجی اخراجات، اور آمرانہ حکومتوں پر تنقید۔

ان دونوں پالیسیوں کے نتائج الٹا ثابت ہوئے۔ Perestroika نے معیشت کو مستحکم کرنے کے بجائے مزید غیر مستحکم کر دیا۔ مارکیٹ پر مبنی اصلاحات نے حکومت کے کنٹرول سے دور کچھ لچکدار اقدامات متعارف کروائے، لیکن وہ ناکافی تھے اور وسیع تر تبدیلی کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف، گلاسنوسٹ نے لوگوں کو حکومتی پالیسیوں اور ناکامیوں پر کھل کر بات کرنے کی اجازت دی، جس سے سوویت یونین کے اندر سیاسی مخالفت میں اضافہ ہوا۔ Glasnost اور perestroika نے قومی شناخت اور آزادی کے مطالبات کو بھی ہوا دی۔ مختلف جمہوریہ، جیسے یوکرین، جارجیا اور بالٹک ریاستیں (ایسٹونیا، لٹویا، لتھوانیا) نے اپنی آزادی کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ سوویت یونین کے مختلف نسلی اور قومی گروہوں میں پہلے سے ہی عدم اطمینان تھا اور گورباچوف کی پالیسیوں نے ان عدم اطمینان کو مزید بڑھادیا۔ یہ بے اطمینانی جلد ہی آزادی کے مطالبات میں بدل گئی اور سوویت یونین کے اتحاد میں بڑی دراڑیں پڑ گئیں۔ اس طرح، جب گورباچوف کی پالیسیاں اصلاحات کی سمت میں تھیں، وہ بالآخر سوویت یونین کے خاتمے کا باعث بنیں کیونکہ انہوں نے مخالف قوتوں اور عدم اطمینان کی حوصلہ افزائی کی۔

16.3.4 سماجی اسباب (Social Causes)

سوویت یونین میں سماجی عدم اطمینان اور عدم مساوات اس کے انتشار کی ایک بڑی وجہ تھی۔ پہلے سے ہی نسلی اور ثقافتی طور پر متنوع فیڈریشن میں، گورباچوف کی گلاسنوسٹ کی پالیسی نے ان تضادات کو مزید بڑھادیا۔ سوویت یونین میں مختلف نسلی اور قومی گروہوں کے

درمیان عدم مساوات موجود تھی، بشمول اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی امتیاز۔ اگرچہ سوویت حکومت نے مساوات کا دعویٰ کیا، لیکن بہت سے گروہوں کو مناسب شناخت اور خود مختاری نہیں ملی۔ مزید برآں، معاشی بحران اور خوراک کے بحران نے بھی عوام میں عدم اطمینان بڑھایا۔ معیار زندگی میں گراوٹ اور اشیائے ضروریہ کی کمی نے عام لوگوں میں عدم اطمینان پیدا کیا، کیونکہ حکومتی اسکیموں نے ان کی روزمرہ کی زندگی کو بہتر کرنے کے بجائے مزید مشکلات کا سامنا کیا۔ سماجی عدم مساوات اور بدعنوانی نے عوامی اعتماد کو مزید کمزور کیا۔ گورباچوف کی اصلاحات نے ان عدم اطمینان کو اجاگر کیا، کیونکہ اب لوگ اپنے مسائل اور عدم مساوات پر کھل کر بات کرنے لگے تھے۔ مزید برآں، سوویت یونین کے اندر مختلف جمہوریہ میں قوم پرستی کا احساس بیدار ہوا اور انہوں نے اپنی آزادی کا مطالبہ کیا، جس سے یونین کے اتحاد اور استحکام کو شدید دھچکا لگا۔ ان سماجی عوامل نے سوویت یونین کے سیاسی اور معاشی عدم استحکام کو بڑھایا، اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو تیز کیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماجی بدامنی، نسلی اور ثقافتی امتیاز، اقتصادی بحران، اور خوراک کی کمی کی وجہ سے سوویت یونین کے ٹوٹنے میں تیزی آئی۔ گورباچوف کی پالیسیوں، جیسے پیریسٹروکا اور گلاسنوسٹ، نے ان عدم اطمینان کو بے نقاب کیا، جس کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی شہری بدامنی اور مختلف جمہوریہ میں آزادی کے مطالبات شروع ہوئے۔ انقلابی نظام کو ترک کرنے کا مطالبہ کھل کر سامنے آنے لگا۔ یلتسن نے کھل کر روس کو بچانے کے لیے سرمایہ دارانہ اصلاحات کی وکالت کی اور دنیا کی تاریخ میں پہلی بار کسی ملک کے رہنما گورباچوف نے اپنے دستخط سے اس ملک کے ٹوٹنے پر مہر ثبت کر دی۔ کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری نے، یعنی سوویت یونین کے سب سے طاقتور رہنما نے خود کمیونسٹ پارٹی کو تحلیل کرنے کا اعلان کیا۔ یلتسن نے اقتدار سنبھالا اور ایک نئے ملک کے طور پر روس نے سرمایہ دارانہ راستے پر قدم رکھا۔

16.4 سرد جنگ کا خاتمہ (End of the Cold war)

خیال کیا جاتا ہے کہ سرد جنگ کا خاتمہ سوویت یونین کے انتشار سے ہوا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جن وجوہات نے سوویت یونین کے خاتمے میں کردار ادا کیے وہ سرد جنگ کے خاتمے کی وجوہات بھی تھیں لیکن ان کے علاوہ عالمی سطح پر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جس نے اس جنگ کو ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ یہاں ہم انہیں وجوہات کے بارے میں بات کریں گے۔

16.4.1 روس کی اقتصادی حالات اور گورباچوف کی اصلاحات

1980 کی دہائی تک سوویت یونین کی معاشی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ ضرورت سے زیادہ فوجی اخراجات، اندرونی نااہلی (اشتراکی نظام) اور تیل کی گرتی ہوئی قیمتوں نے سوویت معیشت کو کمزور کر دیا۔ سوویت یونین اپنی فوجی توسیع، بیرونی تنازعات (جیسے افغان جنگ) اور اقتصادی اصلاحات کے درمیان توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہا۔ معاشی مسائل نے سوویت یونین کے لیے سرد جنگ کو جاری رکھنا مشکل بنا دیا اور اس کی خود مختاری کو کمزور کر دیا۔

گورباچوف کی پالیسیوں کا مذکور تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے جس میں اس نے دو پروگراموں کے تحت سوویت یونین میں اصلاحات

کی کوشش کی۔ داخلی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے گورباچوف نہ صرف لچک بلکہ معاشی وسائل بھی چاہتے تھے۔ انہوں نے اسلحے پر اخراجات کم کرنے کے لیے امریکہ سے بات چیت کی۔ نومبر 1985 میں جنیوا میں پہلی سوویت امریکی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی۔ فروری 1987 میں، سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی 27ویں کانگریس میں، اس نے "پرامن بقائے باہمی" کے تصور کی نئی تعریف کی۔ اس کانگریس نے اس تجویز کو قبول کیا کہ یہ اصطلاح 1920 کی دہائی سے طبقاتی جدوجہد کی ایک ایسی شکل کے لیے استعمال کی جارہی تھی جس میں سرمایہ دار ممالک کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کے تصور کو دوسرے طریقوں سے جدوجہد جاری رکھنے کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ گورباچوف نے آگے کہا کہ پرامن بقائے باہمی اپنے آپ میں ایک مقصد ہے۔ اس کی تعریف مغربی ممالک بالخصوص امریکہ کے ساتھ حقیقی تعاون کے طور پر کی گئی تھی۔ یہ صرف کسی اصول کی نئی تعریف نہیں تھی بلکہ یہ سوویت خارجہ پالیسی کی بنیاد میں ایک بنیادی تبدیلی کی نمائندگی کرتی تھی۔ دوماہ بعد، یوکرین کے چرنوبل میں ایک جوہری ری ایکٹر پھٹ گیا، جس سے تابکار مواد بحیرہ اسود اور بحیرہ روم میں پھیل گیا۔ گورباچوف اس تباہی سے اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے خود اس نقصان کی ذمہ داری قبول کرلی۔ اس کی وجہ سے ان کا شمار ان لوگوں میں ہونے لگا جو تخفیف اسلحہ کے حوالے سے کسی مثبت فیصلے تک پہنچنے میں سب سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

- **افغانستان سے جنگ کے خاتمے کا اعلان:** اسکے علاوہ گورباچوف نے افغانستان سے جنگ کو ختم کرنے کا بھی اعلان کیا۔ دراصل اس جنگ کی شروعات بھی سرد جنگ کے نتیجے میں واقع ہوئی تھی۔ سوویت یونین کی افغانستان جنگ (1979–1989) سرد جنگ کے دوران ایک اہم اور فیصلہ کن تنازعہ تھا، جس نے نہ صرف سوویت یونین کی فوجی اور اقتصادی پوزیشن کو کمزور کیا بلکہ عالمی سطح پر سوویت یونین کے وقار کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ یہ جنگ سرد جنگ کے خاتمے کی طرف ایک اہم عنصر تھی، کیونکہ اس نے سوویت یونین کو فوجی، اقتصادی اور سیاسی دباؤ میں رکھا، جس سے وہ سرد جنگ کو جاری رکھنے کے قابل نہیں رہا۔
- افغانستان میں 1978 میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی۔ افغانستان میں خلقی حکومت (People's Democratic Party of Afghanistan) کا اقتدار میں آنا سوویت یونین کے لیے ایک اسٹریٹجک فتح تھی، کیونکہ یہ حکومت اشتراکی نظریے پر یقین رکھتی تھی۔ سوویت یونین کے لیے یہ افغانستان میں ایک مضبوط کمیونسٹ اتحادی قائم کرنے کا موقع تھا، جو سرد جنگ کے تناظر میں ان کے مفاد میں تھا۔ تاہم، اس نئی حکومت کی مخالفت بڑھنے لگی، خاص طور پر افغان دیہی علاقوں میں۔ 1979 تک افغانستان میں حکومتی مخالفت اور بغاوتیں سنگین ہوگئیں۔ سوویت یونین نے افغان حکومت کو اپنے ساتھ رکھنے اور باغیوں کو دبانے کے لیے فوجی مداخلت کا منصوبہ بنایا۔ نتیجتاً 25 دسمبر 1979 کو سوویت یونین نے افغانستان میں فوجی آپریشن شروع کیا۔ سوویت یونین نے افغانستان میں تقریباً 100,000 فوجیوں کو تعینات کیا۔ اس کا بنیادی مقصد افغان اشتراکی حکومت کو برقرار رکھنا اور اس پر بڑھتے ہوئے باغیوں کے اثر و رسوخ کو کم کرنا تھا۔ سوویت یونین نے افغان حکومت کو عدم استحکام سے بچانے کے لیے یہ قدم اٹھایا لیکن اس کے نتائج الٹا نکلے۔ فوجی مداخلت کے ساتھ ساتھ، سوویت یونین نے افغانستان میں بھاری فوجی کارروائی کی، لیکن موسم، جغرافیائی مشکلات اور افغان شہریوں کی شدید مزاحمت کی وجہ سے یہ زیادہ دیر تک کامیاب نہ ہوسکی۔ افغانستان کے پہاڑی علاقے اور انتہا پسند مجاہدین گروپوں نے جنگ کو سوویت افواج کے لیے انتہائی مشکل بنادیا۔ ان مجاہدین گروپوں کو امریکہ، پاکستان اور دیگر مغربی ممالک کی حمایت حاصل تھی، جو انہیں اسلحہ، تربیت اور مالی مدد فراہم

کرتے تھے۔ افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی مداخلت نے سرد جنگ کی صورتحال کو مزید کشیدہ بنا دیا۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے اسے سوویت یونین کی سامراجی توسیع کے طور پر دیکھا اور افغان مجاہدین گروپوں کی حمایت شروع کر دی۔ پاکستان نے افغان مجاہدین کی تربیت اور انہیں ہتھیار فراہم کرنے کے لیے اپنی سرحد پر سی آئی اے(Central Intelligence Agency) کی مدد سے کیمپ قائم کیے تھے۔ امریکہ نے جدید ہتھیار اور فوجی مواد فراہم کیا۔ نتیجے کے طور پر، جنگ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان پراکسی جنگ میں بدل گئی، دونوں ممالک نے اپنی اپنی افواج کی حمایت کی۔

سوویت افواج کو افغانستان میں گھیراؤ اور مزاحمت کا سامنا تھا۔ افغانوں کی جدوجہد نہ صرف فوجی نقطہ نظر سے تھی بلکہ نظریاتی نقطہ نظر سے بھی تھی کیونکہ وہ بیرونی مداخلت کو مسترد کر رہے تھے۔ سوویت فوجیں افغان پہاڑوں اور دشوار گزار علاقوں میں گھری ہوئی تھیں اور جنگ کافی دیر تک جاری رہی۔ افغانستان میں فوجی مہم کی وجہ سے سوویت یونین کو بھاری معاشی بوجھ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جنگ کے اخراجات کی وجہ سے سوویت یونین کی معاشی حالت خراب ہوتی گئی اور اس کا اثر سوویت یونین کے اندرونی مسائل پر پڑا۔ اس جنگ میں سوویت یونین کو بھاری جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ تقریباً 15,000 سوویت فوجی مارے گئے اور لاکھوں افغان شہری اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس جنگ کی وجہ سے سوویت یونین میں عدم اطمینان بڑھ رہا تھا، کیونکہ جنگ اور تشدد عوام کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث بن رہے تھے۔

سوویت یونین کو افغانستان کی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر، 1986 میں میخائل گورباچوف کے اقتدار میں آنے کے بعد، سوویت یونین نے افغانستان سے افواج کے انخلاء کا عمل شروع کیا۔ گورباچوف کا خیال تھا کہ اس جنگ کا کوئی تزویراتی مقصد نہیں تھا اور اس کا سوویت یونین کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ 1989 میں سوویت یونین نے افغانستان سے اپنی افواج کا انخلا شروع کیا اور مارچ 1989 تک افغانستان سے مکمل انخلا کر لیا۔ یہ جنگ سوویت یونین کے لیے ذلت آمیز شکست ثابت ہوئی، اور اس کے نتیجے میں سوویت یونین کے اقتصادی اور فوجی نقطہ نظر پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

افغانستان جنگ نے سوویت یونین کو عسکری، اقتصادی اور سیاسی طور پر کمزور کیا اور سرد جنگ کے خاتمے کا ایک اہم عنصر تھا۔ اس جنگ نے نہ صرف سوویت یونین کی فوجی پوزیشن کو چیلنج کیا بلکہ یہ بھی ظاہر کیا کہ سوویت یونین اب عالمی سطح پر اپنی سامراجی توسیع کو جاری رکھنے کے قابل نہیں رہا۔

16.4.2 مشرقی یورپ میں جمہوری تحریکیں اور تبدیلی کے مطالبات

1989 میں مشرقی یورپ میں اشتراکی حکومتوں کے خلاف شروع ہونے والی عوامی جمہوری تحریکوں نے سرد جنگ کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ واقعات سوویت یونین کے دائرہ اثر میں واقع ممالک میں اشتراکی حکمرانی کو چیلنج کرنے والی وسیع تر سماجی، سیاسی اور سفارتی تبدیلی کا حصہ تھے۔ ان تحریکوں نے سوویت یونین اور اس کے اتحادیوں پر دباؤ ڈالا اور بالآخر سرد جنگ کے خاتمے میں اہم تعاون ادا کیا۔ سبھی

مشرقی یورپی مملک میں آزادی کی مہم دوڑ پڑی۔ اسکے پس منظر میں گورباچوف کی پالیسیاں بھی اہم زمیندار تھی۔ ان تحریکوں میں پولینڈ، ہنگری، چیکوسلوواکیہ اور برلن میں ہونے والی تحریکیں کافی اہم ہیں۔

یکجہتی تحریک(Solidarity Movement)نے1980کی دہائی کے اوائل میں پولینڈ میں اشتراکی حکمرانی کو چیلنج کیا۔ یہ ایک مزدور تحریک تھی جو پولینڈ کے گدے کی پیداوار کے شعبے سے شروع ہوئی، لیکن بہت تیزی سے قومی سطح پر پھیل گئی۔ اس کی قیادت لیچ والیسانے کی، اور اس نے کمیونسٹ حکمرانی کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاج کو جنم دیا۔ پولش حکومت اور سوویت یونین کے دباؤ کے باوجود یکجہتی کی تحریک نے 1989 میں پہلی بار آزادانہ انتخابات میں حصہ لیا جس کے نتیجے میں پولینڈ میں جمہوری تبدیلی کا آغاز ہوا۔ پولینڈ میں اس جمہوری تبدیلی نے باقی مشرقی یورپی ممالک کو متاثر کیا اور ثابت کیا کہ کمیونسٹ حکمرانی کو چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ ہنگری بھی سوویت سلطنت کے زیر اثر تھا لیکن 1980کی دہائی کے آخر تک اصلاحات کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ ہنگری کے رہنما جوزف(Jozsef Antall)نے آہستہ آہستہ کمیونسٹ حکومت میں لچک لانا شروع کی اور 1988 میں ہنگری نے انتخابی اصلاحات کیں۔ 1989 میں، ہنگری نے اپنی سرحدیں کھول دیں، جس سے ہزاروں مشرقی جرمن شہریوں کو مغربی جرمنی فرار ہونے کا موقع ملا۔ اس نے پورے مشرقی یورپ میں اشتراکی حکومتوں کے خلاف تحریکوں کو متاثر کیا۔ ہنگری کا یہ اقدام کمیونسٹ ممالک کے اندر آمریت سے جمہوریت کی طرف تبدیلی کی علامت بن گیا۔

چیکوسلواکیہ: مخمل انقلاب(The Velvet Revolution)

1989 میں چیکوسلواکیہ میں ویلویٹ انقلاب برپا ہوا جو ایک پرامن تحریک تھی۔ اس تحریک کی قیادت معروف مصنف اور انسانی حقوق کے کارکن Václav Havel کررہے تھے۔ مخمل انقلاب نے عوام کو اشتراکی حکمرانی کے خلاف متحرک کیا اور بالآخر اقتدار کی تبدیلی کا باعث بنا۔ یہ تحریک پرامن طریقے سے اور مسلح جدوجہد کے بغیر اشتراکی حکومت کو تبدیل کرنے کی ایک مثال بن گئی۔ ہیول صدر منتخب ہوئے اور چیکوسلواکیہ ایک جمہوری ڈھانچے میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے ظاہر کیا کہ طاقتور سیاسی تبدیلی تشدد کے بغیر عوامی بیداری اور حمایت سے ممکن ہے۔

مشرقی جرمنی: دیوار برلن کا گرنا مشرقی جرمنی میں 1989 کے واقعات سرد جنگ کے خاتمے کی طرف ایک اہم لمحہ تھے۔ دیوار برلن، جس نے مغربی اور مشرقی جرمنی کو تقسیم کیا، 1989 میں گر گئی۔ اس واقعہ کا پورے یورپ میں بڑا اثر ہوا۔ دیوار کا گرنا صرف مشرقی اور مغربی جرمنی کے درمیان دیوار کا گرنا ہی نہیں تھا بلکہ یہ سرد جنگ کے خاتمے کی طرف ایک بڑا قدم تھا۔ دیوار برلن کا گرنا اس بات کی علامت ہے کہ کمیونسٹ حکمرانی کا مزید دفاع نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ یورپ میں اتحاد کی طرف ایک بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔ اس نے جرمن دوبارہ اتحاد کے عمل کو بھی تیز کیا، جو 1990 میں مکمل ہوا۔

مشرقی یورپ میں، پولینڈ، ہنگری، چیکوسلواکیہ، اور جرمنی کے ساتھ ساتھ بلغاریہ اور البانیہ جیسے دیگر ممالک میں بھی اشتراکی حکمرانی کے خلاف جمہوری تحریکیں اور احتجاج شروع ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان ممالک میں تبدیلی کچھ سست تھی لیکن ان واقعات نے سرد جنگ کے

خاتمے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ مشرقی یورپ میں جمہوری تحریکوں اور تبدیلیوں نے سرد جنگ کے خاتمے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ پولینڈ، ہنگری، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی اور دیگر ممالک میں تحریکوں نے سوویت یونین کی کمیونسٹ حکومت کو چیلنج کیا اور ایک نئے سیاسی دور کا آغاز کیا۔ ان تحریکوں نے نہ صرف سرد جنگ کے خاتمے کی راہ ہموار کی بلکہ عالمی سیاست کو ایک نئی سمت کی طرف گامزن کیا، جہاں جمہوریت اور آزادی کی قوتیں ابھریں۔

16.4.3 امریکی پالیسی اور رونالڈ ریگن کی قیادت

1980 کی دہائی میں امریکی صدر رونالڈ ریگن نے سوویت یونین کے خلاف سخت گیر اور فعال پالیسی اپنائی جسے "ریگن نظریے" (Reagan Doctrine) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی قیادت میں امریکہ نے سوویت یونین کو فوجی، اقتصادی اور سفارتی سطح پر چیلنج کیا، جس کے سرد جنگ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ رونالڈ ریگن نے سوویت یونین کو ہر محاذ پر چیلنج کرنے کے لیے امریکہ کی فوجی طاقت کو مضبوط کیا۔ اس نے ہتھیاروں کی ایک بڑی دوڑ شروع کی، جس میں جوہری میزائلوں کی تخلیق بھی شامل تھی۔ امریکہ نے اپنے دفاعی بجٹ میں بہت اضافہ کیا اور سوویت یونین کے خلاف اعلیٰ ترین سطح کی فوجی تیاری کی، جس سے سوویت یونین پر معاشی دباؤ بڑھ گیا۔ سوویت یونین کو معاشی نقطہ نظر سے کمزور کرنے کے لیے امریکہ نے مختلف اقدامات کیے۔ ان میں سوویت یونین کے خلاف تجارتی پابندیاں، تیل کی گرتی ہوئی قیمتیں، اور مغربی ممالک کی طرف سے اقتصادی تعاون کی کمی جیسی پالیسیاں شامل تھیں۔ ان اقدامات نے سوویت یونین کی معیشت کو مزید کمزور کر دیا۔ ریگن نے سوویت یونین کے خلاف ایک مضبوط سفارتی اتحاد بنانے کے لیے مغربی ممالک کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس نے نیٹو (NATO) کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کیا اور دنیا بھر میں اشتراکی اثر ورسوخ کو روکنے کے لیے کئی ممالک میں حمایت اکٹھی کی۔ 1983 میں، ریگن نے "اسٹار وارز" (Strategic Defense Initiative) کے نام سے ایک پرجوش منصوبہ شروع کیا، جس کا مقصد خلائی دفاعی نظام کے ذریعے سوویت میزائلوں کو تباہ کرنا تھا۔ اس پروگرام کو دیکھ کر سوویت یونین نے محسوس کیا کہ امریکہ سوویت یونین کو عسکری اور تکنیکی طور پر شکست دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے وہ مزید دباؤ کا شکار ہوا۔ ان سخت پالیسیوں نے سوویت یونین کو عسکری، اقتصادی اور سفارتی طور پر کمزور کر دیا اور بالآخر گورباچوف کو اصلاحی پالیسیاں اپنانے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح امریکہ کی قائدانہ صلاحیت اور اس کی پالیسی نے سرد جنگ کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔

16.5 سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کے انتشار کے اثرات

(Effects of the end of the Cold War and the disintegration of the Soviet Union)

سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کی تحلیل کا عالمی سیاست، معیشت اور معاشرے پر گہرا اثر پڑا۔ سب سے اہم اثر سوویت یونین کا انتشار تھا، جس نے 15 نئے آزاد ممالک کو ابھارنے کا موقع فراہم کیا۔ اس سے روس ایک بڑی طاقت کے طور پر ابھرا، جب کہ مشرقی یورپ میں جمہوری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بہت سے ممالک نے اپنے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا اور مشرقی بلاک کے ممالک نے مغربی یورپی ممالک کے ساتھ اقتصادی اور سیاسی تعاون میں اضافہ کیا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ کو عالمی سپر پاور کے

طور پر تسلیم کیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب سرمایہ داری اور جمہوریت کے نظریے کو عالمی سطح پر پہچان ملی۔ اس کے علاوہ، نیٹو اور یورپی یونین جیسی تنظیموں نے توسیع کی، جس سے مغربی ممالک کے اثر و رسوخ میں مزید اضافہ ہوا۔ اگرچہ سرد جنگ کے خاتمے نے نئے مواقع پیدا کیے لیکن یہ اپنے ساتھ بہت سے عالمی چیلنجز بھی لے کر آیا۔ دہشت گردی، علاقائی تنازعات اور ماحولیاتی بحران جیسے مسائل اب عالمی برادری کے سامنے تھے۔ اس طرح، سرد جنگ اور سوویت یونین کی تحلیل نے دنیا کو ایک نئے سیاسی، معاشی اور سماجی تناظر میں لایا۔

16.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد، طلباء کو درج ذیل نکات کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو گئے ہونگے: آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کس طرح معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل سوویت یونین کے انتشار کا باعث بنے اور میخائل گورباچوف کی اصلاحی پالیسیاں، جیسے گلاسنوسٹ اور پیریسٹروکا، یونین کے تحلیل کا باعث کیسے بنیں اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ ان مختلف عوامل کو بھی سمجھنے میں مدد ملی ہوگی جنہوں نے سرد جنگ کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا، جیسے کہ امریکہ کی سخت خارجہ پالیسی، مشرقی یورپ میں انقلابات اور سوویت یونین کا اندرونی عدم استحکام۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ امریکہ کی حکمت عملیوں اور عالمی تبدیلیوں نے سرد جنگ کے خاتمے میں کس طرح کردار ادا کیا۔ اس سے آپ کو یہ سمجھنے میں بھی آسانی ہوئی ہوگی کہ سرد جنگ کے خاتمے نے عالمی سیاست کو کس طرح تبدیل کیا اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد کس طرح نئے عالمی بحرانوں جیسے دہشت گردی، علاقائی تنازعات، اور ماحولیاتی مسائل نے بین الاقوامی تعلقات کو متاثر کیا۔ توقع ہے کہ اس باب کے ذریعے آپ سرد جنگ کے خاتمے کے تاریخی، سیاسی اور عالمی مضمرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

16.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

Glasnost(کھلاپن) : ایک پالیسی تھی جس کا مقصد سوویت یونین میں سیاسی شفافیت اور عوامی شرکت کو بڑھانا تھا۔

Perestroika(تعمیر نو) : گورباچوف کی ایک اقتصادی اور انتظامی اصلاحاتی منصوبہ تھا جس کا مقصد سوویت یونین کی معیشت اور حکومتی ڈھانچے کو بہتر بنانا تھا۔

یوایس ایس آر : "یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلک" تھا۔ اسے سوویت یونین بھی کہا جاتا تھا جو 1922 سے 1991 تک موجود

16.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سوویت یونین کب ٹوٹا؟
2. سوویت یونین کا آخری صدر کون تھا؟

3. پیریسترویکا (Perestroika) کی پالیسی کون لایا؟
4. سرد جنگ کن دو گروہوں کے درمیان تھی؟
5. پہلا سوویت امریکی سربراہی اجلاس کہاں منعقد ہوا؟
6. مزدوروں کی تنظیم یکجہتی کس ملک میں قائم ہوئی؟
7. کوریا کی جنگ کتنی دیر تک جاری رہی؟
8. USSR کا پورا نام بتائیں؟
9. گورباچوف کو نوبل انعام کب دیا گیا؟
10. سرد جنگ کے بعد کون سا ملک سپریم پاور بن کر ابھرا؟

16.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سوویت کے انتشار میں گلاسنوسٹ (Glasnost) نے کیا کردار ادا کیا۔ ایک نوٹ تحریر کیجئے۔
2. سوویت یونین کے ٹوٹنے میں سماجی اسباب کس حد تک زمیندار ہیں۔ روشنی ڈالیں۔
3. سرد جنگ کے خاتمے میں مشرقی یورپ کے ممالک میں ہوئے بغاوتوں کا مختصر میں جائزہ لیں۔
4. سرد جنگ کے خاتمے میں مغربی ممالک کا سوویت پر دباؤ ایک اہم وجہ بنی۔ اپنے رائے کا اظہار کریں۔
5. سرد جنگ کے خاتمے میں افغانستان کی صورتحال نے ایک اہم رول ادا کیا۔ روشنی ڈالیں۔

16.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سرد جنگ کے اختتام کے کیا اسباب تھے۔ وضاحت کریں۔
2. سوویت یونین کے انتشار میں گورباچوف کا کیا کردار تھا۔ ایک تفصیلی نوٹ لکھیں۔
3. سوویت یونین کے بکھرنے میں معاشی اور سیاسی وجوہات پر روشنی ڈالیں۔

16.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Deshpande, Anirudh, *Vishwa Itihas ke Pramukh Mudde: Badalte Aayaam*, Hindi Madhyam Karyanvaya Nideshalay, Delhi University, 2011.
2. Gupta, Parthasarthi, *Europe ka Itihas*, Hindi Madhyam Karyanvaya Nideshalay, Delhi University, 1983.
3. Harman, Chris, *A People's History of the World*, Orient Longman, New Delhi, 2005 (first pub. in 1999).
4. Karuna Kaushik, *History of Communist Russia, 1917–1991*, Macmillan, New Delhi, 2006.
5. Lowe, Norman, *Mastering Modern World*, Macmillan, London, 1988.

6. Mathur, L.P., *Twentieth Century World*, Pointer Publishers Jaipur, India, 2004.
7. Palmer, R.R., Joel Colton, and Lloyd Kramer, *A History of the Modern World*, Mc Graw Hill, New York, 2002.
8. Rao, B.V., *World History,* Sterling Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1994 (first pub. in 1985).
9. Roberts, J.M. and O.A. Westad, *The Penguin History of the World* (*Sixth Edition*), Penguin, London, 2013.
10. Verma, Lal Bahadur, *Adhunik Vishwa Ka Itihas,* Hindi Madhyam Karyanvaya Nideshalay, Delhi University, 2013.

نمونہ پرچہ امتحان

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم
Master of Arts ماسٹر آف آرٹس
Subject Code: MAHS411CCT
Paper: Modern World - II
پرچہ: جدید دنیا - II
4th Semester Examination ، چوتھا سمسٹر امتحان
Time : 3 hours وقت : ۳ گھنٹے — Marks : 70 نشانات : ۷۰

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. کتاب *Transition from Feudalism to Capitalism* کس نے لکھی؟

ii. کس ملک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "ان کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا؟

iii. آزاد خیالی کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کرنے والے دو مفکرین کا نام بتایئے۔

iv. انگلینڈ کے دارالامراء میں کس طبقے کی اجارہ داری تھی؟

v. 1904 میں کس ایشیائی ملک نے روس کو شکست دی؟

vi. 1919 میں طے پانے والے پیرس امن معاہدوں کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

vii. ورسائی کے معاہدے کے تحت، کس ملک کو بھاری جنگی معاوضہ ادا کرنا تھا؟

viii. نیم غلامی (serfdom) سے کیا مراد ہے؟

ix. روس میں NEP(New Economic Policy) کی شروعات کس نے کی؟

x. باضابطہ طور پر مجلسِ اقوام کے اختتام کا اعلان کب کیا گیا؟

حصہ دوم

2. ہندوستان میں نوآبادیت کے اجارہ داری تجارتی مرحلے کی اہم خصوصیات بیان کریں۔
3. کارل مارکس کے اشتراکیت کی وضاحت کیجیے۔
4. سامراجی کشمکش پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. بلقان ریاستوں کے مسئلے کو مختصراً اجاگر کریں۔
6. روسی انقلاب میں پہلی عالمی جنگ کا کیا رول تھا؟ روشنی ڈالیں۔
7. مجلسِ اقوام کی غیر سیاسی کامیابیوں پر ایک مختصر نوٹ قلمبند کیجئے۔
8. بینکنگ نظام کی ناکامی نے عظیم کساد بازاری کو کس طرح پروان چڑھایا؟ نوٹ لکھیئے۔
9. مسولینی کی خارجہ پالیسی پر نوٹ لکھئے۔

حصہ سوم

10. مختلف تاریخی مراحل کی وضاحت کریں جن کے ذریعے سامراج نے عالمی سطح پر مختلف شکلیں اختیار کیں۔
11. اشتراکیت کے آغاز اور ابتدائی اشتراکی تحریکوں پر مضمون لکھیے۔
12. ہندوستان پر پہلی عالمی جنگ کے کیا اہم اثرات مرتب ہوئے؟ تفصیلی وضاحت کیجیے۔
13. نازیت کے عروج کے اسباب پر ایک تفصیلی روشنی ڈالئے۔
14. آپ اس بات سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں کہ مجلسِ اقوام ایک مکمل ناکامی اور عالمی تاریخ میں مکمل طور پر غیر متعلق تھی۔

اہم نکات